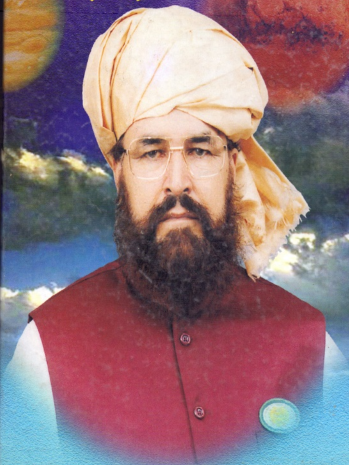
رہ نوردِ شوق

بشریٰ اعجاز



رہ نوردِ شوق

بُشریٰ اعجاز

1000 صفحات پر مشتمل کتاب ہونے کی وجہ سے اس کی پی-ڈی-
ایف کو 2 حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے۔ دوسرا
حصہ اگلے صفحہ پر دی گئی ویب سائیٹ یا اینڈرائیڈ اپلیکیشن یا وٹس
ایپ پر آپ ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔

شام کے بعد پبلی کیشنز ۱۳۔اے بہاول پور روڈ۔لاہور

7237592 - 7310172 Fax: 7310115

www.QuranTafseer.net

الحمدللہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو وڈیو بیانات کو آپکی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراسن سکیں۔ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ ایپلیکیشن بھی موجود ہے

آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جاکر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ ایپلیکیشن سرچ کر کے انسٹال کرسکتے ہیں۔



اس ویب سائیٹ اور ایپلیکیشن سے آپ یہ سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔

1-مفسّر، مترجّم ومفکرِ قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30 پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30 پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔ 2-مشکوۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔ 3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہی آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہی پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیوز دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔4-اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبدالباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیوز سن سکتے ہیں۔5-حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6-ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔ 7- پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8-اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیوز وڈیوز۔

9-سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریبا تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیوز فورا ایپلیکیشن اور ویب سائیٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔ آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائیٹ سے حاصل کرسکتے ہیں۔

آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میسج کر کے حاصل کرسکتے ہیں۔ 03235205255

اہتمام اشاعت
امیر
سمیر



جولائی ۲۰۰۰ء
پروڈکشن : حمیرا اکرم
آرٹ : تبسم نسیم
قیمت : ۴۵۰ روپے
انتخاب جدید پریس 8-ایبٹ روڈ لاہور فون نمبر: 6314365

انتساب

ربِ کائنات کے نام

جو محبوب ازلی ہے

حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ

کے نام

جو تمام محبتوں کی ابتدا اور انتہا ہے

اور

اعلیٰ حضرت مولانا اللہ یار خان رحمتہ اللہ علیہ

کے نام

جنہوں نے حضرت محمد اکرم اعوان

کی بصیرتوں اور بصارتوں کو نکھارا

اور انہیں دردِ دل کی عظیم نعمت عطا کی!!

ترتیب ابواب

1۔ بابِ ابجد

2۔ بابِ تلاش

3- بابِ شخصیت

4- بابِ عمل

5- بابِ قلم

6- بابِ دل — شاعری

7- بابِ صحافت

2- منتخب اخباری کالم

8- بابِ تمثال

9- بابِ مراسلت

10- بابِ عکسِ تحریر

11- من آمد



حمد

تیرا نام لیتے ہیں غنچے چٹک کر

کلی تیری عظمت کے گن گا رہی ہے

زباں پہ پپیہے کی اس کا معطر

اسی نام پر شاخ لہرا رہی ہے

رکوع کر رہی ہوا ٹہنیوں سے شجر کی

تیرے نام کے زمزمے گا رہی ہے

یہی نام تھا چاند کی چاندنی میں

سحر کو دیکھئے کتنا نکھار رہی ہے

نعت

حسنِ ظاہر سے شہرِ روشن جہاں زار ہو

پر جمالِ باطنی کی ضو فشانی اور ہے

دیکھتی ہے جو نظر گنبد کو کبھی در کو کبھی

دل نے جو دیکھا ہے تو وہ کہانی اور ہے

بہتے ہیں دریا بہت شوریدہ سر جو جیسے بھی ہیں

بحرِ رحمت کی مگر یکسر روانی اور ہے

شہری حالات سے ہے لطفِ زندگی بے شک فقط

کیف آ گیا لذتِ دردِ نہانی اور ہے

حرف آغاز

الف' ب' کا قاعدہ

میں جب سلسلہ عالیہ سے منسلک ہوئی تو' تصوف' ذکر اذکار' لطائف' مراقبات' شیخ اور آداب شیخ کیا ہیں۔
نہیں جانتی تھی' مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ آفس کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھے ہوئے حضرت جی ذکر اور تبلیغ دین کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہیں ؟اور اگر کچھ کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں ؟ میں تو مزے سے آتی تھی' ذکر کیا' مسائل پر بات کی اور چلی گئی۔ اس کے علاوہ گردو پیش میں کیا ہے ؟اس کی مجھے قطعاً خبر نہیں تھی' اور نہ ہی میں نے خبر لینے کی کبھی کوشش کی۔ اور شاید بڑا عرصہ اسی بے خبری میں گزر جاتا' اگر سالانہ اجتماع پر جانے کا اتفاق نہ ہوتا اور وہاں جاکر' حضرت جی سے انٹرویو' نہ لیتی تو' اس انٹرویو کا حال میں نے کتاب میں شامل اپنے مضمون میں لکھ دیا ہے' لہذا اب یہاں

اسے دہرانا نہیں چاہتی۔

تصوف' کے بارے میں ادب' فکشن' اور تذکروں کے وسیلے سے جو کچھ مجھ تک پہنچا تھا۔ اس کے ذریعے اک پر اسرار اور تجسّس سے بھر پور دنیا کا تصور ذہن کے پردے پر کھلتا تھا۔ ایسی دنیا جس میں کشف و کرامات کی رنگینیاں جابجا بکھری نظر آتی ہیں۔ مثلاً صوفیا کا پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا۔ چلتی ہواؤں کا رخ موڑ دینا۔ کھڑے کھڑے لوگوں کی تقدیر بدل دینا۔ نفس کو مارنے کی خاطر مہینوں کی فاقہ کشی میں تازہ دم رہنا۔ اور کھڑے کھڑے ماضی' حال اور مستقبل میں جھانک لینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس دنیا میں' ضبط نفس' عبادات' شریعت' طریقت' عشقِ رسولؐ اور آدابِ شیخ کے موضوعات کم کم نظر آتے تھے۔ اور اگر آتے بھی تھے تو اتنے پرکشش طریقے سے انہیں بتایا جاتا تھا کہ وہ بھی تصوف کی بوالعجبی کا حصہ لگتے تھے اور انسان ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر آگے گزر جاتا تھا۔

ان کتابوں کے ذریعے جو تصوف مجھ تک پہنچا' اس میں سبز عماموں' حجروں' خرقہ پوشوں' مجذوبوں اور مستوں کی نور میں گندھی' عجائبات کے چھینٹے اڑاتی شخصیات کا ایسا طلسم تھا' جو سانس روک لیتا تھا اور کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں دیتا تھا بس دل چاہتا تھا' کہیں سے کوئی ایسا فضا میں اڑنے' پانی پر دوڑنے' پل میں حاضر اور غائب ہو جانے والا سبز عمامے میں ملبوس' نورانی چہرے والا' کرامات کے سانچے میں ڈھلا' اللہ والا مل جائے' جو حق ہو کا نعرہ لگائے' اور مجھے بھی ہستی سے السّتی کر دے۔ اک نظر میں کشف و کرامات سے مالا مال کر دے۔ پھر میں بھی' دنیا کو پاؤں کی اک ٹھوکر سے اڑاؤں اور کسی قدیم تنہائی سے آراستہ حجرے میں گوشہ نشین ہو جاؤں۔ کھانے پینے کی فکر سے آزاد ہو جاؤں' سونے جاگنے کی مصیبت سے چھوٹ جاؤں' فاصلے' فاصلے نہ رہیں دنیا سمٹ کر میری چھنگلی کی اوٹ میں آجائے' سارے

حجاب ختم ہو جائیں' اور حقیقت حال پیاز کے چھلکوں کی طرح' میری اک نگاہ سے اترنا شروع ہو جائے اور میں ظاہر و باطن کی حدوں کو پھلانگ کر ایک ہی جست میں ازل و ابد کے بھید پالوں۔

بہت عرصہ ایسی صاحب کمال ہستی کی اندر ہی اندر تلاش رہی۔ جو کہ ظاہر ہے نہ ملنا تھی نہ ملی' پھر اس کے نتیجے میں' مایوسی اور بے چینی کی ملی جلی کیفیت سے دوچار رہنے لگی' خدا سے تو کچھ نہ کچھ واقفیت تھی ہی، مگر اس تمام عرصہ میں سب سے بڑا نقصان جو ہوا' وہ یہ تھا کہ آقائے دو جہاں ﷺ' سے کوئی قلبی تعلق نہ پیدا ہو سکا۔ بلکہ اگر دیانتداری سے کہوں تو یہ ٹھیک ہو گا کہ تھوڑی بہت نسبت جو باطنی حوالے سے ایک مسلمان کے دل میں ہوتی ہے، جو ہم میں اپنے جنیز کے ذریعے سے پہنچتی ہے' اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ میرا الیقین تو ڈائریکٹ اللہ' اور اس کے بعد گوناگوں صفات' اور رنگارنگی رکھنے والے اہل کمال پر تھا۔ جو حیرتوں اور 'معجزوں' میں لپٹی ماورائی دنیا کا دروازہ ہم پر کھولتے تھے۔ جہاں داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی' جہاں سیر بالکل مفت تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا' مگر اس کے باوجود چونکہ درمیان میں' سب سے اہم اور ضروری کڑی' سب سے پہلا اور آخری حوالہ ہی گم تھا' تو ذہن میں انتشار پیدا ہونا لازمی تھا۔ اسی لئے باتیں سوال بنتی تھیں اور سوال مصیبت بن جاتے تھے۔ جواب کے لئے عجائبات کے پھول بوٹوں اور حاشیوں سے سجی کتابوں سے رجوع کرتی تو وہاں سے کنفیوژن کے علاوہ کچھ نہ ملتا۔ رب کی طرف پلٹتی تو درمیان سے حبیب خدا سے تعلق کی لازمی کڑی کی ناموجودگی کی وجہ سے منہ کی کھاتی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جھنجھلاہٹ میں یہ تو سوچتی۔ مگر اس صورتحال کے اصل اسباب کیا ہیں' ان پر کبھی غور نہ کیا۔

خدا کے رسولؐ کے ذکر کو میلاد وں' بزم نعت اور روز مرہ بول چال میں عادتاً دہرانا ہی کافی سے زیادہ لگتا تھا۔ اس سے آگے بھی کچھ ہے یہ جاننے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ دل بنجر ہوتا چلا گیا' اطمینان ویقین کا سبزہ وگل خشک ہوتا گیا اور اندر اک بے مراد تلاش کا ڈھیر لگتا گیا۔ سوال بڑھنے لگے اور سارے جواب ندارد۔

ایسی ہی ناآسودہ باطنی کیفیات میں حضرت جی سے ملی۔ اور ذکر اللہ شروع کیا۔ ذکر اللہ کے بارے میں' کہتی چلوں کہ شیطان سے بچنے کا آسان طریقہ ہے ذکر میں انہماک ہو تو شیطان درمیان سے نکل جاتا ہے اور نفس کو کنٹرول کرنے کا بہترین طریقہ ذکر میں گم ہو جانا ہے۔

اور ذکر کیا ہے؟ اس کی یاد' یاد بھی کس کی' اس پیارے کی' جو پیاروں کا پیارا ہے دلداروں کا دلدار ہے تو پھر جب اس کی یاد میں گم ہوئے تو نفس سے بچ گئے کیونکہ نفس سے آپ یکتائی میں بچتے ہیں یکسوئی میں بچتے ہیں۔ پھر یہ ہوا...... پھر یہ ہوا کہ ان سوالوں کے جواب مل گئے۔ جو میرے سینے کے خالی ڈھنڈار میں ٹین کی طرح بجتے رہتے تھے اور ان جوابوں میں روحانی' باطنی' اور دلی زندگی کی وہ حقیقی کڑی بھی مل گئی' جو گم تھی اور جس کا نہ ہونا ہی اصل مسئلہ تھا۔

عشق رسولؐ' اتباع سنت رسولؐ اور فنافی الرسولؐ۔ مسئلوں کے حل کی کلید ہاتھ لگ گئی۔ گرہیں کھلنے لگیں۔ اور گرہیں کھلیں تو پتہ چلا۔ حقیقت حال تو کچھ اور تھی۔ میں تو اک خوفناک غلط فہمی کے گرداب میں منہ کے بل گری ہوئی تھی۔ ایسی غلط فہمی جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کتاب کو لکھنے کے دوران' حضرت جی سے انٹرویوز' گاہے گاہے ہونے والی گفتگو' صاحب مجاز حضرات سے ملاقاتوں اور تصوف کی عملی کتابوں سے جو رہنمائی ملی ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ تصوف'

مافوق الفطرت واقعات اور ترک دنیا کا نام نہیں۔ تصوف خانقاہی نظام کا نام نہیں۔ بلکہ تصوف خدمت اور عمل کا نام ہے پتہ چلا یہاں ہر شخص کو بولنے کے لئے مامور نہیں کیا گیا۔ بے شمار لوگوں کو نظارہ خاموشی سے دکھایا گیا۔ چپ کرو، نہیں بولنا آرام سے دیکھتے جاؤ۔

یہ سب نوادرات ہیں۔ اور ان نوادرات میں سے ہوتے ہوئے گزر جاؤ کچھ لوگوں کو بولنے کے لئے کہا کہ بولتے جاؤ اور خدمت عمل کے لئے کہا کہ کرتے جاؤ! اور یہ کہ تصوف سنبھالنے کا نہیں برتنے کا نام ہے، حجرے میں اکیلے بیٹھ کر متاع گراں کی طرح چھپا چھپا کر رکھنے کا نام نہیں۔ بانٹنے کا نام ہے۔ تصوف حسن عمل کا نام ہے مجھے تو یہی سمجھ آئی ہے۔

اور یہی اس کتاب کی غرض وغائیت ہے۔ اک باعمل صوفی جو خدمت کی عظمت سے شرابور ہو کر اک عامی کی طرح دنیائے عمل سجائے بیٹھا ہے اس کی رودادِ عشق ہے۔

عشق حبیبؐ جس کا خاصہ
عشق حقیقی جس کی پہچان ہے

اس باعمل صوفی کے حسن عمل کو غیر جانبداری اور پوری دیانتداری سے دکھانے اور بتانے کی کوشش کا نام یہ کتاب ہے۔ یہ دراصل اس شخصیت پر ابتدائی کام ہے۔ اس لئے ہم اس کتاب کو بھی ابتدائی کتاب کہیں گے اسے آپ ا،ب کا قاعدہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ تصوف کے اس زندہ، متحرک اور فعال انسٹی ٹیوشن پر کام کا آغاز ہے۔ ایک ادنیٰ کوشش ہے عہد حاضر کے باعمل صوفی کی گوناگوں صفات کو معلوم کرنے کی۔ اس لئے حرف آغاز کو مکرر کہنا ہمارا مقصد نہیں۔ اسے آگے اور آگے لے کر جانا ہماری ضرورت ہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں' جو روحانی اور باطنی تجربات ہوئے' ان کا ذکر یہاں ضروری نہیں' مگر ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ جب یہ کام مجھے سونپا گیا' تو اس وقت یہ ناممکنات کی انتہائی شکل میں' میرے سامنے تھا۔ اس لئے کہ مجھے اپنی تن آسانی کا بھی علم تھا اور کام کی نزاکت اور باریک بینی بھی میرے پیش نظر تھی۔

جیسا کہ شروع میں، میں نے کہا ہے میں کچھ نہیں جانتی تھی' سلسلہ عالیہ' حضرت جی' تصوف اور تعلیمات شریعہ کی اصل روح کے بارے میں۔ مجھے اپنے آپ کو دیئے ہوئے وقت کے اندر' معلومات بھی اکٹھی کرنا تھیں' اور انہیں پوری صحت اور ذمہ داری کے ساتھ ترتیب بھی دینا تھا۔ کہ شیخ المکرم اور سلسلہ عالیہ پر یہ پہلی باقاعدہ کتاب تھی۔ اس سلسلے میں مجھے رہنمائی کی ضرورت تھی جو بفضل تعالیٰ' حبیبِ خدا آقائے دوجہان کی برکتوں کے طفیل اور جناب شیخ کی توجہ کے ذریعہ مجھے ملی اور مجھ سے یہ کام ہو گیا۔

جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے۔ کام کیا نہیں جاتا۔ لیا جاتا ہے' اور میرا ایمان ہے کہ واقعی لیا جاتا ہے۔ ہم تو محض مزدور ہوتے ہیں اور یہ مزدوری کتنا بڑا اعزاز ہے۔ یہ وہی جانتے ہیں جنہیں اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے۔

آخر میں سلسلہ عالیہ کے ان تمام خواتین و حضرات کا بطور خاص شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جنہوں نے کام کے دوران عملی اور قلبی دونوں طرح سے میرا ساتھ دیا۔ خدا انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ اس کتاب میں پڑھنے والوں کو جو بھی کمیاں اور خامیاں نظر آئیں' انہیں میرے خلوص کے پس منظر میں دیکھئے اور یہ بات ذہن میں رکھئے گا کہ اس میں میری کسی شعوری یا لاشعوری کوتاہی کا خدانخواستہ دخل نہیں۔ ہاں اس کا باعث میری کم علمی ہو سکتی ہے۔

میں آپ کے مشوروں اور آراء کی منتظر رہوں گی۔ ہو سکتا ہے' اس کتاب کا

دوسرا ایڈیشن یا ایک اور کتاب اس سے بہتر اور اچھی بن جائے۔
پڑھنے والوں سے درخواست ہے اپنی دعاؤں میں' مجھ ناچیز کو یاد رکھیں کہ خدا حسن خاتمہ کرے اور اپنے محبوب کی شفاعت میرا مقدر کرے! آمین

بشریٰ اعجاز

کچھ اپنے بارے میں

ابا جی کو ونہار کا علاقہ بہت پسند ہے۔ اس کا معتدل موسم کوہستانی سلسلوں کے اندر چھپی ہوئی سرسبز وادیاں جو انسان پر ہائیکنگ کے دوران قدرت کے چھپے ہوئے رازوں کی طرح آشکار ہوتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی سادگی اور اخلاق۔ اس علاقے کا قدم قدم پر بکھرا ہوا نیچرل حسن اور اس کی بے شمار قرنوں صدیوں اور عہدوں پر پھیلی ہوئی تاریخ۔ یہی وجہ تھی کہ گرمیوں میں اکثر ہمیں لے کر وہ اس علاقے میں جایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے یاد ہے جب پہلی دفعہ ہم کلر کہار گئے تو وہاں لوکاٹوں کے سرسبز باغ کے اندر قدرتی بیلوں پھولوں اور سبز شگوفوں سے ڈھکی ہوئی دیواروں والے ملک مہر خان کے پیلے رنگ کے بنگلے میں سامان اتار کر جب بنگلے کے اونچے ٹیرس سے سامنے دیکھا، تو ایک ایسا منظر آنکھوں پر کھلا جو آج تک پلکوں کے اندر محفوظ ہے۔

اب بھی یاد کروں تو جیسے آنکھ کے پردے پر ایک تصویر دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگتی ہے۔ تاحد نگاہ پھیلی ہوئی جھیل' جھیل میں دور دو نقطوں کی طرح نظر آتی

کشتیاں' آس پاس خاموش پر سکون پہاڑ' پہاڑوں کے درمیاں سیاہ لکیر کی طرح نظر آتی سڑک' سڑک پر بے فکری سے رواں دواں ٹریفک 'بنگلے کے عین نیچے سڑک پر چھوٹا سا بازار' بازار سے آگے جا بجا بہتے ہوئے چشمے 'گہری سبز خوشبو میں دھلی پگڈنڈی' پگڈنڈی کے قریب خاموشی کی اونگھ کو اپنے اندر سمیٹتا' شمس رانی کا مزار' مزار پر جلے آدھ جلے اوندھے اور سیدھے پڑے مٹی کے دیئے مزار کے پایوں کے ساتھ رنگ برنگے دھاگوں میں بندھی محبت کی بے شمار ادھوری کہانیاں اور آس پاس پھیلے سبزے کی اوٹ سے ڈھول بادشاہ' ڈھول بادشاہ کو کنا سناتا' اوپر آہو باہو سرکار کا مزار اور آس پاس اس خوبصورت زندہ منظر میں زندگی کی خوبصورت علامت کے طور پر جا بجا نظر آتے آہو باہو سرکار کے مور اور ان موروں کے پنکھ تلاشتے لوگ۔

ملک مہر خان کے بنگلے کی پشت پر لوکاٹوں کے باغ کے بیچوں بیچ ٹھنڈے میٹھے پانی والی پکی نالی جس کے کناروں پر بیٹھ کر سنیلوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے معصوم بچے۔ یہاں سانپ بہت ہوتے ہیں کسی نے کہا، ہوئے پڑیں ہمیں کیا۔ سنیلوں کو تنکوں سے چھیڑتے ہوئے انہوں نے بے فکری سے کندھے اچکائے اور پکی نالی کے اندر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانے لگے ،دن تو کھیلنے دیکھنے اور معلوم کرنے کی ایکسائٹمنٹ میں گزر گیا۔ شام پڑی تو نجانے کن پھولوں کیاریوں باغوں پتوں اور شاخوں سے مچھروں کی فوجیں بر آمد ہوئیں اور ٹیرس پر ٹھنڈی ہوا اور دلکش منظروں کو انجوائے کرتے مسافروں پر حملہ آور ہو گئیں۔ رات کانوں میں سائرن بجاتے اور جسم پر سوئیاں چبھوتے مچھروں کے ساتھ فائیٹ (Fight) میں گزری' اور اگلی صبح ابا جی نے چکوال سے بہت سی مچھر دانیاں منگوالیں۔ یہ جگہ ہے تو بہت خوبصورت مگر مچھروں کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے۔ آج مچھر دانیاں آگئی ہیں مجھے امید ہے اب مچھروں سے بچاؤ ہو جائے گا۔ ابا جی نے

ہمارے چہروں پر جابجالال رنگ کے سوئیاں چبھنے جیسے چھوٹے چھوٹے نشانات دیکھ کر کہا مگر ہمیں اس وقت گزری رات کے بارے میں کچھ بھی یاد نہ تھا کہ ہمارے اس دن کے پروگرام میں سامنے ریڈار والی پہاڑی پر چڑھنا' نیچے ناشپاتیوں کے باغ سے ناشپاتیاں چرانا موروں کے پنکھ تلاشنا اور شمس رانی کے مزار پر دیا جلانے جیسے اہم کام شامل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ دور سے قریب اور معمولی اونچائی پر نظر آنے والی پہاڑیوں کے نزدیک پہنچے تو گردنیں اٹھا کر دیکھنے ہی میں ہم میں سے اکثریت کی ہمت جواب دے گئی۔ ارے یہ تو بہت اونچی ہے اور ریڈار جو دور سے ہاتھ بھر کے فاصلے پر نظر آتا تھا بہت اونچا ہے تو یہ سب کی خاموش رائے تھی۔ تو پھر کیا کیا جائے' پھر کبھی سہی' آج کا کام کبھی نہ آنے والی کل پر ٹال کر ہم واپس ہوئے۔

ناشپاتیوں کے باغ سے ناشپاتیاں چرانے والا عظیم کام بھی ہم سے نہ ہو سکا کہ باغ کا رکھوالا اتفاق سے اسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے ہم اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔ اس نے شاید ہمارے مذموم ارادے بھانپ لئے تھے۔ اسی لئے اس نے ہمیں وہاں سے ڈانٹ کر بھگا دیا اور خود ہاتھ میں پکڑے ہوئے موٹے لکڑی کے ڈنڈے کو خواہ مخواہ ہوا میں گھمانے لگا۔ ہاں البتہ اس روز کی ناکامی کی ساری کسر ہم نے شمس رانی کے مزار پر آکر نکالی، پہلے تو قریبی چشمے سے ڈول بھر بھر کر پانی لائے اور مزار کو رگڑ رگڑ کر دھویا۔ پھر دیوں کو صابن بوٹی سے کوچ مانجھ کر صاف کیا اور انہیں تیل سے بھر کر جلایا۔ اور شام ڈھلے واپس بنگلے میں آگئے۔ رات مچھر دانیوں کے اندر مچھر کسی خفیہ راستے سے گھس آئے اور انھوں نے کاٹ کاٹ کر ہماری درگت بنادی۔ صبح ہمارے ...... چہروں کے نشانات میں نمایاں اضافہ دیکھ کر اباجی نے کلر کہار ٹھہرنے کا ارادہ ترک کیا۔

اور وہاں سے کچھ دور میانی اڈا کے قریب ایک پہاڑی گاؤں سردھی جانے کی

تجویز پیش کی۔ گاؤں سے ہٹ کر وہاں ایک انگریز میم کا بڑا خوبصورت بنگلہ ہے جس کے پیچھے پانی کا بہت بڑا تالاب ہے چاروں طرف پہاڑ ہیں اور بنگلہ پہاڑوں کے درے کے بالکل سامنے ہے۔ نیچے وادیاں اور چشمے ہیں۔ اس جگہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہمہ وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور مچھر مکھی نام کی کسی چیز کا وہاں وجود نہیں۔ یوں تو ہمیں کلر کہار بہت بھایا تھا خاص طور سے اس کی حد نظر تک پھیلی ہوئی جھیل 'ریڈار والی اونچی پہاڑی 'لوکاٹوں کے باغ 'شمس رانی کا مزار مور سنیلیں اور ناشپاتیوں کے ہرے بھرے درختوں پر سبز پتوں کی اوٹ سے جھانکتی رس بھری مزے دار ناشپاتیاں 'مگر مچھروں نے خاصا بور کر دیا تھا اور پھر اباجی نے اس نئی جگہ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا تھا کہ ہم سب کلر کہار کے بے شمار عجائبات چھوڑ کر سردھی جانے کے لئے جی جان سے تیار ہو گئے۔

سردھی میں گو کلر کہار جیسی رونق اور ایک دم سے متوجہ کر کے ساکت کر دینے والا حسن نہیں تھا۔ مگر پہاڑ کے دامن کے نشیب و فراز میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے اس گاؤں کے آس پاس خشک پہاڑی ٹیلوں کچی بے آباد سڑک 'گدلے پانی والے تالاب 'اور سادہ رکھ رکھاؤ والے لوگوں کے برتاؤ میں کچھ ایسا کھینچ لینے والا خلوص تھا جو حسن منور کی طرح آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے دیکھنے والی آنکھوں اور محسوس کرنے والے دلوں پر کھلتا تھا تو پھر کھلتا ہی چلا جاتا تھا۔ یوں کہ پھر اس کو چھوڑنا اور بھاگنا ممکن نہیں رہتا تھا۔

وہ بنگلہ جس کا عقبی حصہ منہدم ہو چکا تھا کسی انگریز خاتون نے بنوایا تھا۔ کس نے اور کب؟ یہ ٹھیک طرح معلوم نہ ہو سکا 'اس لئے کہ سینہ بہ سینہ چلنے والی روائتیں ایک دوسرے سے خاصی متضاد تھیں اس لئے یہاں ان کا ذکر ضروری نہیں ہے، اس بنگلے کا فرنٹ پورشن اچھی حالت میں تھا اور اس کے کمروں میں پٹ سن کے ریشے سے

نے Under Lay کے اوپر خوبصورت ڈیزائنوں میں بہت اچھے دھاگے سے
بنی موٹی موٹی دریاں بچھی تھیں۔ بھاری شاندار فرنیچر چھتوں کے ساتھ موٹے
لوہے کے کنڈوں سے سوت کے رسوں کے ساتھ بندھے ہاتھ سے کھینچنے والے
کپڑے کے پنکھے Johnsons and Brother's کی نازک نفیس 24
Karat گولڈ کے کام والی کراکری، مہاگنی کی بھاری ڈائننگ ٹیبل اور پرانے
حماموں کی طرز کے غسل خانے دیکھ کر ہمیں لگا کہ ہم وکٹورین عہد کی کسی انتہائی
پراسرار، پر تجسس اور عظیم کہانی کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے ہوں۔ جہاں بڑی
بڑی کھڑکیوں کی زنگ خوردہ جالیوں سے سامنے پہاڑی درے سے آنے والی تند ہوا
ٹکراتی تو عجیب قسم کی گونج پیدا ہوتی جو خاصی دیر کمرے کی دیواروں کے اندر ایک
تسلسل سے بجتی رہتی' سوت کے ریشوں سے بنے Under layاور موٹی
پرنٹیڈ دری کو بھی ہوا کا ارتعاش کچھ یوں جگا دیتا کہ وہ اس آواز میں شامل ہو جاتی' ہم
رات کھڑکیاں بند کرنے کھولنے اور دری کے کناروں پر بھاری چیزیں مثلاً کرسیاں
اور سٹول وغیرہ رکھنے میں گزار دیتے۔ امی جی بار بار ہمیں کھڑکیوں کے پٹ بند کر کے
آرام سے سو جانے کی تلقین کرتیں مگر ہم ان دنوں اک ایسی عجیب ایکسائٹمنٹ سے
گزر رہے تھے جہاں زیادہ سے زیادہ بے آرام ہو کر سکون ملتا ہے اور ویسے بھی ہوا کے
ساتھ آنکھ مچولی کا وہ تجربہ کچھ اتنا انوکھا اور مزیدار تھا کہ اسے چھوڑا ہی نہیں جا سکتا
تھا۔

وہاں اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں ایسی تھیں جو ہمیں بے پناہ fasinate کرتی
تھیں۔ ہمارے بنگلے سے کچھ آگے 'نو چھال گاؤں کی طرف ''لون بنگلہ'' جو سرد ستی
والے بنگلے کی کاپی تھا' جس کی طرف جانے سے ہمیں سب نے ڈرا دیا تھا کہ وہ
سانپوں کا مسکن ہے۔ یعنی وہاں کے بے آباد کمروں میں ہر طرف سانپ ہی سانپ

سر سراتے رہتے ہیں اور سانپ ایسی چیز ہے جس سے آج بھی کل بھی اور ماضی میں بھی ہماری جان جاتی تھی۔ لہذا اس بنگلے سے ایک مناسب فاصلے پر کھڑے ہو کر ہم اسے حسرت سے دیکھنے کے علاوہ کبھی بھی کچھ نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ ایک خاص چیز سردھی سے علی الصبح چکوال کے لئے چلنے والی کھٹارہ بس تھی جس کے ذریعے ہم اخبار' ناشتے کی چیزیں' کیمرے کی فلمیں' کولڈ ڈرنکس' پھل' دوسرا روزمرہ کا سامان اور کتابیں وغیرہ منگوایا کرتے تھے۔ وہ بس صبح سردھی سے چلتی اور شام ڈھلے جب واپس پہنچتی تو ہم کچی گرد آلود سڑک کے کنارے کھڑے بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے ہوتے' وہ بس اس دورافتادہ خاموش پہاڑی گاؤں کی ٹھہری ہوئی زندگی میں حرکت اور رابطے کا واحد ذریعہ تھی جس سے صبح شام کے کچھ پل وہاں کا ماحول خاصا بدل جاتا تھا۔

بنگلے کے آدھے سے زیادہ منہدم ہو جانے والے سرونٹ کوارٹرز کے باقی شدہ حصے میں خان محمد چوکیدار اپنے اہل وعیال کے ہمراہ رہتا تھا۔ جس کی جیب میں موٹی موٹی لوہے کی چابیوں کا گچھا کھنکھناتا رہتا تھا۔ جو بنگلے کے منہدم ہو جانے والے حصے سے لے کر بقیہ حصے' ڈائننگ ہال کی Antique کراکری والی شیشم کی الماری اور ان مختلف الماریوں کے تالوں کی تھیں جن کا وجود تک اس وقت نظر نہیں آتا تھا۔ مگر خان محمد تھا کہ چابیوں کا گچھا ہمہ وقت جیب میں ڈالے انہیں ٹٹولتا رہتا تھا کہ ان میں سے کوئی چابی کہیں ادھر ادھر تو نہیں ہو گئی۔

سفید سر' جھریوں بھری لٹکی ہوئی جلد ڈھلکے ہوئے پپوٹوں' پیوند زدہ کپڑوں اور ہنڈولے کی طرح گھومتے ہوئے سر والی بڈھی مائی مستوراں بھی سردھی کا بہت اہم حصہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی موٹی لاٹھی ہوتی تھی۔ جس کے سہارے وہ ہمہ وقت گاؤں میں گھومتی رہتی تھی۔ بنگلے میں ای۔جی کے پاس دن میں اس کے دو،

تین چکر ضرور لگتے تھے امی بتاتی تھیں۔ بہت دکھی خاتون ہے اسکے آگے پیچھے کوئی نہیں، مگر عجیب بات تھی کہ میں نے اسے جب بھی دیکھا روتے ہوئے دیکھا مگر کسی اپنے دکھ پر نہیں 'اہل بیت کو۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک ہی نوحہ تڑپتا رہتا تھا۔ '' بخی حسن، حسینؑ کے صبروں کا صدقہ '' یہ کہتے کہتے جیسے پورے کا پورا کربلا اس کے اوپر سے گزر جاتا عجیب ان دیکھے دکھ سے اسکا وجود تڑپنے لگتا اور اس کی میلی گدلی آنکھیں نمکین پانی سے کچھ یوں بھر جاتیں کہ بعد میں وہ پانی اس کے چہرے پر کھدی لکیروں سے کتنی کتنی دیر پوشیدہ پہاڑی چشموں کی طرح قطرہ قطرہ رستا رہتا اور وہ اپنے ہلتے ہوئے سر کو ٹھہرانے کی کوشش میں مزید ہلاتے ہوئے اپنی پھٹی چادر سے اس پانی کو خشک کرنے میں بے حال ہوتی رہتی۔

بنگلے کے نشیب میں دو تین فرلانگ پر کنویں تھے جہاں سے تازہ سبزی اور صاف پانی بنگلے میں آتا تھا۔ وہاں کا ماشکی برآمدے کے سامنے اونچے چبوتروں پر رکھے گھڑوں کی قطار میں صبح وشام کنوئیں کا ٹھنڈا میٹھا پانی باقاعدگی سے بھرتا تھا اس کے بعد وہ غسل خانے کے زنگ اور سیلن سے کالے سرخی مائل ٹیڑھے میڑھے ہو جانے والے لوہے کے ٹبوں میں پانی بھرتا اور اپنا گدھا ہنکاتا سامنے درے کے قریب اپنے مکان کی طرف چلا جاتا۔

سرِ شام ہم سب بہن بھائیوں کی چارپائیاں برآمدے کے سامنے اونچے چبوترے پر بچھ جاتیں۔ ملازمہ سانپ بھگانے والی گوگل بوٹی دہکا کر برآمدے میں رکھ دیتی' سامنے صحن میں پرانے پیپل کے درخت کے نیچے ابا جان کا پلنگ بچھ جاتا۔ امی جان کو سانپوں کا وہم تھا وہ ہمیں شام کے بعد چارپائیوں سے نیچے اترنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ مگر ہم تھے کہ بہانے بہانے سے اوپر نیچے آتے جاتے رہتے تھے۔ رات پڑتی تو ہوا مزید تیز ہو جاتی پیپل کے پتے زور زور سے تالیاں بجانے لگتے۔ سامنے گاؤں کے

آوارہ کتے مل کر ڈراؤنی آوازوں میں رونے لگتے اور میں ان دیکھے سانپ کے خوف سے بستر کی سفید چادر کو بار بار سمیٹتے ہوئے کھیس کو اپنے گرد لپیٹ کر تکیئے میں منہ چھپا لیتی ایسے میں لاجی کے گاہے بگاہے کھنکھارنے کی آوازیں ڈھارس بندھاتیں اور انہیں سنتے ہوئے میں سکڑی سمٹی سو جاتی۔ بنگلہ 'بنگلے کے سامنے پہاڑی درہ اس سے شر شر بہہ کر آنے والی کنواری ہوا' پیپل کے تالیاں بجاتے سبز چمکیلے پتے بنگلے کے عقب میں گدلے پانی والا تالاب (جہاں انسان اور حیوان ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے بلکہ نہاتے دھوتے بھی تھے)۔

تالاب کے قریب سے گزرتی کچی سڑک جس پر صبح شام کھڑ کی ہوئی چولوں والی دھواں چھوڑتی بس چلا کرتی تھی' سڑک پر آگے جا کر بوچھال اور میانی اڈا' میانی اڈے سے قریب ہی نور پور سیٹھی اور منارہ۔ ونہار کے مشہور گاؤں۔ کسے معلوم کون جانتا تھا۔ کہ تہذیبی اور جغرافیائی لحاظ سے اس قدیم ترین علاقے میں جہاں کی زمینیں بارانی ہیں۔ جہاں قلت آب نے زندگی مشکل ہی نہیں پر مشقت بھی بنا رکھی ہے جہاں بارشوں کے پانی کو نشیبی گڑھوں میں جمع کر کے اس سے ضروریات زندگی پوری کی جاتی ہیں۔ جہاں کوہستان نمک کے دور دراز پھیلے اس پہاڑی سلسلے میں بے شمار معدنیات کے خزانے موجود ہونے کے باوجود یہاں کے لوگ آج بھی اپنے ہی پسینے کو گلاب بنانے کی کوشش میں خاک ہوئے جاتے ہیں۔

کون جانتا تھا' کسے معلوم تھا کہ کبھی منارہ 'ڈھوک ٹبالہ اور سیٹھی کی زمینوں پر "اللہ ھو" کی نوبت کچھ یوں باجے گی کہ اک عالم گوش بر آواز ہو جائے گا۔ کون جانتا تھا کہ کبھی ان بے سروسامان خشک بھوری زمینوں پر دارالعرفان جیسا حق کا مرکز کھلے گا اور پھر چہار جانب حق کی دھوم مچ جائے گی۔

.... میں جو اپنے بچپن اور شعور کا کافی حصہ انہی زمینوں مکانوں اور

سکنوں میں گزارتی رہی' وہیں 'کلر کہار' میانی اڈا' سردھی 'بوچھال 'نور پور' سیتھی اور منارہ کے اردگرد منڈلاتی رہی انہی زمینوں میں حیرتوں کو کاتتی اور بوتی رہی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ان بچھڑی ہوئی ماں کی محبت جیسی زمینوں سے دوبارہ ملاقات بھی ہو گی اور اس رنگ میں ہو گی۔ علاقہ ونہار سے اپنے قلبی تعلق کے حوالے سے چند باتیں' صرف اسلئے کی ہیں کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو' اس کتاب کو لکھنے کے دوران میں جن کیفیات سے دوچار رہی۔ ان کی جڑیں میرے اندر کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جوں جوں ان کے قریب گئی ہوں' انہیں گہرا اور مزید گہرا پایا ہے۔ اس گہرائی کے انت سرے پر (اگر کوئی انت سرا ہے تو) میرے بچپن کی محبتیں' شرارتیں' رفاقتیں اور حیرتیں' آج بھی میری منتظر ہیں' مگر اس سلسلہ روزو شب سے نکلوں تو دیکھوں۔

منارہ' دارالعرفان اور سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ' رابطے کی وہ کڑیاں ہیں' جنہوں نے اس گمشدہ حصے سے دوبارہ جوڑ دیا ہے۔ یعنی زندگی کا وہ باب جو یادوں کے نہاں خانے میں گم تھا' جس پر وقت کی بے حساب گرد پڑ چکی تھی۔ اس باب کو اس روحانی تعلق نے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ کہ اب مجھے بچپن کی یادوں کا کوئی بھی حوالہ اجنبی نہیں لگتا۔ یعنی اب اگر خود کو دیکھنا چاہوں تو پہلے کی طرح صرف دھول مٹی اور گردو غبار ہی نظر نہیں آتا' اس میں سے ایک مٹے ہوئے رنگوں والا خاکہ بھی گاہے گاہے جھانکتا ہے۔

حضرت جی کے تعارفی مضمون کا پیٹرن' شاید پڑھنے والوں کو تھوڑا مختلف لگے' کیونکہ' اس میں کہیں بیانیہ لہجہ ہے' کہیں واقعاتی انداز ہے اور کہیں شخصیت کے اپنے الفاظ میں احوال حال بتایا گیا ہے' یہ ضروری تھا۔ اس لئے کہ اس مضمون کی تیاری میں' جو بھی معلومات میں نے اکٹھی کیں' وہ مختلف ذرائع سے مجھے ملیں۔ یعنی کچھ

باتیں حضرت جی سے گفتگو کے ذریعے معلوم ہوئیں۔ کچھ ان کے انٹرویوز (جو مختلف اخبارات ورسائل میں گاہے بگاہے چھپتے رہتے ہیں) سے حاصل ہوئی ہیں اور کچھ معلومات ان کے مختلف ساتھیوں کے ذریعے سے مجھ تک پہنچیں[1] اب ان کو اک تسلسل میں بیان کرنا تھا' جو خاصا مشکل تھا۔ اس لحاظ سے کہ کوئی اہم بات رہ نہ جائے' اور پاس ادب بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے تو کوشش کی ہے' اس لئے کہ کوشش ہی کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے۔ ملٹی ڈائمنشن والی اس شخصیت کو کسی ایک حوالے یا ایک انداز سے دیکھا جا ہی نہیں سکتا۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ عکس در عکس' سطح در سطح' زاویہ در زاویہ' اتنے رنگ ہیں کہ انہیں یکجا کرنا ممکن ہی نہیں۔

پھر مروجہ قواعد و ضوابط کا ذکر کیا۔ پھر بات جیسے بھی ہو' جہاں سے بھی ہو' گھوم پھر کر وہیں آجائے گی۔ ایسے میں انداز بیاں کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ہاں واقعات کی صحت اور درستی بہت ضروری ہے۔ جس کا ممکن حد تک خیال رکھا ہے۔ باقی اللہ کی اللہ جانے۔

"ذوالقرنین"

"ایک شخص جس نے دو صدیوں کو متاثر کیا"

علاقہ ونہار کوہستان نمک کے تقریباً درمیان جہلم سے شروع ہو کر کالاباغ تک جاتا ہے۔ ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پلاٹو ہے۔ جس میں تقریباً بیس گاؤں آباد ہیں۔اس کے مشرق میں دھن، شمال میں علاقہ پکھڑ، مغرب میں سون، جنوب میں تھل اور جنوب مشرق میں علاقہ کہون ہے۔

چکوال سے خوشاب جاتے ہوئے بل کھاتی لہراتی سڑک پر بلندیاں چڑھتے آئیں تو مشہور جھیل اور باغات سے مزین کلر کہار ہے۔ اوپر آئیں تو چھت پر علاقہ ونہار شروع ہو جاتا ہے جس کا آخری گاؤں منارہ ہے۔ منارہ سے اترائی شروع ہو کر پہاڑوں سے نیچے تھل میں موضع کٹھہ جا کر ختم ہوتی ہے۔

اس سارے علاقہ میں اعوان آباد ہیں۔ جو شمال کے حملہ آوروں کے ساتھ یہاں آئے۔ اعوان حضرت علیؓ کی اولاد ہیں ۔ افغانستان اور وسطی ایشیا میں ان کے اجداد بس گئے تھے۔ پھر محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے اور ان علاقوں میں مضبوط قلعے اور چوکیاں بنائیں جن کے آثار ابھی تک ملتے ہیں۔ اس علاقے کے اعوانوں کے اجداد یہاں شاہی امراء تھے۔ جو بعد میں اپنے علاقے اور پھر گاؤں کے حاکم رہے۔ انگریز کے آنے پر یہ حیثیت بدلی' اس سے پہلے سکھوں کے ساتھ لڑائی میں بہت سے شہید ہو گئے۔ بلکہ سکھوں کے قبضے کے دوران بھی ان کی چھاپہ مار لڑائیاں جاری رہیں جن کے قصے آج بھی مشہور ہیں۔

انگریزی عہد میں یہاں کے عام لوگوں نے فوج کی نوکری کا رخ کیا اور آج تک

ان کی اکثریت فوج کی ملازمت میں ہے۔ اب کچھ لوگ کاروبار اور تعلیم کے شعبوں میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ کچھ کارجحان سول اداروں کی طرف بھی ہو گیا ہے۔ مگر بنیادی طور پر چونکہ یہ علاقہ بارانی ہے اور ہمیشہ قلت آب کا شکار رہتا ہے۔ اس لئے یہاں کھیتی باڑی پر گزر اوقات مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اسی لئے کاشتکاری کو یہاں پیشے کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کا اب بھی رجحان فوج میں جانے کا ہی ہے۔ اب چند صاحب ثروت لوگوں نے ٹیوب ویل لگوا لئے ہیں۔ مگر ایک تو وہ طریقہ آب رسانی بہت مہنگا ہے اور دوسرا ہر کسی کے حصول میں نہیں۔ تو اب بھی مسائل وہی ہیں جو ہمیشہ تھے یعنی عام آدمی غریب ہے تعلیم سے لے کر حق وانصاف تک اس کی رسائی آج بھی مشکل ہے۔

انگریز کے زمانے میں دو چار قوموں کو مارشل اقوام کہا جاتا تھا۔ ان میں اعوان قوم بھی شامل تھی۔ اسلئے کہ شاید ان کے پاس فوجی ملازمت کے علاوہ اور کوئی پیشہ ہی نہ تھا۔ ان علاقوں میں زمینداریاں کوئی خاص بڑی نہیں تھیں۔ کاروبار پر ہندوؤں کا قبضہ ہوا کرتا تھا یہاں سب سے بڑا کام یہی تھا کہ لوگ فوج میں ملازم ہو جائیں۔

ملک محمد اکرم اعوان کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی فوجی ہے۔ ان کے خاندان کے تقریباً سارے ہی لوگ فوج میں تھے۔ سیتھی گاؤں سے ذرا ہٹ کر پہاڑی کے اوپر ڈھوک ٹلیالہ نامی ایک چھوٹا سا ڈیرا ہے' جہاں ۱۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ملک فیروز خان اعوان کے گھر وہ بچہ پیدا ہوا۔ جس نے آگے چل کر نہ صرف خاندان اور علاقے کا نام روشن کرنا تھا بلکہ اس نے روحانی قلبی اور اخلاقی لحاظ سے بھی اپنے عہد کو ایک خاص حوالہ نام اور شناخت دینا تھی۔

اس بچے کے دادا حکیم عباس خان ادبی ذوق کے حامل تھے۔ دینی علوم سے بھی خاصا لگاؤ تھا انہیں' آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے علم طب حاصل کیا اور

علاقہ میں طبیب کی حیثیت سے حکیم عباس خان کے نام سے معروف ہوئے۔اور نانا کیپٹن مرزا خان بھی آرمی سے ریٹائرڈ تھے انہیں متعدد زبانوں پر دسترس حاصل تھی اردو پنجابی پشتو عربی فارسی اور انگریزی زبانوں کے مانے ہوئے ماہر سمجھے جاتے تھے۔انہوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا۔جنگ میں زخمی ہوئے اور چ گئے۔پنشن کے بعد انہوں نے اپنے گاؤں سیتھی میں مستقل سکونت اختیار کی۔اپنی بردباری تجربے اور فہم وفراست کی وجہ سے خاندان بھر میں ان کا نمایاں مقام تھا۔

ملک فیروز خان اعوان کے تین اور بھائی تھے۔صرف ایک نے فوج میں ملازمت نہیں کی وہ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے 'باقی دونوں بھائی فوج میں ملازم تھے جن میں سے ایک برما کے محاذ پر ۱۹۴۲ء میں مارے گئے۔

پہلے دو سال اس بچے نے شیر مادر پیا۔جو والدہ نے ہمیشہ باوضو ہو کر پلایا۔ملک فیروز خان اعوان چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اسلئے ان کے گھر میں پیدا ہونے والا پہلوٹھی کا بچہ گھر بھر کے لئے باعث توجہ تھا۔

دادا نے پہلے پہلے پوتے کے لئے بڑے شوق سے ساتھ کے گاؤں جھامرہ سے شیر دار بھینس پورے بیاسی روپے میں خریدی 'اس زمانے میں چونکہ چیزوں کے نرخ بہت ارزاں تھے اور روپیہ کمیاب تھا 'اس لئے یہ رقم خاصی بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔اس دور میں چونکہ دیہات میں چینی کی جگہ گڑ استعمال ہوتا تھا اور سب سے اعلیٰ گڑ یعنی چاقو گڑ ایک روپے کا سترہ سیر آتا تھا۔گندم ایک روپے کی تیس سیر تھی اور دیسی گھی دو آنے کا سیر ہوا کرتا تھا۔ضرورت پڑنے پر دودھ مانگنے سے مل جایا کرتا تھا اسلئے ان دنوں دودھ بیچنے کا دیہات میں کوئی Concept ہی نہیں تھا ویسے بھی وہ زمانہ مہمان نوازی کے لحاظ سے یادگار زمانہ تھا جب مہمان کو دعائیں مانگ کر بلایا جاتا تھا اور بصد اصرار ٹھہرایا جاتا تھا۔

ڈھوک ٹمیالہ سے سیتھی کا فاصلہ تقریباً دو میل تھا۔ اور سارا راستہ ناہموار اور دشوار گزار پہاڑی سے ہو کر گزرتا تھا۔ ان کا بچپن گاؤں اور ڈیرے پر آنے جانے میں بسر ہوا۔ پہاڑی راستوں پر چلنا گرنا اٹھنا کبھی گھوڑی پر بابا منگا (پرانا ملازم) کے ساتھ اور کبھی والد والدہ کے ساتھ۔

اس دور کی یادوں میں ایک یاد بڑی نمایاں ہے۔ ایک دفعہ والد' والدہ کے ہمراہ ڈیرے سے گاؤں واپس جاتے ہوئے راستے میں بارش آگئی۔ وہاں ان کی اپنی زمینیں تھیں' جہاں بارش کے پانی کو روکنے کے لئے بند باندھے گئے تھے۔ اس روز اتنی بارش ہوئی کہ چشم زدن میں سارے کھیت تالاب بن گئے۔ ایک کھیت کی منڈیر پر ایک چھتری دار درخت کے نیچے بیٹھ کر انہوں نے ساری بارش گزاری۔ جب خوب پانی جمع ہو گیا اور بارش رک گئی تو وہ تھوڑی دور پانی میں گیا اور واپس آیا تو بڑا خوش تھا کہ بہت بہادری دکھائی۔ والد نے کہا نہیں تھوڑا اور آگے جاؤ تب بات بنے گی۔ وہ تھوڑا اور آگے چلا گیا تو انہوں نے کہا وہ سامنے ایک تنکا سیدھا کھڑا ہے اسے ہاتھ لگا کر آؤ تو مانیں' وہ جوش میں اس تنکے کی طرف بڑھنے لگا' آگے گہرائی زیادہ تھی۔ اس لئے اس کو غوطے آنے لگے اور پھر اس سے آگے کچھ یاد نہیں رہا ہوش آیا تو درخت کے نیچے لیٹا تھا اور والد والدہ ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ اور بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ جگہ اس بچے کو اب بھی یاد ہے اسی لئے اس راستے سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ اس مقام پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ جہاں اب نہ تو چھتری دار درخت ہے نہ پانی۔ مگر دل کے مقام پر کہیں ایک ہلکی سے چبھن کا احساس ضرور باقی ہے جو ہمیشہ بچپن کے حوالے سے کہیں نہ کہیں رہ جاتی ہے۔

(حضرت جی فرماتے ہیں)

"مجھے وہ دن یاد ہیں'

جب ہماری سکول میں داخلے کی باری تھی نور پور نزدیکی گاؤں تھا۔ جہاں مڈل سکول تھا اور سیتھی میں برانچ تھی۔ یعنی پہلی اور دوسری جماعت وہاں پڑھائی جاتی تھی۔ سکول کی باقاعدہ کوئی عمارت نہ تھی۔

لوگوں کے خالی گھر ہی مدرسہ ہوا کرتے تھے۔ جو مل گیا۔ وہاں بچے جمع کر لئے۔ ہمارے محلے میں ماسٹر صاحب تھے۔ جن کا بوٹا سا قد اور سفید پگڑی پر طرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک اکلوتی کرسی مدرسے کا اثاثہ تھا۔ جو غالباً دو گھروں میں منتقل ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے تقسیم ملک تک یہی حال رہا اس کے بعد متروکہ دھرم شالہ پرائمری سکول بنا جو ابھی تک چل رہا ہے۔

تیسری جماعت میں نور پور آنا پڑا پانچ سال کی عمر میں سکول داخل ہوا۔ تیسری میں آٹھ سال کا تھا اور جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا لوگ اکثر فوج میں ملازمت کرتے تھے۔ نانا جان فوج میں تھے۔ دادا جان پہلی جنگ عظیم کے سابق فوجی تھے۔ والد چچا ماموں سب فوجی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں چچا کی تار آئی۔ فوجی جو جنگ میں مارا جاتا' اس کے گھر سرکار کی طرف سے بذریعہ ٹیلی گرام اطلاع دی جاتی جسے کہا جاتا فلاں کی تار آئی ہے' یعنی مارا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ٹیلی گرام کا ابھی تک آنا خیریت تصور نہیں ہوتا۔

چچا جان پنجاب رجمنٹ کے افسر تھے۔ برما میں دریائے اراوتی کو عبور کرنا پنجاب رجمنٹ کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے پار جاپانیوں کے پختہ بنکر تھے۔ مگر پنجاب رجمنٹ نے وہ علاقہ دریا عبور کر کے چھین لیا' رات کو بنکر میں گولا پھٹا۔ چچا اور ان کا اردلی جو پاس کے گاؤں کا تھا' مارے گئے۔ میں سکول کی مارننگ اسمبلی میں کھڑا تھا کہ استاد نے تار تھما کر کہا گھر لے جاؤ۔ کچھ عرصہ پہلے چچا چھٹی آئے تو ان کی شادی ہوئی تھی۔ ایک روز میں گاؤں سے ڈیرہ پر ان کے ساتھ جا رہا تھا' ایک جگہ اترائی پر میں نے دوڑ لگائی اور گر گیا۔ میرے ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھے۔ چچا نے اٹھایا اور

سمجھایا کہ اگر پرندے کے پر باندھ دیں تو گر پڑے گا۔ اسی طرح انسان کے ہاتھ بندھے ہوں تو وہ گر پڑتا ہے۔ میں رونا بھول کر اس فلسفے کو سوچنے لگا۔ جو آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس دوران مجھے یہ یاد نہ رہا کہ میں ابھی ابھی گرا تھا اور آنکھیں ابھی بھی آنسوؤں سے گیلی ہیں۔ چچا شادی کے بعد واپس چلے گئے اور برما کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ان کی بیوہ نے ساری عمر ان کی یاد میں گزار دی۔

ایک ماموں جنگ عظیم میں کام آئے مجھے یاد ہے بہت خوبصورت اور دراز قد جوان تھے۔ نانا جان دونوں عالمی جنگوں میں شریک رہے' والد صاحب جنگ عظیم میں مڈل ایسٹ میں رہے۔ جہاں رومیل اور منٹگمری میں معرکے ہوئے۔

کچھ اقدار فسلیز اور ٹرائیبز کی جو ہوتی ہیں' وہ ہمارے گاؤں میں بہت سخت تھیں۔ مثلاً کوئی لڑکی سرعام گلی میں بلا مقصد نہیں جائے گی۔ کوئی نوجوان لڑکا گلی سے پگڑی کے بغیر نہیں گزرے گا۔ آوارہ لڑکے گلی میں نہیں بیٹھیں گے۔ خصوصاً اس وقت جب عورتیں کنوئیں یا تالاب سے پانی لینے جاتی تھیں۔ کوئی ایک محلے سے دوسرے محلے بلا مقصد نہیں جائے گا۔ سودا لینے اگر دوکان پر بھی جانا ہے تو پگڑی باندھ کر جائے گا۔

وہ زمانہ کچھ اتنا سادہ تھا کہ ہم عمر لڑکے لڑکیاں رات کو آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ گلیوں میں بھاگ دوڑ اودھم مچایا ہوتا تھا۔ اور کسی کو خیال نہ ہوتا تھا کہ لڑکے لڑکیاں اکٹھے کھیل رہے ہیں۔ یعنی اس وقت ماحول میں اتنی پاکیزگی تھی کہ کسی برائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جو لوگ مذہب سے واقف نہیں بھی تھے۔ اقدار سے ضرور واقف تھے۔ اور ان کو پوری طرح فالو کرنے پر ہمیں فخر محسوس ہوتا تھا اور ہم ایک دوسرے کو غلط باتوں پر ٹوکا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ہمارا گاؤں اس وقت تین ہزار گھروں پر مشتمل تھا۔ تو پورے گاؤں میں کوئی چار عورتیں ایسی تھیں جن کے لئے مشہور تھا کہ ان کے اطوار اچھے نہیں۔ یہ نہیں کہ ان پر کوئی بڑا الزام تھا۔ بلکہ اگر ان کا ذکر آتا تھا' تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ جو ہیں نا۔ فلاں فلاں کوئی زیادہ اچھی نہیں ہیں۔ ان میں کیا برائی تھی یہ ہمیں کبھی بھی پتہ نہ چل سکا۔ چونکہ ہمارے ہاں قبائلی نظام تھا' اس لئے بڑی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اسلحہ بہت کم ہوتا تھا لوگوں کے پاس، ہمارا فوجی آفیسرز کا خاندان تھا۔ تو اس اعتبار سے ہمارے پاس شروع ہی سے اسلحہ تھا۔ دادا جان کے زمانے سے بھی پہلے کی بندوقیں تھیں ہمارے پاس۔ اس زمانے میں عموماً لاٹھیوں سے لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ مگر اقدار یہ تھی کہ اگر دو گروپوں کے درمیان لڑائی ہو رہی ہوتی تھی۔ تو درمیان میں متعلقہ گروپوں کی یا کوئی اور عورت آکر کھڑی ہو جاتی تھی۔ تو مارنے والے کا ہاتھ رک جاتا تھا۔ پھر سی 'بعد میں دیکھ لیں گے' یہ کہہ کر دونوں طرف کے فریق خاموش ہو جاتے تھے۔ تو یہ احترام صرف خاتون کے لئے تھا۔ یہ نہیں کہ اسے کوئی جھڑکے اس کی بات کوئی ٹالے یا پکڑ کر درمیان سے ہٹادے۔

پھر جنگ ختم ہو گئی والد صاحب 'ڈیرہ اسماعیل خان تھے جب ہم بھی ساتھ رہے، چھٹی جماعت میں نے ڈیرہ اسماعیل خان میں پڑھی اس دور کے بازار' سکول' چھاؤنی وغیرہ کا نقشہ اب تک یاد ہے۔ دریائے سندھ 'دریا خان اور ڈیرہ کے درمیان لگ بھگ 14 میلوں پر پھیلا ہوا تھا اور وہاں جہلم نامی اسٹیمر چلا کرتا تھا۔

ہم ڈیرہ اسماعیل خان اعلان پاکستان تک رہے۔ مجھے یاد ہے کہ 13 اگست کی رات ہم نے ایک فلم دیکھی تھی جس کا نام ملنگنی تھا۔ غالباً یہی نام تھا۔ یا اس سے کوئی ملتا جلتا نام تھا اور اگلی شام تک وہ سینما ہاؤس جل چکا تھا۔ شہر میں فسادات ہو رہے تھے پتہ چلا کہ ہندو سیٹھوں نے بھی پٹھان گارڈ بھرتی کر رکھے ہیں۔ یوں دو

طرف فائرنگ مسلمانوں میں ہی ہو رہی ہے۔ ہم اگلی صبح گھر کے لئے روانہ ہو گئے' دریائے سندھ سردیوں میں کئی شاخوں میں بٹ جاتا تھا جن پر کشتیوں کے پُل بنائے جاتے تھے یوں ٹریفک دریاخان پہنچا کرتی تھی۔

گھر جا کر پھر مڈل سکول نور پور میں داخلہ لے لیا۔ نور پور مڈل سکول جہاں حساب کے استاد چوہدری مہدی حسین کرتے کے بٹن کھلے رکھتے تھے' کھیڑی کے چھپڑیاؤں کے نیچے، قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا خشخشی داڑھی کے ساتھ ایک آنکھ ذرا دلی ہوئی بہت سخت مزاج تھے۔ ہم اور کچھ کرتے نہ کرتے حساب کا کام ضرور کرتے تھے۔

اردو ملک خدا بخش صاحب پڑھاتے تھے۔ رہتاس کے رہنے والے صوفی منش نیک انسان تھے۔ نورانی چہرہ اور نیک اطوار والے ملک خدا بخش کا لہجہ بہت دھیما اور مزاج بہت شریفانہ تھا۔ انگریزی کا مضمون سائیں داس پڑھاتے تھے' دبلا پتلا منحنی سا شخص' بات بات پر حکم "کن تو پھڑ کے میرے ول لے آ" اور جب لڑکا حاضر کیا جاتا تو کہتے تمہاری سزا یہ ہے کہ کمرے کے کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ بیچارہ سزا پانے والا۔ پھر سارا دن چاہے کونے ہی میں منہ دیئے کھڑا رہے انہیں اسکی پرواہ نہیں ہوتی تھی وہ سزا دے کر بھول جاتے تھے۔

ہیڈ ماسٹر ملک غلام قاسم ایک مثالی استاد تھے۔ مثالی ڈسپلن جس نے پورے سکول کو واقعی ایک بارعب اور باضابطہ ادارہ بنا دیا تھا۔ بہت سے اساتذہ کی تصاویر ذہن میں ہیں مگر نام یاد نہیں۔ ہاں میں نے چوتھی جماعت جن سے پڑھی وہ مقامی استاد ملک محمد نواز تھے۔ خوبصورت سرخ و سپید رنگت ہلکی سفید داڑھی خوبصورت اجلی کلاہ پر باندھی ہوئی پگڑی صاف ستھرا لباس اور بے داغ کردار کے مالک۔ اللہ کریم انؒ سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

اس زمانے میں تعلیم و تربیت کا ایک خاص معیار تھا۔ اساتذہ کا ایک خاص وقار تھا۔ انہیں بے پناہ عزت و احترام حاصل تھا۔ سکول کا نظم و ضبط مثالی تھا۔ مجھے یاد ہے اگر کسی بچے کا کوئی ملنے والا گھر سے آتا تو اسے گیٹ عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر غلام قاسم صاحب نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کوئی ملاقاتی دوران تدریس سکول میں داخل نہیں ہوگا۔ ملاقاتی کے لئے لازم تھا۔ وہ سکول کے چپڑاسی کو بتائے جو کلاس ٹیچر کو اطلاع دے 'اگر کلاس ٹیچر فارغ ہے تو چند منٹ کے لئے ملاقاتی کو ملنے کی اجازت ہو گی۔ بصورت دیگر ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ اور ملاقاتی کو پیریڈ ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔

مڈل سکول کے بعد جب میں ہائی اسکول میں پہنچا تو بھی یہی طرز تدریس نظر آیا۔ اساتذہ کی کوشش ہوتی تھی کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا جائے۔ وہ ان کے اخلاق و کردار کی تعمیر پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ یہ بھی ہوتا کہ سکول سے باہر نکلنے کے بعد ہم راستے میں کوئی شرارت کرتے تو اس کی شکایت بھی سکول ٹیچر کے پاس آجاتی تھی۔ اور استاد کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس لئے اساتذہ ان معاملات میں بہت محتاط ہوتے تھے۔

ہائی سکول بوچھال کلاں تھا۔ تین چار میل کا فاصلہ تھا۔ کچھ عرصہ پیدل جاتے رہے۔ اپنے گاؤں سے نکلتے تو راستے میں پتھر کی چٹانیں آتیں۔ جن کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا۔ ہم سب لڑکے اس پانی میں چینی یا شکر ملا دیتے۔ رات کو چونکہ ٹھنڈ ہوتی تھی۔ تو وہ پانی جم جاتا۔ صبح گزرتے وقت ہم اس جمی ہوئی برف کو نکال لیتے اور اسے بڑے مزے سے چوستے ہوئے سکول چلے جاتے۔ پھر ہمیں سائیکل مل گیا اور ہم چند سائیکل سواروں میں شامل ہو گئے 'بہت اچھے نیک اور قابل اساتذہ کی رہنمائی نصیب رہی۔ ماسٹر ظفر صاحب' پیر بہادر شاہ'

مولوی عبدالخالق اور ہیڈ ماسٹر ملک اللہ بخش صاحب میانوالی کے تھے ، بہت ہی مدبر علمی شخصیت ' یوں ہم نے میٹرک کر لیا۔

نانا جان کا خیال تھا کہ ہمیں بی اے کرنا چاہئے تاکہ نائب تحصیلدار بھرتی ہو سکیں۔ لہذا گورنمنٹ کالج چکوال میں داخلہ لیا۔ جو گورنمنٹ ہائی سکول کی عمارت میں شروع کیا گیا تھا۔ اور گورنمنٹ ہائی سکول خالصہ سکول کی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے ہوسٹل میں رہنے کے بجائے قریبی عزیزوں کے ہاں رہنا شروع کر دیا جہاں سے سائیکل پر کالج آتا۔ تقریباً دس میل کا فاصلہ صبح اور دس میل کا فاصلہ شام کو کرنا ہوتا تھا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا کہ خاندانی جھگڑوں اور قبائلی لڑائیوں میں نانا جان قتل ہو گئے۔ ان کے قتل نے ہماری دنیا ہی الٹ دی۔ وہ خاندان کے سربراہ اور عظیم انسان تھے ان کے ظالمانہ قتل سے خاندانی وقار کی عمارت ڈھیر ہو گئی اور ہم تقریباً لاوارث ہو گئے۔ پھر کیسی پڑھائی اور کیا کالج' میں نے کتابیں اٹھا کر طاق پر رکھیں اور بندوق ہاتھ میں پکڑلی۔ قاتل پارٹی پر مقدمہ چل رہا تھا۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور ڈیڑھ برس کے عدالتی چکروں کے بعد وہ لوگ رہا ہو کر گھر آ گئے۔

دو سال بعد ۱۹۵۳ء میں پھر لڑائی ہوئی جس میں مخالف اور قاتل پارٹی کا سربراہ مارا گیا۔ اس میں مجھے بھی چالان کیا گیا۔ مقدمہ چلا مجھے ایک سال کے لگ بھگ حوالات اور جیل میں رہنا پڑا۔ کیس کا جلدی فیصلہ ہو گیا تھا۔ ورنہ کئی سال لگ جاتے ہیں ایسے کیسوں میں' اس زمانے میں حوالات ' جیل میں بڑی سختی ہوا کرتی تھی۔ جیل کی زندگی میں دو تین چیزیں تھیں جو آج نہیں ہیں۔ ایک تو جیل کے قواعد پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ جس میں آج کی طرح کوئی سہولت بیچی اور خریدی نہیں جاتی تھی۔ البتہ چوری چھپے کوئی چھوٹی موٹی حاصل کر لیتا وہ اور بات ہے۔ ہم لوگ بھی

بعض اوقات جیل والوں سے چھپ چھپا کر اپنے لئے الگ کھانا تیار کرا لیتے تھے۔ لنگر
والوں کو کچھ دے دلا کر اچھی روٹیاں لگوالیں۔ کبھی کھالیں کبھی کھانا نصیب ہی نہیں
ہوتا تھا۔ کبھی چوری چھپے چائے ہوالی کہ ایک برتن میں دودھ پتی اور چینی ڈالی اور کسی
کو دیا کہ تنور میں رکھ دے اور ابال کر لے آئے۔ اس طرح کبھی کبھی چائے پی لیتے
ورنہ جیل میں چائے پینا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کسی نے شیو کے لئے بلیڈ منگوانا ہوتا تو
صابن کی ٹکیا میں چھپا کر منگوایا جاتا کافی سخت زندگی تھی جیل کی۔

ہمارا شمار خطرناک حوالاتیوں میں ہوتا تھا۔ ہمارے پس منظر کی وجہ سے ہمیں
نارمل لوگ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مجھے جیل کی کوٹھڑی میں بند کیا جاتا تھا۔ میری
کوٹھڑی کے قیدی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہوا تھا۔ اس کو دو سال سزا ہوئی
تھی۔ وہ لمبا تڑنگا شخص تھا۔ داڑھی صاف بڑی بڑی مونچھیں اور لمبے بال رکھے ہوئے
تھے۔ نبوت کے اس جھوٹے مدعی سے بان بنوانے کی مشقت لی جاتی تھی۔ گجرات کا
'ایک اشتہاری بھی' اس سے اگلی کوٹھڑی میں قید تھا۔ میں چونکہ حوالاتی تھا اس لئے
میری مشقت نہیں ہوتی تھی۔ ان دونوں سے مشقت لی جاتی تھی۔ ہم تینوں
کوٹھڑیوں سے باہر بیٹھ کر گپ شپ کر لیا کرتے تھے۔ میں وقت گزاری کے لئے
اس سے باتیں پوچھتا رہتا تھا۔ کہ اگر تم نبی ہو تو نبوت والی کوئی بات بھی بتاؤ تو وہ مختلف
کیفیات اور مشاہدے بتاتا کہ آج وہ دیکھا کل وہ دیکھا۔ اور دعویٰ کرتا کہ اس کا ملک پر
قبضہ ہو جائے گا' اور سب لوگ اسکے مطیع ہو جائیں گے۔ ایک دن میں نے اسے کہا
کہ کل جیلر راؤنڈ پر آیا تھا۔ تم نے لوگوں کی شکایتیں کیں یہ چغلیاں کھانا اور نبوت کا
دعویٰ کرنا آپس میں مطابقت نہیں رکھتا۔ تمہاری بعض عادتیں ایسی ہیں جو ایک
شریف آدمی میں بھی نہیں ہونی چاہئے اس لئے تم نبی نہیں ہو۔
تو اس نے بڑے مزے سے کہا کہ کمزوریاں اور کوتاہیاں سارے نبیوں میں

تھیں۔ اگرچہ ہم ان دنوں بے دین اور بے نماز تھے۔ لیکن یہ بات برداشت نہ ہو سکی
میں اس پر چڑھ دوڑا اور وہاں پڑا ہوا پانی والا گھڑا اٹھا کر اس کے سر پر دے
مارا۔ گجرات کا اشتہاری بھی میری حمایت میں آگیا۔ ہم دونوں نے اس کو بڑی
پھینٹی لگائی شور سن کر جیل کا نمبردار بھی آگیا۔

اس کے پاس آہنی چابیوں کا گچھا تھا۔ ہم نے نمبردار سے آہنی چابیوں کا گچھا چھین
کر اس جھوٹے مدعی نبوت کو خوب مارا۔ وسل بج گئی۔ پولیس آگئی، ہمیں پکڑ کر جیلر
کے پاس لے گئے۔ جیلر کے پوچھنے پر ہم نے مارنے کا اعتراف کر لیا۔ اور ساری بات
سنا کر کہا کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے جیلر بھی آخر کلمہ گو مسلمان تھا۔
اس نے نبوت کے جھوٹے مدعی کو الٹا لٹکا دیا۔ سیشن کورٹ جہلم جہاں عبدالصمد
خان سیشن جج تھے۔ مجھے میرے دو ساتھیوں سمیت جن میں ایک ماموں اور ایک
دوسرے رشتہ دار تھے باعزت بری کر دیا گیا۔

اب وہ آزاد تھا مگر یہ کیسی آزادی تھی جس نے اسے احتیاطیں اختیار کرنے اور لحہ لحہ چوکس اور چوکنا رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بغرض ملازمت والد صاحب کی گھر سے غیر حاضری سرپرست و انتہائی مہربان نانا کے افسوسناک قتل کا حادثہ' چچا کا جنگ میں مارے جانا' دادا جان کا دنیاداری ترک کر کے یادِ خدا میں مصروف رہنا' ایسے عوامل تھے۔ جن کی وجہ سے نوعمر لڑکا مجبوراً خاندان کا سرپرست اعلیٰ بن گیا۔ اب اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ گھر والوں کی دیکھ بھال اور دوسرے تمام امور کا اسے ہی خیال رکھنا تھا۔ پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد پچھلے دو تین سالوں میں پے درپے ہونے والے حادثات نے اس کی سوچ کا انداز بدل دیا تھا۔ اب وہ کتاب نہیں بندوق کی بات کرتا تھا۔ اچھا اسلحہ دفاع اور گھر والوں کی سلامتی اسکے پیش نظر تھی۔ قبائلی لڑائی اور ایک ہی گاؤں میں مخالف پارٹی کے ہمراہ رہنا کچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

دشمنی کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں زندہ رہنے کے لئے بڑی ہمت اور حد درجہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہر وقت مسلح رہنا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا۔ دن کی بجائے راتوں کو سفر کرنا معمول میں شامل تھا۔ زندگی کے ان شب وروز

میں اسے گھر اور خاندان کے افراد کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان سالوں میں وہ اپنی ایک کزن سے ذہنی طور پر بہت قریب ہوتا گیا۔ جو اکثر اس کی خبر گیری اور پہرہ داری کا خیال رکھا کرتی تھی۔ مگر یہ فطری انس تھا جو خالصتاً خلوص اور بھلائی کے جذبے پر نمو پا رہا تھا۔

اب اسے کسی روزگار کی بھی تلاش تھی اسلئے کہ گھر میں بیٹھ کر وقت کیسے گزر سکتا تھا۔ دشمن اس کو قتل کرنے کے درپے تھے' زندگی ان دنوں ایک عذاب مسلسل تھی۔ سخت گرمی میں راتوں کو کمرے کے اندر بند ہو کر سونا' کھڑکیاں روشندان بند رکھنا' جبکہ بجلی کا دیہات میں ان دنوں تصور بھی محال تھا۔ ہر وقت مسلح رہنا اور سونے کی جگہ بدلتے رہنا۔ ایک آرمی آفیسر جو اسکا عزیز تھا فوج میں جانے کا سبب بن گیا جانے کو تو وہ چلا گیا۔ مگر وہاں تک نہ سکا آزاد منش بندہ تھا اور فوج پابندی کا نام ہے۔ لہذا جلد ہی چھوڑ چھاڑ کر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ راولپنڈی میں رہا ملازمت تو حاصل کر لیتا مگر خاندانی دشمن اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اسی لئے اسے واپس آنا پڑا۔

جن دنوں وہ راولپنڈی سے واپس آیا۔ گھر میں اس کی منگنی کی بات چل رہی تھی۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی اسی کزن کا نام لے لیا' جس کے ساتھ لگاؤ اسکے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس کزن کے لئے ان دنوں ایک اور پروپوزل بھی آیا ہوا تھا۔ اپنے ایک عزیز کا جو آرمی آفیسر تھا اور اس کے والدین اس پروپوزل پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ تقریباً ہاں ہونے ہی والی تھی۔ ایسے حالات میں اس نے پسند کا اظہار کیا تو خاندان بھر میں شور مچ گیا (اس کے پھوپھا) کزن کے والد اسے اپنی بیٹی دینے پر بالکل بھی آمادہ نہ تھے ان کا کہنا تھا ایک ایسے جوان کو جس کا کوئی مستقبل نہیں' قاتل دن رات جس کی تلاش میں پھرتے ہیں۔ بھلا کون عقلمند بیٹی

دے سکتا ہے۔ اب بات صرف پسند کی نہ رہی' کیونکہ بات اگر صرف پسند کی ہوتی اور زبان سے اس کا اظہار نہ کیا جاتا تو اور بات تھی۔ اب چونکہ علی الاعلان پسند کا اظہار ہو چکا تھا۔ اس لئے پیچھے ہٹنا مشکل تھا اور وہ پیچھے ہٹنے والا تھا بھی نہیں یہ بات بھی سبھی جانتے تھے۔ پھر کھینچا تانی اور جھگڑے بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر اس کے دادا جان درمیان میں آگئے وہ بہت نیک بزرگ تھے۔ خاندانی سیاست اور دشمنیوں میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت یادالٰہی میں بسر ہوتا تھا۔ مگر اس نازک موڑ پر انہوں نے پوتے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور انہوں نے سب کو رشتہ دینے پر منالیا یوں اس کی منگنی ہو گئی۔

یہ اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا وہ اس موقع پر اپنے اندر ایک الگ ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ کسی کے لئے سوچنا کسی سے ملنے کی خواہش' کچھ عجیب سا انس' جو اسکی وحشت پسند سخت طبیعت کو بالکل نرالا کام محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جو دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور ان کے ساتھ دشمنی نبھانا اسکے حالات کی مجبوری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان حالات میں وہ بالکل ہی ایک الگ انسان بن گیا تھا۔ بندوقیں' اسلحہ اپنا دفاع اور دشمن کو نیچا دکھانا جیسے مقاصد اس کی شخصیت کا حصہ بن گئے تھے۔ جیسے کہ ہر دشمنی کرنے والا دوست بھی ضرور بناتا ہے کہ دوستوں کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ مگر ایسے لوگوں کے لئے ایک بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ کوئی دشمنی میں گھرا ہوا مرد کبھی عورت کی دوستی کا تصور بھی نہیں کرے کہ یہی اسکی بہت بڑی کمزوری ہو گی۔ جو اس کی شکست اور موت تک کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ بات اس کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ ممکن ہے کبھی کسی لڑکی نے اسے متوجہ کرنا چاہا ہو۔ مگر اس کا ایسی باتوں کی طرف کچھ دھیان ہی نہ تھا۔ وہ تو اور ہی مسئلوں کا شکار تھا ایسے مسئلے جو دل سے نہیں دماغ سے سوچے جاتے ہیں اور عقلمندی سے حل کئے جاتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا۔وہ ایک ٹیچنگ کورس میں داخلہ لے کر لالہ موسیٰ چلا گیا۔اب زندگی کسی حد تک ایک ڈگر پر چلنے لگی۔ مستقبل کی پلاننگ قدرے بہتر انداز میں ہونے لگی۔ پچھلے چند سالوں سے زندگی میں ان بلائی آجانے والی پریشانیاں اور حادثے جو تازہ زخم کی طرح مسلسل دکھتے رہتے تھے۔مدھم پڑتے گئے۔اس نے پوری دلجمعی سے کورس کیا اور قریبی گاؤں کے سکول میں بطور استاد اسکی تعیناتی ہو گئی۔کتاب اور حرف سے ٹوٹا ہوا رشتہ پھر استوار ہو گیا۔راستے کا گرد و غبار چھٹنے لگا۔پاؤں کے نیچے جلتی زمین کی ہمہ وقت تپش کچھ کم ہونے لگی۔آسمان کی چھت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی تمنا دل میں کروٹیں لینے لگی۔اس نے ہاتھ بڑھا کر بادلوں کو چھونا چاہا' مگر یہ کیا' نمی سے اسکی پلکیں آنکھیں اور چہرہ بھیگ گیا۔بادل ہاتھ نہ آیا۔آسمان' دھجی بھر آسمان۔اس کی دسترس میں نہ تھا۔جس سے سائبان کا تصور بھی محال تھا۔زمین پر دھوپ تھی ہر طرف جلتی ہوئی تیز دھوپ۔اس دفعہ زندگی حادثات کا نیا رنگ لائی تھی۔

قریبی گاؤں میں رہائش رکھنے کے سلسلے میں اس پر جھوٹے الزام لگے۔ جنہیں اس نے ہنسی میں اڑا دیا۔اور اپنے معمولات میں مگن رہا اور اگر بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا۔مگر معاملہ کچھ بڑھ گیا۔بات اس کی ذات سے ہوتی ہوئی انا تک آئی' تو صورتحال مختلف ہو چکی تھی۔معاملہ سنجیدہ رخ اختیار کر چکا تھا۔الزام گو جھوٹا تھا' مگر بات انا کی تھی۔اس کے اندر چھپے بیٹھے کبھی نہ جھکنے والے اس انسان کی تھی' جسے نو عمری میں ایک بڑے خاندان کا سربراہ بن جانا پڑا تھا اور ذمہ داریوں کا بوجھ ایسے وقت میں اٹھانا پڑا تھا جو خواب دیکھنے اور تعبیروں کی فکر نہ کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ایسے میں اس نے پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھا تھا۔اسی لئے اس نے تمام ذمہ داریاں ہنسی خوشی اٹھائیں اور مردانہ وار تمام مشکلوں سے نکلتا چلا گیا اور کبھی کسی کے سامنے

کمزور نہیں پڑا۔ دشمنی کرنے دشمنی نبھانے اور دشمنوں کے درمیان سر اٹھا کر چلنے تک کے مراحل میں اسکو کبھی بھی کسی نے جھکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

تو پھر یہ سب کیا تھا جھوٹا الزام سچ تو نہیں تھا۔ پھر اسے سچ کیوں مان سمجھ اور جان لیا گیا۔ دشمنوں کی صفوں میں دوستوں کے بھی چہرے تھے ایسے میں اس نے اپنی طرف مڑ کر دیکھا وہ تنہا نہیں تھا۔

اس کے پاس اس کے ناقابل شکست ارادے تھے۔

اس کی نہ ٹوٹنے والی انا تھی۔

اس کی کامیابیاں تھیں۔

دشمنوں پر فتح حاصل کرنے والی اندھی خوشی تھی

اور

اسکی بے پناہ طاقت تھی۔

مگر یہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے ارادوں کے ملبے پر شکست خوردہ بیٹھا اپنے آپ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

یہ کیا............زندگی میں پہلی دفعہ اس نے خود کو کمزور پا کر خود سے سوال کیا۔

یہ کیا............اس کی بے پناہ طاقت اس سے ہاتھ بھر کی دوری پر کھڑی خود سے نظریں چرا رہی تھی۔

یہ کیا............خود کو ایک طویل و عریض تنہائی میں گھرے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

سب کہاں گئے۔ وہ جو دوست تھے 'یار تھے' اپنے تھے۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس نے ان کو پتھروں کی بستی میں پتھرتے دیکھا تھا۔ سب نے منہ پھیر لیا تھا۔ یا پھر اس

نے ہی مڑ کر نہ دیکھنے کے عہد کے باوجود پیچھے مڑ کر دیکھ لیا تھا۔ شاید یہ دیکھنے ہی کی سزا تھی۔ یقیناً یہ دیکھنے ہی کی سزا تھی۔ وہ سچا تھا۔ بے قصور تھا مگر حالات وواقعات نے اسے قصور وار بنا دیا۔ اپنی طاقت اور مضبوطی پر بے پناہ مان کے باوجود وہ ہار گیا۔ اس جھوٹے الزام کا بوجھ سر پر اٹھاتے وقت۔ وہ ایک مختلف کیفیت میں تھا

ایسی کیفیت جو بعد میں بہت دیر تک اس کے ساتھ رہی۔

وہ جو خود کو ہمیشہ سے نا قابل شکست طاقت مانے ہوئے تھا آج تک اس نے جو چاہا کر گزرا۔ پولیس جیل اور عدالت بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ خاندان اور روایات میں سے کوئی بھی اپنی مرضی کرنے سے اسے باز نہ رکھ سکا۔ تو پھر بھلا روایات اور مصلحتوں میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی وہی خاندان کے افراد تھے جن کی بات بھی وہ اپنی مرضی سے مانا کرتا تھا دوبارہ سننا تک گوارانہ کرتا تھا۔ پھر یہ سب کیا تھا۔

(یہاں حضرت جی کا کہنا ہے کہ ایک باغی اور خود سر کو تبدیل کرنے کے لئے جتنا بڑا حادثہ چاہئے تھا شاید یہ اتنا ہی بڑا حادثہ تھا) جس نے اس باغی نوجوان کو جذباتی طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا کہ وہ خاک سے بنا ایک عام انسان ہے۔ جسے حادثات اور واقعات کی آندھیاں تنکے کی طرح اڑانے کی طاقت رکھتی ہیں اپنے اندر۔ وہ جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ در حقیقت کچھ بھی نہ تھا۔ اسے اپنے نا قابل شکست ارادوں کی ٹوٹ پھوٹ نے تھرا کر رکھ دیا۔ وہ تو زندگی کے بہت سے معاملات میں صاحب اختیار تھا۔ پھر یہ بے اختیاری کیسی۔ اس نے کم عمری اور نا تجربہ کاری کے زمانے میں ایک بہت بڑی لڑائی جیتی تھی ایک لمبی دشمنی مردانہ وار نبھائی تھی۔

وہ خود کو فاتح سمجھتا تھا اور شاید سمجھتا ہی رہتا اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو۔

گوتم بدھ نے شاید کسی ایسے ہی موقع پر کہا تھا کہ فتح نفرت پیدا کرتی ہے کیونکہ

مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں لیکن فتح و شکست سے بلند آدمی شانت رہتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات اور حادثات وقت کے انوکھے کھیل ہیں اور اصل میں وقت کی حقیقت ہیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا مسلسل سوچ رہا تھا دوستوں کی محفلیں چھوٹ گئی تھیں۔ لوگوں سے ملنا ملانا موقوف ہو چکا تھا۔ گھر والوں سے بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کھانے پینے سونے اور جاگنے تک کے اوقات بری طرح سے ڈسٹرب ہو چکے تھے اور تو اور اب تو اس نے ہمراہ اسلحہ رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ نہ دوستوں کی احتیاط نہ قتل ہو جانے کا اندیشہ۔ عجیب لاتعلقی تھی عجیب بے نیازی تھی۔ یوں جیسے وہ حال میں رہتے ہوئے بھی اپنے حال سے بے خبر ہو۔ یا جیسے اسے کسی معاملے یا سلسلے سے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی ہو۔

اب وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ زندگی کیا ہے خیر یا شر عذاب یا ثواب؟ محبت یا نفرت دوستی یا دشمنی؟ کیا ہے آخر؟ کیا وہ محض ان تمام عناصر کا مجموعہ ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

یہ کچھ اور' اس کی تلاش تھی یہی کچھ اور اس کی جستجو تھی۔ جو اس کے سامنے سوالوں کی گٹھڑیاں کھول کھول کر ڈھیر کرتی جا رہی تھی اور وہ ان رنگ برنگے سوالوں کے ڈھیر پر بیٹھا خود سے پوچھ رہا تھا وہ کون ہے؟ یہ سب کیا ہے؟

ایسے میں اس نے دیکھا کہ چاروں طرف خلا ہے اور وہ اس میں ہمیشہ کی طرح تنہا موجود ہے۔

دنیا کا ازلی و ابدی انسان

تھکا ہوا شکست خوردہ اور پر امید انسان

جو ہمیشہ خدا کی تلاش میں رہتا ہے

جسے ہمیشہ ان دیکھے محبوب کی طلب مضطرب رکھتی ہے
جو صاف چھپتا بھی نہیں اور دکھائی بھی نہیں دیتا۔
خدا جو پریت نہیں پریتم ہے۔
پریتم بھی ایسا' جو لک چھپ لک چھپ 'آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔
اور لپک جھپک 'میں ہوں' میں ہوں بھی گنگناتا ہے کبھی پلکوں پر سائے کی طرح اترتا ہے
اور کبھی چکاچوند لیئے دھوپ کے ہمراہ چلا آتا ہے
کبھی رگ رگ اور پور پور سے جھانک تانک کرتا ہے۔ اور کبھی پر ہول سناٹے کے تمبو تان کر ان میں خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے ڈھونڈو' مجھے کھوجو۔ کچھ سوجھ نہیں آتی کچھ پتہ نہیں چلتا
کیا ہے؟ آخر کیا ہے؟
اب وہ گم شدہ سا انسان بن چکا تھا

گھر والوں نے ان حالات میں اس کی شادی کا فیصلہ کیا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور شادی ہو گئی۔ مگر اس کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ ملازمت جاری تھی، وہ صبح سکول جاتا تو سکول سے باہر کھیتوں میں چلا جاتا۔ نیند آتی تو کسی بھی کھیت کی منڈیر پر سو جاتا۔ حتیٰ کہ دھوپ سائے کی بھی پرواہ نہ کرتا۔ کئی بار اس کے ساتھی استاد اسے ایسی حالت سے جگا کر لاتے۔

انہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ خواب زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں ہیں اور زندگی بعض وقت خوابوں کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں رہتی تو ایسے میں پھر کیا کیا جائے۔

دل کے رنجوں پر فتح پالو
انانیت کا خول توڑ دو اس سے باہر نکل آؤ۔
نصیب کا مقابلہ کرنے والا کبھی خوش نہیں رہ سکتا سب سے اچھا مقصد حیات وہ
ہے جو کسی کی خوشنودی کے لئے ہو۔
خدا عظیم ہے
اس لئے کہ وہ سب کی نگہداشت کرتا ہے
کسی ایک طبقے میں آکر کسی دوسرے طبقے کے خلاف ایکشن نہیں لیتا
بلکہ ایکشن تو لیتا ہی نہیں۔
ہر عظیم آدمی کٹھن مراحل سے گزرتا ہے۔ ہر عظیم آدمی پر سے کربلا گزرتی
ہے۔ جتنی زیادہ گزرتی ہے اتنا ہی اللہ سے قرب زیادہ ہوتا ہے۔
تو تقرب ہی قوت برداشت عطا کرتا ہے
اگر تقرب نہ ہو تو قوت برداشت ختم ہو جاتی ہے

تقرب ہوگا تو غصہ نہیں آئے گا

انا نہیں آئے گی اور انسان ابتلاؤں سے خاموشی کے ساتھ گزر جائے گا۔ اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے کھلنے لگیں' اب ایک تبدیلی تھی جو آرہی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے مذہب کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اور نماز ادا کرنے لگا تھا وہ آہستہ آہستہ اللہ کی عظمت کا قائل ہونے لگا تھا۔ جو اس کی زندگی کی بہت بڑی تبدیلی تھی اسے عبادت میں ایک سکون سا ملا' یا شاید اس کا نام کچھ اور ہو اور یہ کہ اسے لگا جیسے کسی ویرانے میں بھٹک بھٹک کر اب وہ گھر کے راستے پر ہے۔ ایسے راستے پر جس پر امید کی روشنی جھلملا رہی ہے۔ ایسے میں اسے یہ خیال آیا کہ بہت سے نیک لوگ اور اللہ کے بندے ان راہوں کے راہرو ہی نہیں رہبر بھی ہو سکتے ہیں۔ کیوں نہ کسی کو تلاش کیا جائے۔ ایک خیال جو اچانک آیا اور پھر کہیں اندر ٹھہر گیا وہ معروف پیروں کی طرف متوجہ ہوا۔

ڈھونڈتے ڈھانڈتے ایک بہت مشہور خانقاہ میں جا نکلا اور اپنی اصلاح کی درخواست کی جو پیر صاحب نے خوشدلی سے قبول کر لی۔ زیادہ سے زیادہ وقت پیر صاحب کے قریب رہنے کے لئے اس نے ان کی خدمات اپنے ذمہ کر لیں۔ اب وہ دن رات پیر صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ اور کچھ ہی عرصہ میں وہ ان کے بہت قریب آگیا۔ مگر یہ قربت ایسی تھی جس نے بہت سے راز بے نقاب کر دیئے اور اصلیت کو بہت جلد اس پر روشن کر دیا۔ اسے پتہ چلا کہ بظاہر لوگوں میں پیر صاحب کے چلے اور گوشہ نشینی کی عبادات در حقیقت ان کی سونا بنانے کی کوششیں ہیں جس میں اس فن کے چند بے دین لوگ پیر صاحب کے ساتھ شامل ہیں اور لوگوں سے نذرانے وصول کر کے پیر صاحب مختلف ادویات اور دھاتیں منگواتے ہیں اور رات دن اس کیمیا گری کے چکر میں اس پر محنت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے نسخے آزمائے جاتے ہیں اور

طرح طرح کے طریقوں سے سونا بنانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

اس انکشاف نے اسے ششدر کر دیا' کیونکہ اللہ کے نام کا دھوکہ دے کر دنیا طلبی کا یہ انداز نہ صرف اس کے لئے نیا تھا' بلکہ پریشان کن بھی تھا وہ تو گھر بار کام اور آرام چھوڑ کر اللہ کے راستے پر چلنے کے لئے نکلا تھا۔ اگر اس راستے پر بھی اللہ کے بندوں کے روپ میں دنیا دار بیٹھے ہیں تو پھر اس سے بہتر ہے کہ واپس جایا جائے۔ وہ پیر صاحب سے متنفر ہو گیا اور وہاں سے چلا آیا مگر اس نے اپنی تلاش نہ چھوڑی اس لئے کہ اب اسے تلاش میں ہی کہیں نجات چھپی ہوئی نظر آتی تھی۔

اس کے بعد اس راہ میں اسے متعدد عظیم ہستیوں' مشہور پیروں اور نامور اولیاء اللہ سے ملنے کا موقع ملا اور یہ دیکھ کر اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔ کہ سبھی ایک جیسے مقاصد رکھتے تھے۔ سبھی اندر سے ایک جیسے تھے۔ دولت کی ہوس اقتدار کے شوق اور دنیا کی محبت نے سب کو اندھا کر رکھا تھا۔ سب اپنے اپنے طریقے سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ اللہ کے نام کا بازار سجا تھا۔ سب نے اپنی اپنی قیمتیں مقرر کر رکھی تھیں۔ سب مال کی ریڑھیاں لگائے اللہ لے لو' اللہ لے لو' کی صدائیں لگا رہے تھے اور سادہ لوح دکھی' مظلوم اور بے بس لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ہر ایک کو اللہ چاہئے تھا۔ ہر ایک کی اللہ کے ساتھ اپنی اپنی ضرورتیں وابستہ تھیں۔ ہر ایک کو اس سے کام تھا۔ اسی لئے بدلے میں کوئی تن کی بوٹیاں کاٹ کر پیش کر رہا تھا اور کوئی جان کا نذرانہ کسی کی بغل میں اس کی مجبوریوں کے کھوٹے سکے پڑے تھے۔ اور کوئی اپنے کھرے کو کھوٹا بنا کر پیش کر رہا تھا۔ پیر صاحبان تھے کہ دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے۔ گاہکی زوروں پر تھی ریڑھیوں میں اللہ نام کا ڈھیروں ڈھیر مال رکھا تھا اور اللہ دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اپنی لوٹ کا تماشہ بڑے مزے سے دیکھ رہا تھا۔ نیلام گاہ میں اپنے نام کی بولی لگانے والوں کی آنکھوں میں حرص کی چمک دیکھ کر شدید اداس ہو رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا آخر یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ لوٹنا ہے تو ڈاکو بن کر لوٹو۔ بندوق کی نالی سے لوٹو۔ یہ تسبیح کے چکر میں جو لوٹ مچار کھی ہے یہ تو بہت خطرناک ہے۔ بندوق دولت چھین لے گی۔ جان لے گی مگر ایمان نہیں چھین سکتی۔ جبکہ تسبیح کی لوٹ براہ راست لوگوں کے ایمان لوٹ رہی تھی۔ کوئی جنوں کو قابو کرنے کے وظیفے پڑھ رہا تھا کوئی تسخیر ہمزاد کے لئے چلے کاٹ رہا تھا۔ کوئی مختلف امراض کے علاج کے لئے تعویز بیچ رہا تھا۔ اور کوئی پیتل اور تانبے کو سونا بنا کر راتوں رات امیر بننے کے چکر میں تھا۔

رب کی ربوبیت سے کوسوں دور' دنیا طلبی کے تپتے صحرا میں سب بہروپئے نظر آتے تھے۔ اس وقت اس کی حالت یہ تھی۔ کہ نہ تو وہ واپس جا سکتا تھا اور نہ ہی آگے چلنے کے لئے راستہ نظر آتا تھا۔ کیا کرے عجیب کشمکش تھی۔ اسی ذہنی ابتری کے عالم میں اس نے فیصلہ کیا' اب چل پڑے تو چل پڑے واپسی کی کوئی راہ نہیں۔ شاید کبھی کہیں کوئی مل جائے۔ یا پھر زندگی اس امید اس طلب اور اسی تلاش میں بسر ہو جائے۔ اس مسافری میں یہ تصور بھی اسے منزل کی طرح لگتا تھا ایک ایسی منزل کہ حقیقی منزل نہ ملے تو بھی صادقین اسے کھو نہیں سکتے۔ اس لئے کہ پھر یہی ان کی منزل ہوا کرتی ہے۔

"صادقین کی صحبت اختیار کرو"

(صادقین سے مراد اولیا اللہ ہیں")

یعنی اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وسیلہ یعنی ذریعہ شیخ وہادی تلاش کرو۔

انہی دنوں دکھ کا ایک نیا باب کھلا' زندگی نے ایک تھکی ہوئی کروٹ بدلی اور اس نے وقت کے لق ودق صحرا میں جلتی ہوئی ریت پر کھڑے ہو کر' آسمان کی طرف

دیکھا جہاں ابر کا ایک ٹکڑا بھی اسے نظر نہیں آیا' دور دور تک دھوپ کی تندی تھی جو آنکھوں میں چبھتی تھی' اسے چلنا تھا

چلتے رہنا تھا

گو موت کا دکھ اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ مگر موت بجائے خود ایک ایسا سانحہ ہے جو کبھی بھی پرانا نہیں لگتا' ہر بار نیا لگتا ہے۔ ہر جانے والا' پہلی و آخری دفعہ اس جہاں سے جاتا ہے اور اپنے جانے کے بعد پیچھے اک ایسا خلا چھوڑ جاتا ہے۔ جسے کبھی بھی کوئی پر نہیں کر سکتا۔ اس خلا میں جتنا مرضی 'دکھ' آنسو' اداسیاں اور تنہائیاں بھر دو' اسے باقی رہنا ہوتا ہے اور وہ باقی رہتا ہے۔ یہ الگ بات کہ انسان آہستہ آہستہ اس کے ساتھ رہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ بہت پیارے نانا کی وفات کے بعد اک عرصہ اس نے بھی' اس خلا کو اپنی اداسی' دکھ اور تنہائی سے بھرنے کی کوشش کی' مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو وہ اس کے ساتھ رہنے کا عادی ہونے لگا اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا' مگر بعد کے حالات' اور جذباتی کرائسس نے اسے ایک عجیب موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں سے وہ پیچھے جانا نہیں چاہتا تھا اور آگے جانے کے تمام راستوں پر بھی دھند نظر آتی تھی۔

وہ عجیب گوگو کے عالم میں کھڑا سوچتا تھا۔ کیا کرے کہاں جائے۔ کہ انہی دنوں' چچا' چچی کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ ابھی ان کے جانے کا غم تازہ ہی تھا کہ دلدا جان جیسی شفیق اور مہربان ہستی بھی اس جہان فانی سے منہ موڑ کر چلی گئی۔ اور وہ ان کی قبر پر مٹھیوں میں بھری مٹی ڈالتے ہوئے۔ دکھ کی انتہائی سرحدوں پر کھڑی زندگی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اگر ہم جانے والوں کو روک نہیں سکتے' تو پھر ان کی یادوں کے نقش مٹاتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ کبھی اس زمین اور آسمان کے درمیان اڑتے ہوئے

پرندوں نے ان کی آواز کی بازگشت پر اپنی اڑانیں تیز کر دی تھیں ان کے قدموں کی چاپ پر چیونٹیاں مسلے جانے کے خوف سے اپنے مسکنوں کی طرف لوٹنے لگی تھیں۔ اور ہوا صبح کا پیغام ان کے کانوں میں انڈیلنے کی خاطر کھڑکیوں پر دستکیں دیتی تھی۔

وہ کہاں ہیں وہ کہاں ہیں
جنہیں دیکھنے کی خاطر ہم روز آنکھوں کی مچانوں پر چڑھتے ہیں
پلکوں کا چھجا بنا کر انہیں پتلیوں میں اتارنے کی آرزو کرتے ہیں!

دوسرے چچا کے انتقال نے رنج کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کے ایسے بے پناہ بوجھ سے اسے لاد دیا کہ پھر ان دو خاندانوں کے یتیموں اور بیوہ کی (ایک چچی کا انتقال پہلے ہو چکا تھا) کفالت کی خاطر اس نے گاؤں سے اپنی رہائش ڈیرے پر منتقل کی اور اپنی منتشر زندگی کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس دوران والد صاحب کی پنشن آگئی اور وہ ڈیرے پر آگئے۔

اب اس کی حالت سچل سرمست کے اس شعر جیسی تھی
اے عمر! میری آنکھیں آنسوؤں سے پُرنم آلود رہتی ہیں
میں تیرے قلعے میں بیٹھ کر فالیں نکالتی رہتی ہوں
سچل کی محبت تجھے یاد کرتی ہے
کیچ والا آکر اپنے کرم سے نوازے گا
محبت کرنے والے کی جان مشتاق اور بے تاب ہے

اپنے ایک انٹرویو میں حضرت جی فرماتے ہیں ان دنوں میں ذاتی طور پر شدید

ذہنی اضطراب کی زد میں تھا۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد یہ کیفیت روز افزوں تھی، خاندانی جھگڑوں نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ کوئی بھی حساس آدمی اس صورتحال کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے ایک ذہنی اور جذباتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ سب ایک دم سے ٹھیک ہو جائے لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔ سچ پوچھئے تو اس صورتحال سے میں کچھ تھک سا گیا تھا۔ میں سلامتی اور سکون کی راہ تلاش کر رہا تھا۔ اس لئے تجارت اور کاشتکاری کے علاوہ مسلسل سوچ بچار بھی کر رہا تھا۔

خاندانی طور پر ہمارا گھرانہ ایک دیندار گھرانہ تھا۔ نماز روزے اور پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ میرے دادا جان کا حکم تھا۔ گھر کی کوئی خاتون جو بے وضو ہو گی کھانا نہیں پکا سکے گی ان کی اس بات پر بڑی سختی سے عمل ہوتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ جس کا جی چاہے وہ کھانا پکا لے۔ یہ ہماری خاندانی روایات تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی باقاعدہ مولوی یا عالم نہیں تھا۔ لیکن دینی روایات کی جڑیں بہت گہری اتری ہوئی تھیں۔ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔

تقسیم ملک کے وقت ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی' ہماری مسلم لیگ کی لیڈر شپ جو تھی اس میں شیعہ حضرات بڑے طاقتور تھے۔ تو شاید ان دنوں شعوری طور پر کوشش کی جا رہی تھی کہ شیعہ ازم کو اوپر لایا جائے۔ یا شاید محض ان لیڈران کو دیکھ کر اہل تشیع کے علماء نے اپنے طور پر ایسی کوششیں تیز کر دی تھیں اس زمانے میں چارپانچ عالم ہوا کرتے تھے۔ اہل سنت کے، جو میدان مناظرہ یا تحقیق و تصنیف میں نمایاں تھے۔ اس زمانے کے نامور علماء میں علامہ دوست محمد قریشی پیر احمد شاہ بخاری' عبدالستار تونسوی' جو ابھی حیات ہیں اور حضرت مولانا اللہ یار خان کا نام بحیثیت مناظر اہل سنت میں معروف تھا۔

مولانا اسماعیل' اہل تشیع کے ایک عالم ہوتے تھے گوجرہ کے رہنے والے تھے میری ذاتی رائے میں' جب میں نے دین پڑھا سیکھا اور مطالعہ کیا' تو میں سمجھتا ہوں کہ مولانا اسماعیل' شیعہ کے پہلے پہلے علماء کی یادگار تھے بہت وسیع المطالعہ' بہت ذہین' اور حاضر جواب' عربی زبان پر پورا عبور حاصل تھا انہیں۔ وہ شیعہ سنی مناظرے کے لئے پورے ملک میں دورے کرتے تھے۔ عام مولوی ان کے سامنے نہیں ٹک سکتا تھا۔ عادت یہ تھی کہ جہاں جایا کرتے تھے بہت زوردار انداز میں تنقید کیا کرتے تھے۔ تو اکثر جہاں مولوی اسماعیل کو بلایا جاتا تھا' وہاں چکڑالہ سے مولانا اللہ یار خان کو ان کے ساتھ مناظرے کی دعوت دی جاتی تھی۔ اور یہ مانی ہوئی بات تھی کہ ان کے سامنے مولوی اسماعیل نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

منارے سے آگے ایک گاؤں ہے پدھراڑ' وہاں اہل تشیع کا سالانہ سہ روزہ جلسہ تھا۔ وہاں مولوی اسماعیل نے آنا تھا۔ سنی حضرات نے مولانا اللہ یار خان کو اسی جلسے کے سلسلے میں وہاں بلایا تھا۔ مجھے بھی چند دوستوں کے ہمراہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو خیال آیا کہ پہلے مولانا صاحب سے مل لیا جائے۔ تو پتہ چلا' وہ آرام فرما رہے ہیں۔ جہاں انہوں نے حضرت کو ٹھہرایا ہوا تھا وہ لوہاروں کا اک گھر تھا۔ کچا اور معمولی سا اس میں اوپر چھوٹی سی کوٹھڑی بنا رکھی تھی۔ اوزاروں اور ٹوٹے پھوٹے ناکارہ سامان کے لئے۔ وہیں ایک کھردری سی چارپائی پر ایک پرانی سی دری بچھی ہوئی تھی اور ایک تکیہ رکھا تھا۔ حضرت نے ململ کا لباس پہن رکھا تھا' منہ پر بھی ململ کا پٹکا سا ڈالا ہوا تھا۔ وہ اس وقت قیلولہ فرما رہے تھے اس پائے کے عالم یا مذہبی رہنما میں' اس طرح کی سادگی میں نے پہلی بار دیکھی۔ نہ کھانے میں تکلف' نہ رہنے میں تکلف' لباس بھی سادہ' غذا بھی معمولی مگر جب بات کرے تو علم کے دریا بہا دے۔ وہ مجھے کچھ ہٹ کے لگے۔ ایک تجسس سا پیدا ہوا ان کے بارے میں۔

ظہر کے بعد حضرت کی تقریر تھی۔ جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا میں اصلاحی باتیں کروں گا' ہاں اگر شیعہ حضرات نے اعتراضات کئے تو کل کے جلسے میں ان کے جوابات دیئے جائیں گے۔ میں نے اس جلسے میں بہت سی عجیب باتیں دیکھیں۔ اس آدمی میں کوئی ایسی بات بظاہر نظر نہیں آتی تھی۔ جو انسان کو متاثر کرتی ہو۔ دیکھنے میں معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑے عالم ہیں۔ مگر جب انہوں نے بات شروع کی تو پتہ چلا۔ یہ تو بحر العلوم ہیں۔ انہوں نے مناظرے کے شروع میں کہا ہم شیعہ حضرات سے کچھ سوالات کریں گے۔

اگر انہوں نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا اور اپنے لوگوں کو ہم سے دور رکھنا ہے تو پھر اس مناظرے کی کوئی افادیت نہیں۔ وہ اپنے عقائد میں خوش ہم اپنے عقائد پر راضی۔ پھر اس بحث و مباحثے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے ان کی اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جو بے وجہ چھیڑ چھاڑ پر یقین نہیں رکھتے۔ اس کے بعد مولانا اللہ یار خان نے تقریر کی۔ تو وہ بھی اصلاحی قسم کی تھی۔ اس میں کوئی گرماگرمی نہیں تھی۔ کوئی شیعہ سنی مسئلہ نہیں تھا۔ مولانا نے پھر زور دے کر کہا۔ اگر شیعہ حضرات ان کے سوالات کا بھی جواب دیں گے تو وہ مناظرہ کریں گے ورنہ بے کار کی مشقت میں نہیں پڑیں گے۔

اس سے پہلے تو ہم نے دیکھا تھا کہ مسجدوں میں میدان کارزار بنا ہوتا ہے۔ چیخم دھاڑ' اس کو مار اس کو گرا کسی پر کفر کا فتویٰ کسی کو مرتد قرار دے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ یعنی مقابلہ کے لئے ایک بندہ آیا ہے اور اس کا رویہ اتنا مصالحانہ ہے اب ایک نئی بات تجربے میں آئی۔ کہ یہ آدمی دوسروں سے مختلف ہے۔ ان کی تقریر' دین کے عملی پہلوؤں پر تھی۔ خصوصاً اس میں زیادہ زور رزق حلال پر تھا کہ عبادات کی بنیاد جو ہے وہ یہی رزق حلال ہے۔ اس کا زیادہ اہتمام کیا جانا چاہئے پھر اس تقریر

کے آخر میں حضرت نے فرمایا۔

میں زرا مناظر نہیں ہوں۔ میں صوفی بھی ہوں مجھے پندرہ بیس برس ہو گئے ہیں' اللہ اللہ کرتے میں سلسلہ اویسہ نقشبندیہ میں صاحب مجاز بھی ہوں۔ مجھ میں اللہ کے فضل سے یہ قوت بھی ہے کہ جو میرے ساتھ اللہ اللہ کرے، میں سلوک میں اس کی تربیت کروں۔ جسے حق کی تلاش ہو وہ میرے پاس آئے'

میں اسے اپنی مرضی سے غذا دوں گا

اللہ کا ذکر کراؤں گا

اگر

میرے ساتھ رہے گا فنافی الرسول کراؤں گا

آقائے دو جہاں رحمت العالمین کے ہاتھ پر روحانی بیعت کراؤں گا

یوں کہ اس پر حق واضح ہو جائے گا!!

جلسے میں بہت سے لوگ تھے۔ کچھ تقریر سننے کے شوق میں آئے تھے۔ کچھ شیعہ سنی گرما گرمی کا نظارہ دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ کچھ محض وقت گزاری یا تماش بینی کو ہمراہ لے کر آئے تھے اور مجھ جیسے کچھ روا روی میں دوستوں کے ہمراہ وہاں محض ایک نئے تجربے کے لئے آئے تھے۔ شاید دل کے اندر کہیں وہ چھپی ہوئی تلاش بھی وہاں آنے کا سبب ہو جو گاہے گاہے تنگ کرتی تھی۔ جو بہت سے آستانوں کی خاک چھاننے کے بعد بھی روز اول کی طرح بدستور تشنہ تھی اور موجود تھی کوئی تو ہو گا کہیں تو ہو گا۔ خدا کی اس کائنات میں آخر، اس کا یہ نظام' ایسے بندوں کے بغیر تو نہیں چلتا۔ وہ جو روحانی مراتب اور درجات پر فائز ہوتے ہیں۔ درحقیقت جن کے ہاتھ میں انتظام زمانہ ہے۔ وہ جن کا ذکر کتابوں میں بار بار ملتا ہے اور تمام کتابیں جھوٹ تو نہیں کہتیں۔

سچ ہے۔ کہیں نہ کہیں موجود۔
کتابیں کہتی تھیں۔
اسلام علم بعد میں ہے عمل پہلے ہے۔ علم اور عمل میں فاصلہ کم کرنا ہی ولائت ہے یہی شریعت ہے اپنے علم کو خوشی سے عمل کے تابع کرنا۔ یہی اصل اسلام ہے شریعت عمل اور حکم ہے۔
صرف علم نہیں ہے۔
حکم ہے اس راستے
پر بڑھے چلو۔
درویش آیا تو اس نے کہا!
یہ حکم ہے تو یہی میری خوشی ہے۔ حکم کو خوشی بنانے والے ہی اہل تصوف کہلاتے ہیں
اور
کتابیں یہ بھی کہتی تھیں۔
چونکہ صوفیاء کا کوئی قبیلہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں کوئی قبیلہ نہیں ہے۔ اسلام صرف اسلام ہے صوفیا کرام کو اگر ٹولے کے طور پر سوچیں تو غلطی کریں گے۔ صوفیاء کرام یا ہر صوفی کا الگ الگ طریقہ ہے۔ الگ الگ واقعات ہیں۔ ایک بات ہے کہ جو اچھی نیت سے سفر کر گیا۔ اس کو کہیں تضاد نظر نہیں آیا۔ اور یہ بھی ہے کہ تضاد رکھنے والا سفر نہیں کرتا۔ بس دیکھتا رہ جاتا ہے۔ وہ لوگ جن کو اصلاح باطن میسر آجائے وہ آگے پھر اصلاح باطن کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو صوفی کہا جاتا ہے۔ صوفیا کا آپس میں Comparision نہیں کرنا چاہیے۔ تصوف علم نہیں ہے تصوف عمل ہے کرنے والے کا عمل! اس بظاہر سادہ انسان کو

دیکھ کر، مل کر، اور اس کی باتیں سن کر، اس کے اندر سے ایک آواز اٹھ رہی تھی۔ جو اس کی تمام حسیات میں شامل ہو کر، جزو یقین بن رہی تھی! سچ ہے! حق ہے، ضرور ہے اس شخص کی باتوں میں روشنی ہے! حقیقت ہے عمل ہے اور کیفیت ہے! حق کی کیفیت۔ کیوں لگتا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ تماشہ نہیں کر رہا! حالانکہ اس کی بعض باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ مگر کہیں کچھ ایسا بھی ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔ مگر ہے! وہی دراصل حق ہے، اس کی باتیں جو فہم سے بالاتر تھیں۔ مگر دل کو بے اختیار بھاتی تھیں مثلاً اللہ کا ذکر کراؤں گا۔

فنا فی الرسول کراؤں گا

نبیؐ پاک ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کراؤں گا

اور

حق واضح ہو جائے گا

اس نے دیکھا اس کے دل میں تسلی جیسی کوئی چیز پیدا ہو رہی تھی جو کسی بھی منفی سوال یا شک کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی، جس کا نرم ہاتھ اس کے دل پر تھا اور دل مدتوں بعد طمانیت جیسی کسی کیفیت سے آشنا ہو رہا تھا۔

اس کے بعد شیعہ مناظر نے تین چار سوالات کئے۔ اس کی ساری تقریر ان چند اعتراضات پر تھی۔ ایک فدک کا معاملہ تھا۔ خلافت کا معاملہ تھا۔ نبیؐ علیہ الصلوۃ والسلام کے دفن کا معاملہ تھا۔

دوسرے دن جو جلسہ رکھا گیا تھا۔ اہلسنت کی طرف سے وہ دوسری مسجد میں تھا۔ جو شیعہ کے مرکز کے قریب تھی۔ وہاں صوفی نے خطبے میں فرمایا کہ میرے پاس شیعہ مقرر کے سوال پہنچ گئے ہیں۔ اور میں آج کی تقریر میں ان سوالوں کے جواب دوں گا اور علمی اعتبار کے حوالے سے دوں گا۔ لیکن صرف جواب نہیں دوں گا

سوال بھی کروں گا اور ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ سوال کریں مگر ساتھ ہی میں یہ بھی پورے یقین سے کہتا ہوں اور شیعہ حضرات بھی سن لیں کہ آپ کا عالم بھاگ جائے گا یہ جواب نہیں دے گا۔ اب شیعہ حضرات کی ذمہ داری ہے کہ یہ اپنے عالم کو جانے نہ دیں اور اس سے میرے سوالوں کے جواب حاصل کریں۔

اس نے دیکھا اس کے بعد صوفی نے شیعہ مناظر کے سوالوں کے علمی اور استدلالی طور پر ایسے جواب دیئے کہ عالم دین سے لے کر عام دیہاتی آدمی بھی ان سے مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد صوفی نے کچھ سوال کئے اور جلسہ ختم ہو گیا۔ اس شیعہ عالم نے مختلف بہانے بنا کر وہاں سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور وہ واقعی چلا گیا اس نے صوفی کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جس کا انہیں پہلے سے یقین تھا۔

یہ ملاقات بہانہ بن گئی وسیلۂ حق بن گئی!

ملک محمد اکرم اعوان قبائلی روایات اور اقدار کا باغی گولی کا جواب گولی سے دینے کا قائل مکمل دیندار انسان ظلم و جبر کے خلاف سر عام آواز اٹھانے اور اس سلسلے میں کسی بھی مصلحت کو خاطر میں نہ لانے والا نوجوان، معاشرتی دباؤ سے ذہنی توڑ پھوڑ اور کشمکش میں سکون قلب کا متلاشی خدا کی زمین پر...... خدا کے کئی نام نہاد نام لیواؤں کی اصلیت دیکھ کر ان سے متنفر ہونے کے باوجود تلاش حق جاری رکھنے والا انسان!

دیکھ رہا تھا اس راستے کو جو دور اس منزل کی طرف جاتا تھا جس پر روشنی تھی حقیقت تھی اور سچ تھا۔

اس کی شروع سے عادت تھی جس بات کو وہ اندر سے مان لیتا تھا۔ پھر اس کی چھان بین نہیں کرتا تھا۔

پھر اس کے لئے اسے کسی بیرونی امداد یا گواہی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے اس نے بلا جھجک آگے بڑھ کر اپنی اک عرصہ کی طلب جستجو اور تلاش

اس ولی کامل کے سپرد کردی جو یقینی طور پر اسے سنبھالنے اور جاننے کا اہل تھا یعنی اس نے روحانی طور پر خود کو اس کامل انسان کے سپرد کر دیا۔ جس نے اس کے تمام اختیارات سنبھال کر بھی اسے بااختیار ہی رکھا کہ یہی صوفی کا اصل کام ہے۔

ویسے بھی وہ جانتا تھا کہ

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت تجربے نہیں کرنے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان عن جانا ہی اصل بات ہے۔

کیونکہ اللہ کے ساتھ تین درجے بزرگوں نے بتائے ہیں سر مدمدہ تو'سگ تو' عاشق تو!

ناچیز اتنے کہ تیرے کوچے کے ہم سگ ہیں۔

اور بندہ اس لئے کہ تو معبود ہے

ہم تیرے غلام ہیں کاربند ہیں طلب۔۔۔ تیری ہے تیرے علاوہ ہم کسی اور شئے کے طلبگار نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر شئے فانی ہے دھوکا دے گی۔ ہر تمنا گمراہی کی طرف لے جائے گی۔

اور اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے محبوب ﷺ کی طرف محبت سے رجوع کرو!

پھر اسے محبت ہوگئی! اس محبوب سے 'جو محبوب حقیقی سے ملاتا ہے یہ محبت اپنے پھیلاؤ میں کائناتوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی کیونکہ یہ محبت محبوب خدا رحمت العالمین ﷺ کی محبت میں وجود کے تمام جغرافیے 'منطقیں اور کائناتیں منا دینے والی محبت تھی ایسی محبت جو فنانی الرسول ہو کر باقی ہو جاتی ہے قائم ہو جاتی ہے۔

کشف المحجوب میں ہے۔

بنی نوع انسان میں سے کوئی بشر ایسا نہیں کہ جس نے محبت کا زخم نہ کھایا ہویا

اس سے خوش نہ ہوا ہو۔ کبھی تو اس کا دل مست شراب ہے یا پھر قہر دوست سے خراب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی ترکیب میں بے چینی و بے قراری ہے اور عقل بے کار ہے۔ محبت دل کی غذا ہے اور وہ دل جو محبت سے خالی ہے۔ گل ہے۔ محبت کو کوشش اور محنت سے ہٹایا نہیں جا سکتا اور نفس ان لطائف سے بے خبر ہے جو دل پر گزرتے ہیں۔

حضرت عمر بن عثمان مکی رحمتہ اللہ کتاب محبت میں فرماتے ہیں!

خداوند تعالیٰ نے دلوں (یعنی قلوب کو) جسموں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور مقام قرب میں رکھا اور روحوں کو دلوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور درجات انس میں رکھا اور اسرار کو روحوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور درجات وصل میں رکھا اور ہر روز تین سو ساٹھ بار لطیفۂ سر پر تجلی فرمائی اور تین سو ساٹھ بار نظر رحمت فرمائی اور محبت کے کلمات روح کو سنائے اور تین سو ساٹھ بار انس کی نگاہ سے دل کو دیکھا۔

لیکن جب انہوں نے کائنات میں اپنے آپ کو معزز پایا تو ان کے اندر فخر پیدا ہوا اس لئے حق تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر لطیفہ سر کو روح کے اندر روح کو دل کے اندر اور دل کو جسم کے اندر قید کر دیا! اس کے بعد ان کے ساتھ عقل کو رکھا اور انبیا علیھم السلام کو بھیج کر احکام ارسال فرمائے اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کو اپنے مطلوب کی تلاش میں لگا دیا چنانچہ جسم کو نماز میں لگا دیا' دل کو محبت میں مصروف کیا روح کو قرب میں اور سر کو وصل میں قرار حاصل ہوا۔ خلاصہ یہ کہ محبت کی حقیقت لفظ محبت سے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ محبت ایک حال ہے اور حال ہر گز قال میں نہیں آ سکتا۔ اگر سارا جہان مل کر یہ کوشش کرے کہ محبت کو پیدا کیا جائے یہ ہر گز نہیں ہو سکے گا اور اگر سارا جہان مل کر اس کو مٹانا چاہے تو ہر گز نہیں مٹا سکتا۔ کیونکہ

حال وہبی (عطیہ) ہوتا ہے نہ کہ 'کسبی (کوشش سے) انسان لاہی (حادث) ہے اور حال (الٰہی) ہے لاہی ہرگز الٰہی پر قادر نہیں ہو سکتا! حضرت جی فرماتے ہیں۔

حضرت اللہ یار خان کی ایک خصوصیت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے سینے میں جو کچھ ہے وہ اگلے کو بھی نصیب ہو جائے۔ اس میں ان کا رویہ تشدد کی حد تک چلا جاتا تھا۔ اگلے کو مجاہدہ کی تلقین کرنے میں محنت اور اس کی اصلاح کرنے میں۔

کیونکہ ان کے اپنے معمولات ابتداً کچھ یوں تھے۔

فجر کی نماز سے دو پہر تک لطائف کرنا' پھر کھانا اور آرام کرنا۔ ظہر سے عصر تک لطائف' پھر ضروریات سے فراغت کھانا پینا اور مغرب سے عشاء تک پھر ذکر، عشاء کے بعد آرام اور تہجد کے بعد پھر ذکر یہ معمول آپ کا مسلسل سولہ برس رہا۔

میں نے بھی لطائف پر تقریباً تین سال صرف کئے ہیں۔ حالانکہ مہینے کے اکثر دن حضرت جی کی خدمت عالیہ میں گزارا کرتے تھے۔ ہم چند ساتھی جو اس دور میں تھے۔ ہمیشہ مسلسل لطائف کیا کرتے تھے۔ کبھی سانس توڑنے کی نوبت نہ آتی تھی ہاں اگر کوئی بیمار ہو یا کھانسی وغیرہ آجائے تو اور بات تھی مگر یہ بھی اس قدر کم ہوتا تھا کہ یاد نہیں پڑتا۔

سردیوں میں میرے ساتھ ایک پرانے ساتھی' بابا دوست محمد (مرحوم) مقیم تھے اور ملک خدابخش ہوا کرتے تھے، تو میں سحری میں تقریباً ایک بجے اٹھ جاتا تھا۔ وضو اور نوافل سے فارغ ہو کر دو بجے لطائف شروع کر دیتا۔ اس قدر اندازہ ہو چکا تھا کہ تقریباً ایک سا وقت لطائف کو دے کر چار بجے تک سات لطائف پورے کر لیتا۔ اور چار بجے یہ دونوں حضرات شامل ہو جاتے پھر چھ بجے تک ہم صرف لطائف کیا کرتے اور چھ بجے فجر کی نماز ہوتی تھی۔ میرے چار گھنٹے ہو جاتے اور ان کے دو تو ان مسلسل چار گھنٹوں میں ہم سانس نہیں توڑا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آئے

جھک کر کوئی چیز اٹھانا پڑتی تو لطائف کے مقامات یوں دبدبا کرتے تھے جیسے سینے میں کوئی مضبوط میخیں گڑی ہوں جو پشت تک چلی گئی ہوں۔

سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں صفائی باطن کے تین طریقے مقرر ہیں۔ رابطہ شیخ، ذکر اور مراقبہ! صوفیاء کے نزدیک قرب الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ ذکر اللہ ہے۔

حضرت سید احمد رفائیؒ فرماتے ہیں

ذکر اللہ کی پابندی کرو۔ کیوں کہ ذکر وصال حق کا مقناطیس ہے قرب کا ذریعہ ہے۔ جو اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ذکر کی عملی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جس کو پیر شیخ یا مرشد کہا جاتا ہے۔

رہنما مل گیا تھا۔ جانب منزل پاؤں اٹھ چکے تھے اب تو سفر ہی شوق تھا سفر ہی خیال تھا سفر ہی آرزو تھا، سفر جو کہ روحانی لحاظ سے تو کبھی بھی ناپا نہ جا سکتا تھا مگر مادی لحاظ سے جو منارہ سے چکڑالہ تک کا تھا چکڑالہ میانوالی ضلع کا ایک گاؤں تھا جو منارہ سے کافی فاصلہ پر تھا۔ ان دنوں بسوں کے ذریعے سفر ہوتا تھا۔ سیٹھی نے منارہ، منارہ سے پیل۔ پیل سے تلہ گنگ، تلہ گنگ سے دندہ شاہ بلاول اور وہاں سے چکڑالہ تک پیدل سفر تھا۔

گھر سے علی الصبح نکلتے تو عصر تک وہاں پہنچ جاتے۔ اس وقت بسیں بھی کم کم چلتی تھیں، ہر سٹاپ پر رک کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں دو آنے کا چائے کا کپ ملتا تھا۔ اگر پانچ روپے پاس ہوتے تھے تو آتے جاتے وقت راستے میں چائے کے ساتھ ساتھ کرائے کیلئے بھی کافی ہوتے تھے۔

میں عموماً عصر سے پہلے دندے پہنچ کر وہاں سے چائے پیتا اور پھر عصر کی اذان حضرت کی مسجد میں جا کر کہتا۔ اذان سن کر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں پہنچ گیا ہوں

گویا یہ اذان میرے وہاں پہنچے کی ایک طرح سے اطلاع ہوتی۔

وہ سخت طبیعت کے بزرگ تھے، ذکر اذکار اور تربیت پر زیادہ زور دیتے تھے مغرب سے عشاء تک ذکر، پھر نماز کی ادائیگی چند گھنٹے آرام اور تہجد سے پہلے ذکر پھر نماز و عبادات۔ ان کے معمولات اتنے سخت تھے کہ عام طور پر ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ مگر ان سے بات کرنا کچھ زیادہ ضروری بھی نہیں ہوتا تھا بس ان کو دیکھ لیا ان کے ہمراہ نماز و ذکر کی ادائیگی ہو گئی یہی بہت ہوتا تھا۔

ان سے کوئی ایسا تعلق بن گیا تھا کہ جیسے پیاس لگتی ہے تو انسان پانی کی طرف بھاگتا ہے پانی پی لیتا ہے تو کچھ دیر کیلئے اسے طمانیت سی محسوس ہوتی ہے مگر پھر جب پیاس لگتی ہے تو پھر پانی کی طلب ہوتی ہے ایسی ہی پیاس کی کیفیت ہوتی تھی ان دنوں۔ حضرت سے ملنے کی پیاس۔ ان کو دیکھنے کی پیاس۔ ذکر اذکار کی پیاس۔ اس لیے میں ہر پندرہ روز کے بعد چکڑالہ پہنچ جاتا تھا دو چار روز کے قیام ملاقات 'ذکر اور عبادات کے بعد تازہ دم ہو کر واپس آنا' چند روز گزرتے تو پھر وہی پیاس اور یہ سلسلہ حضرت کے ساتھ پہلی ملاقات سے شروع ہوا تو پھر ان کے وصال تک یونہی چلتا رہا۔

جیسا کہ شیخ طریقت کے لئے لازمی ہے کہ اپنے مریدین اور طالبان حق کی اس طرح دیکھ بھال اور تربیت کرے کہ ہر مرید اور طالب کو استعداد اور ظرف کے مطابق تعلیم دے۔ جس طرح پرندے پالنے والا پرندے کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتا ہے کہ وہ ہر پرندے کے پوٹے سے واقف ہوتا ہے اور اس کے حسب حال اس کو خوراک دیتا ہے۔

اسی طرح حضرت جی تربیت میں طالبان کے ساتھ بالکل ایسا ہی رویہ اختیار رکھتے تھے۔ ہم چار پانچ ساتھی ہوا کرتے تھے سب کو ان کی استعداد کے مطابق اسباق

دیئے جاتے تھے، زور ذکر الٰہی اور عملی زندگی میں فعالیت پر تھا مقامات کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ شروع شروع میں جماعت چند افراد پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد دربار نبویؐ سے حضرت اللہ یار کو فیض عام جاری کرنے کا حکم ہوا' تو آپ نے ذکر اللہ اور روحانی بیعت کے ذریعے حق کا پیغام عام کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ آپ کے گرد لوگ جمع ہونے لگے۔ جماعت کی تعداد بڑھنے لگی۔ جماعت کا پہلا اجتماع ۱۹۶۱ء میں ڈھوک ٹلیالہ ہوا۔

جس میں پندرہ بیس ساتھی شریک ہوئے۔ ڈھوک ٹلیالہ (ملک اکرم اعوان صاحب کا ڈیرہ) چونکہ بستی گاؤں سے آگے' پہاڑوں کے درمیان جنگل میں واقع تھا۔ ناکافی سہولتیں پانی کی کمی اور دشوار گزار پہاڑی راستے کے باوجود' اجتماع پورے اہتمام سے ہوا۔ وہاں سے ایک طرح' باقاعدہ جماعت کی ابتدا ہوئی۔ جو بعد میں آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوئی۔

شروع شروع میں چالیس پچاس کے قریب لوگ ہوتے تھے۔ اس کے بعد تعداد بڑھنے لگی۔ ڈھوک پر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے چونکہ موسم اچھا ہوتا تھا اس لئے حضرت اللہ یار خانؒ گرمیوں میں وہاں ایک ڈیڑھ ماہ قیام فرماتے تھے۔ انہی دنوں اجتماع ہوتا تھا۔ جنگل میں تالابوں سے پانی بھر کر لانا' اتنے لوگوں کے قیام و طعام کا انتظام کرنا اور ذکر اذکار اور عبادات میں بھی پوری طرح شامل ہونا۔ بظاہر مشکل لگتا ہے۔ مگر خدا کی رحمت سے سب کچھ خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا۔ ڈھوک پر تقریباً آٹھ برس باقاعدگی سے اجتماع جاری رہا۔ اس کے بعد حضرت ملک محمد اکرم اعوان (جو کہ ان دنوں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے) کی پوسٹنگ ڈلوال ہو گئی' تو دو سال وہاں اجتماع ہوا۔ سکول کے اندر، اس کے بعد ان کی تبدیلی نور پور ہو گئی' تو سالانہ اجتماع نور پور منتقل ہو گیا۔ جو تقریباً دو سال تک وہاں چلتا

رہا۔ پھر حضرت جی منارہ سکول میں تعینات ہوئے تو سالانہ اجتماع منارہ میں ہونے لگا۔ جو تقریباً آٹھ برس تک وہیں باقاعدگی سے ہوتا رہا۔ تاآنکہ دارالعرفان کی ۸۱ء میں تعمیر ہوئی اور اس کے بعد مستقل طور پر جماعت کا مرکز دارالعرفان منارہ بن گیا۔

اجتماعات اور جماعت کے پھلنے پھولنے کے دنوں کے بارے میں حضرت اللہ یار خانؒ کے مکتوبات سے جو انہوں نے مختلف ساتھیوں کو ٦٣ ء سے ٨٠ ء تک وقتاً فوقتاً تحریر کئے ہیں۔ کافی معلومات ملتی ہیں۔ میں ان مکتوبات سے چیدہ چیدہ باتیں موضوع کے لحاظ سے ' یہاں تاریخ وار درج کر رہی ہوں۔ صرف اس لئے کہ قارئین کو پتہ چلے کہ کن منازل' مشکلات' کڑے مجاہدے اور روحانی مراحل سے گزر کر اللہ والوں کی یہ جماعت عہد حاضر کی تنظیم الاخوان اور سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی موجودہ شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ یہ مکتوبات ایک لحاظ سے جماعت و سلسلہ کے ارتقا کی تاریخ بھی ہیں اور راہ سلوک کے مسافروں کے شب و روز کی پرنور داستان بھی۔

اقتباسات

مکتوبات جناب مولوی محمد فضل حسین

از

حضرت مولانا اللہ یار خان

از چکڑالہ

میں پیر نہیں ہوں نہ بیعت لیتا ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو کتا سے بھی رزیل جانتا ہوں۔ پیری کے قابل کہاں۔

ہاں میرے رب کو منظور ہو تو بیعت رسول اللہ ﷺ سے کراتا ہوں۔ جو پیر مرشد شافع امت ہیں۔ ہاں اتنی عرض کروں۔ اس سلسلہ سلوک میں، ہم منازل طے کراتے ہیں۔ جب میرے رب کا فضل شامل حال ہو تو۔ آپ کو اس بدکار سے بڑھ کر اس وقت کوئی آدمی نہ ملے گا۔

میں 18-7-63 خود کہیں باہر ایک دو جلسہ پر چلا گیا تھا۔ دوم سخت گرمی ہے۔ سوم کچھ نئے ساتھی حلقہ ذکر میں آچکے تھے خیال تھا کہ خدا تعالیٰ مہربانی فرما کر اپنے فضل و کرم سے ان کو فنافی الرسول ؐ تک پہنچادے۔ وہ ہو گیا۔

16-10-63

سرگودھا 5-10-63 کو تمام رفقاء نے شام تک بڑا انتظار کیا۔ بار بار جناب کا نام لیتے تھے۔ مگر آخر مشائخ سے علم ہوا کہ آپ نہیں آئیں گے۔ اگر آپ آجاتے تو جناب کو تمام مشائخ حتیٰ کہ قطب الاقطاب صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا۔ آپ کی ترقی کے لئے عرض کی جاتی۔ اٹھارہ سال آپ نے خدا کی راہ میں لگائے ہیں وہ محنت ضائع کرنے والی ذات نہیں ثواب تو ملے گا۔ آپ کو علم نہیں سولہ سال تو بندہ نے بھی لگائے ہیں اس کے بعد معمولی پانی کی بوندیں پھوٹیں۔ بیس سال کے بعد دریا کی لہریں شروع ہوئیں۔ بائیس سال کے بعد دریا طغیانی میں آیا۔ ساڑھے تیس سال بعد سمندر کی ٹھاٹھیں شروع ہوئیں۔ آپ یاد رکھیں مقام احدیت سے سلوک شروع ہوتا ہے اور کمالات اولوالعزمی تک نصف سلوک ختم ہوتا ہے۔ آگے آدھی یعنی نصف ولایت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے عزیزم! میں تو اب مشائخ و حضور ﷺ کی طرف سے مجبور ہوں کہ تبلیغ کرتا ہوں۔ تعلیم کتابوں کی دیتا ہوں۔ قدرے دنیا کے کاروبار کرتا ہوں۔ توجہ ذکر، تعلیم سلوک دیتا ہوں ورنہ دل چاہتا ہے ایک میں ہوں ایک میرا رب ہو۔ درمیان دوسرا کوئی حائل نہ ہو۔

10-4-64

میں نے درخواست پیش کی تھی حضرت مدنی مدظلہ کی خدمت میں پیش کرنا۔ وہ مبنی بر خلوص تھی کہ یہ چیز یعنی علم باطنی دنیا سے اپنا مقام کھو بیٹھا ہے۔ اس علم کا بازار بے رونق ہو چکا ہے۔ اس کے متلاشی و طالب نابود ہو چکے ہیں۔

میں نے پاکستان کے گوشہ گوشہ کو دیکھا اس کا صحیح طالب نہ پایا۔ جو پایا وہ طالب عزت و طالب جاہ و طالب مال پایا۔ میں نے خوب سمجھ لیا ہے کہ طالب رضائے مولا نابود ہے۔ جو تصوف کا دم بھرتا ہے وہ محض اس کو ذریعہ معاش جان کر!

مولانا! میں نے خوب سمجھ لیا ہے پیروں کے لئے پیری حجاب ہے مولوی کے لئے مولویت ہی حجاب ہے۔ سابقہ بار حضرت صاحبؒ کی خدمت میں بارہ آدمی فنافی الرسول کے لئے پیش کئے گئے تھے۔

5-4-64

کو بائیس پیش کئے تھے۔ اس بار سخت حکم دیا مشائخ نے جلدی کو خیرباد کہیں محنت کرایا کریں۔ کافی وقت بعد مراقبات کرائیں۔

ملک محمد اکرم جناب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ان کا تبادلہ ڈلوال ہو گیا ہے۔ اب پھر سابقہ مقام نور پور میں ہو جائیگا۔ پروفیسر حافظ عبدالرزاق اور ملک محمد اکرم کو توجہ کی اجازت ہو چکی ہے!!

29-6-64

گرمیوں میں تمام رفقا کو دو ماہ کی رخصت ہو گی۔ تو جنگل میں واقع ڈیرا میں قیام کرنا ہے۔ وہاں آپ بھی آجائیں۔ مل کر معمول کرنے سے زیادہ نورانیت پیدا ہوتی ہے عزیزی! اہل اللہ کا وجود تو دنیا سے نابود ہو چکا ہے۔ چند دن ہوئے کہ غوث اعظم کے پاس یہی مسئلہ پیش ہوا۔ تو فرمایا کہ دنیا میں اس وقت تین آدمی ہیں جن سے مخلوق کو فیض ہو رہا ہے۔ ان میں سے تیز فیض اس بدکار دنیا کا بتایا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہیرے و موتی پیدا ہوں گے۔ جو دین محمدیؐ کی صحیح خدمت کریں گے میں سنگ ریزے جمع کر رہا ہوں شاید ان میں کوئی لعل یا کچھ موتی نکل آئیں۔ آپ اللہ والوں کی جماعت میں داخل ہیں۔ اس جماعت سے بڑھ کر کوئی خدا کے ہاں مقبول جماعت نہ ہو گی۔

حضرت ملک اکرم اعوان وعبدالقدیر اعوان

فیصل آباد ریلی میں

اقتباسات!

حافظ غلام قادری صاحب کے نام مکتوبات سے

21-9-66

انسان کو انسان بنانا تو کمال نہیں درندوں کو انسان بنانا کمال ہے، تم کسی کو دین کی تعلیم دینا چاہتے ہو ذکر الٰہی میں مشغول رکھنا چاہتے ہو۔ حضرت صاحب ناراض ہوں گے ہرگز نہیں۔ نرمی اور اخلاق سے پیش آئیں۔ استاد کا رعب کسی پر نہ ڈالا جائے گا بلکہ خادم ہونے کا ثبوت دیا جائے۔

24-6-69

میں انشاء اللہ تعالیٰ نور پور سیٹھی متصل سڑک اس بار ڈیرا لگاؤں گا چودہ دن کے لئے قیام کروں گا کوئی ساتھی چھٹی پر آئے تو 69-7-12ء تک نور پور آسکتا ہے۔

3-9-69

وقت نازک ہے الحاد کا زور ہے خدا کے بندے بن جاؤ۔ جو انعام تم پر ہے وہ

غیروں پر نہیں۔ دنیاداروں کو اگر دنیا کی کرسیاں ملتی ہیں تو ہم کو بفضل اللہ دربارِ نبویؐ میں ملتی ہیں جس پر ساری دنیا کی کرسیاں قربان ہیں۔

16-10-69

عزیزم خوب سمجھ لو! ابدالیت نجبائیت' نقبائیت' اوتادیت' قطبیت غوثیت' افرادیت، قطب وحدیت' صدیقیت یہ مناصب ہیں اولیاء اللہ کے۔ حتیٰ کہ قیومیت تک ہر منصب رسول اکرم صلی اللہ کی جوتیوں سے نصیب ہوتے ہیں ہر طرح کوشش کریں کہ اتباع شریعت کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

30-6-70

میں انشاء اللہ 4-7-70 کو منارہ چلا جاؤں گا۔ اس دفعہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعت بفضل اللہ بھاری تعداد میں منارہ آئے گی۔ منارہ کی جماعت کی کوشش ہے کہ طلباء ہمراہ لانا۔ روٹی لنگر کی کرایہ مدرسہ کا ہوگا۔

10-8-70

اس بار دورہ بے حد مفید رہا۔ جماعت کم وبیش ہو جاتی تھی مگر ستر اسی آدمی حاضر ہی رہتا تھا۔ پورا دورہ منارہ ہی ساتھیوں کو روحانی فائدہ بھی بے حد ہوا۔

15-12-70

میرا ارادہ بائی ایئر حج پر جانے کا ہو چکا ہے۔ کیونکہ ملک محمد اکرم آیا تھا اور منع کر گیا ہے کہ بحری سفر نہ کریں' آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے عذر کیا۔ تو جیسا کہ اس کی عادت ہے' کہتا تھا' ہم سب کو اور پاکستان کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔

25-5-81

رب العالمین کا جماعت پر بے حد فضل ہے۔ تمام مناصب اولیاء اللہ

اخیار۔ ابرار۔ اوتاد۔ نجباء۔ نقبا۔ امامین۔ مکتومان۔ ابدال۔ اقطاب۔ غوث۔ قیوم۔ افراد۔ قطب وحدت۔ صدیق۔ یہ تمام مناصب منتقل ہو کر ہمارے سلسلہ میں آچکے ہیں۔ حج سے واپسی پر قطب مدار جس کو قطب تکوین کہا جاتا ہے اور قطب عالم بھی' یہ زندہ تھا سلسلہ قادریہ کا۔ چند دن ہوئے وہ بھی فوت ہو گیا۔ دربار رسالت مآب سے معلوم ہوا۔ یہ مناصب مناسب حال رفقاء کو خدا تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ ان کے حالات میں نے مختصراً فیوضات حرمین میں لکھ دیئے ہیں۔ یہ ایک ایک منصب والے کافی کافی تعداد میں ہوتے ہیں۔ کوئی تین سو۔ کوئی ستر۔ وغیرہ ذلک البتہ قطب مدار۔ غوث۔ قطب وحدت۔ اور صدیق یہ مناصب ساتھیوں کے لئے میری حیات میں مشکل ہیں بعد میں' جس کو میرا رب چاہے گا عطا کرے گا۔

20-6-72

رات کو عزیزم ملک محمد اکرم صاحب وحافظ غلام جیلانی صاحب تشریف لائے تھے۔ منارہ کا پروگرام بنا گئے۔ دیری بوجہ قلت پانی ہے۔ منارہ میں پانی کی سخت قلت ہے۔ اس واسطے اجتماع کی دعا 74-7-16 مقرر ہوئی ہے 72-8-16 تک ایک ماہ ہے۔ ہندوستان میں بڑی بھاری جماعت بن گئی ہے۔ دو کرنل۔ اٹھارہ میجر کیپٹن وزیریں طبقہ بے شمار ہے۔

30-4-72

میں عمرہ سے واپس آیا تو شدت گرمی' تجلیات حرم شریف وخاص کر قرب دربار نبوت کی فیض وتوجہ رسالت مآب ﷺ کی وجہ سے بخار اور شدت گرمی قلب میں مبتلا ہوا۔ آج دو دن سے قدرے آرام ہے۔ پھر جماعت بھی عمرہ کی وجہ سے مسلسل آرہی ہے۔ آج چونکہ راولپنڈی واسلام آباد میں سخت خطرہ ہے۔ تمام اولیاء ہندوپاک کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس سے پھر دل پر بڑا اثر پڑا۔ خلاصۃ الکلام آپ سے

درخواست ہے کہ آپ منارہ کافی وقت لے کر آنا کہ آپ کی پوری تکمیل ہو جائے۔ اور آپ کو صاحب مجاز خلیفہ بنادیا جائے کہ آگے آپ کام کر سکیں۔ منارہ کے دورہ کی تاریخ 7-6-77 سے 7-7-77 تک تقریباً 36/38 دن مقرر ہوئی ہے۔

15-2-74

میں 31-01-74 کو گھر آ گیا تھا۔ (دوسرے حج سے) رات قیام چکوال تھا۔ جماعت راستہ سے کافی ملتی رہی۔ میجر غوث ساہیوال سے ہمراہ ہوا۔ گوجرانوالہ سے لاہور کی جماعت کے ہمراہ واپس ہوا۔ جہلم جماعت، سپیشل بس اور دوکاریں لائے تھے۔ چکوال جماعت تقریباً ۳۰۰ آدمی، سرگودھا پنڈی تک جمع ہو گئے تھے۔ جنگی قیدی احباب سے ساٹھ آدمی پاکستان آگئے۔ وہ تمام جمع ہو کر 19-2-74 کو چکڑالہ آرہے ہیں۔ اس بار حج پر بے حد انعامات روحانی حاصل ہوئے۔ پوری جماعت مالامال ہو گئی۔ بفضل اللہ۔

اس کے بعد
ملک مختار احمد صاحب کے نام مکتوبات سے

اقتباسات

9-3-78

دورہ منارہ 78-2-28ء سے 78-8-2 تک مقرر ہوا' یعنی 28 جون سے دو اگست تک رہے گا۔ نئے چار پانچ کرنل حلقہ میں آگئے ہیں۔ جماعت دن دگنی رات چوگنی ہو رہی ہے۔

13-12-78

عزیزی! 78-12-7 کو جماعت آئی تھی' ستر' اسی آدمی تھے۔ نو کرنل چوبیس میجر تھے۔ ملک محمد اکرم صاحب و حافظ صاحب بھی تھے۔ دار العرفان مسجد کی مکمل تیاری ہو گئی۔ چند دن تک تعمیر شروع ہو جائے گی۔

مولوی عبد الغفور صاحب کے نام مکتوبات سے چند اقتباسات :

8-10-79

منارہ کا دورہ بعد رمضان متصل ہو گا۔ تیرہ چودہ اگست عید ہو گی۔ اگست کی انیس کو دورہ شروع ہو گا اور چالیس دن مسلسل رہے گا۔

ایک اور مکتوب

منارہ کا دورہ تین جولائی سے 8 اگست تک مقرر کر دیا گیا ہے۔ آپ کو جتنا وقت ملے وہ نکال کر اس وقت کو غنیمت سمجھنا اور منارہ قیام کرنا کہ آپ کی تکمیل ہو۔

28-1-80

عزیزم صوفی مختار صاحب! کابل کے مسلمانوں اور خاص کر مجاہدین کے لئے ہر نماز اور ذکر کے بعد دعا طلب کرنا۔ یہی حکم دربار رسالتؐ سے معلوم ہوا۔ باقی آپ کی تحریر سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمہ تن مجاہدین کی طرف متوجہ ہیں۔ اور روحانی کمک بدستور ان کی امداد کے لئے بھیج رہے ہیں۔ لہذا خاص کر ہماری جماعت کا فرض ہے کہ وہ دعا کی امداد کریں۔

تصوف کے بارے میں، لوگوں میں کئی طرح کی کہانیاں، پراسرار واقعات اور عقل و فہم سے ماوراباتیں مشہور تھیں، لوگ تصوف کو کبھی فلسفہ، کبھی اخلاقیات، کبھی نفسیات، کبھی بے عملی اور زندگی سے گریز کارویہ، کبھی کمیونزم کا ابتدائی نمونہ اور کبھی ذہن کی پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کا طریقہ سمجھتے تھے۔ (حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں) بعض طاقتوں کی طرف سے بیعت اور تصوف کے سلسلوں کو دین سے خارج قرار دینے کی، کوششیں جاری تھیں۔ انگریزوں نے مدراس میں جو تھیوسوفیکل سوسائیٹی قائم کرائی تھی۔ اس کے بنیادی مقاصد میں سے یہ تھا کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ روحانی مدارج حاصل کرنے کے لئے بیعت کی ضرورت نہیں۔

اس پس منظر میں حضرت اللہ یار خان کی پوری مساعی، عوام الناس کے ذہنوں میں پیدا ہونے والی ان تمام خرافات اور شکوک کے رد کے سلسلے میں جاری تھی، آپ تقریروں، تحریروں، مکتوبات اور ارشادات کے ذریعے، لوگوں کو تصوف کی اصل روح کے بارے میں بتاتے تھے۔ وہ راہ سلوک میں مجاہدات اور عبادات کے ذریعے، اللہ کے بندوں کی جماعت تیار کر کے انہیں بارگاہ رسالتؐ میں روحانی بیعت کے لئے پیش کرتے تھے!!! انہوں نے ظاہری بیعت کی اس سلسلہ میں کبھی ضرورت محسوس نہیں کی، مگر، ۱۹۷۷ء میں انہیں بارگاہ رسالت سے ظاہری بیعت لینے کا حکم جاری ہوا۔ جو ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

"میں آپ کو سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں بیعت کرتا ہوں اور اس کی نسبت آپ کو عطا کرتا ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی ظاہری بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور وہ تمام پرانے ساتھی، ارکان سلسلہ عالیہ 'جو فنافی الرسولؐ ہو کر روحانی بیعت سے مشرف ہو چکے تھے۔" ظاہری بیعت سے سرفراز کئے گئے۔

اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دینے کا نام "بیعت" ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ یہ بیع ہمیشہ اس برگزیدہ شخص کی وساطت سے عمل میں آتا ہے جو اس سنجیدہ اور مہتم بالشان معاملہ میں وسیلہ بننے کا مجاز ہو۔ یہ بیعت جب کہ صحیح شخص کے ہاتھ پر پورے آداب و شرائط کے ساتھ کی جاتی ہے 'وہ سلسلہ بسلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ اور واصل باللہ تک جاکر منتہی ہوتی ہے۔

صوفیاء میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں' جو خود بڑے پائے کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں اللہ درجات بھی دیتا ہے۔ لیکن انہیں آگے تقسیم کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کو اس لئے نہیں بتاتے کہ وہ حَلّ سے کام لیتے ہیں' بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ان کو تقسیم کرنے کی استعداد ہی نہیں دی جاتی۔ بڑے قلیل وہ ہوتے ہیں۔ جنہیں تقسیم پر لگا دیا جاتا ہے۔ خیر القرون کے بعد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عہد' پھر صحابہ کرام کا عہد' پھر تابعین اور تبع تابعین کا' ان تین صدیوں کے بعد جتنے بھی ولی اللہ ہوئے ہیں ان میں بڑے بڑے اعلیٰ نام ہیں۔ انہوں نے بھی راہ تصوف میں پانچ دس خاص آدمیوں کو ذکر اذکار کرایا' باقی اگر چار یا پانچ لاکھ بندہ بھی ان کا مرید ہوتا تھا' تو زبانی اذکار بتاتے تھے۔

شاید ہر عہد کی ایک اپنی ضرورت ہوتی ہے' اسی لئے' جب حضرتؒ کو فیض عام کا حکم ملا تو آپؒ نے ہر آنے والے کو خواہ وہ بندہ تھا یا بی بی' بچہ تھا یا بوڑھا۔ امیر تھا یا

غریب' پڑھا لکھا تھا یا ان پڑھ۔ اور یہ چودہ سو سال میں پہلی دفعہ ہوا۔
حضرت جی فرماتے ہیں۔ میرے ذاتی مشاہدے میں یہ بات ہے کہ حضرت اللہ یار خانؒ کی ذات سے اللہ کریم نے یہ کام لیا کہ وہاں ہر آنے والا صوفی ہے۔ مسجد کے حوض میں جو پانی بھرنے والا ہے' وہ بھی فنا فی الرسولؐ ہے۔ جو ملاقاتی بھی آیا اسے صرف زبانی وظائف یا اصلاح پر نہیں رکھا' بلکہ اسے کیفیات قلبی دیں' تو اس پائے کے جو لوگ ہوتے ہیں' ان کی ہر ادا میں انفرادیت ہوتی ہے۔ ایک بندے کو اللہ نے ایسی فضیلت سے نوازا ہے کہ کئی صدیوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی اس شعبہ میں۔ جو ایسا سلیکیٹڈ بندہ ہوتا ہے' اسکی ہر ادا میں ایک دلنوازی یا دل فریبی کی بات ہوتی ہے بندہ اس میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ میں تو ان کی ذات میں ایسا ڈوبا کہ اپنے آپ کو الگ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی میری کوئی حیثیت ہے' اگر سوچوں تو حضرتؒ کے علاوہ' میرا نہ ہونا ہی میرے پاس رہ جاتا ہے۔
زندگی کے اندر ذائقے اور کیفیت بدلتے رہتے ہیں۔ شیخ آپ کی کیفیت کے اندر رہنے والے احساس کا نام ہے۔ یہی خیال آپ کو زندگی کے تذبذب کے لمحوں سے بچاتا ہے' تصور شیخ زندگی میں لحہ لحہ رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ کہ کیا کرنا ہے۔ تصور شیخ فار مولا بھی ہے' کوشش بھی ہے۔ عطا بھی ہے' شیخ کا تصور انسان کے دل سے ہر نقش محو کر دیتا ہے۔ سب پریشانیاں دور کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو باقی ہر تصور سے آزاد کر دیتا ہے۔ نہ کوئی خیال' نہ کوئی وہم۔ شیخ نے آزاد کر دیا' اور آزادی میں اسیری عطا کر دی کہ اسی تصور میں رہے گا۔ اسی خیال میں رہے گا۔ اسی احساس میں رہے گا۔ یہ اسیری ہی نجات ہے کہ آدمی لغزش سے محفوظ ہو گیا۔
حضرت اللہ یار خانؒ کے ساتھ زندگی ایک مسلسل مجاہدے اور ریاضت میں گزری۔ مزدوری بھی کی' زمینداری بھی کی' دوستیوں اور دشمنیوں کے درمیان حد

اعتدال کے ساتھ دنیاداری بھی کی' اور اس کے ساتھ ساتھ جماعت سازی میں بھی جو خدمت اللہ کریم نے نصیب کی' حسب توفیق کچھ چھپا کر نہ رکھا۔ حضرتؒ اس بات پر بہت خوش تھے 'اللہ کریم نے مجھ پر خاص احسان فرمایا' بہت نوازا مجھے۔ بارگاہ نبویؐ میں خادم کی حیثیت سے قبول کیا' اور راہ سلوک کے مسافروں کی خدمت کے لئے بھی منتخب کیا۔

علم قرآن کے بارے میں یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جس طرح کی زندگی ماضی میں' میں نے گزاری تھی' اس میں پے در پے حادثات کی وجہ سے اعلیٰ دینی اور دنیاوی علوم حاصل کرنے کا مجھے موقع نہ مل سکا' یہی وجہ تھی کہ سوائے حضرتؒ کے زیر سایہ رہنے اور قلبی و باطنی تربیت کے میرے پاس اس ضمن میں کچھ نہ تھا۔ حضرت جیؒ کو تفسیر قرآن کریم کے لئے فرصت میسر نہ آئی' آپؒ نے صرف "تفسیر آیات اربعہ لکھی۔ (لہذا یہ کام روحانی طور پر آپؒ کے جانشین کے سپرد ہوا۔)

میں نے ان دنوں حضرت جیؒ کی ہمراہی میں بیت اللہ شریف پر حاضری دی' تو پہلی نگاہ بیت اللہ شریف پر ڈالتے وقت اپنے لئے "علم لدنی" کی دعا کی' جو قبول ہوئی' اور اللہ کریم نے مجھے فہم قرآن عطا فرما دیا۔ جو اسرار التنزیل کی دس جلدوں کی صورت سب کے سامنے ہے۔

یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے' میں حضرت جیؒ کے ہمراہ تھا' روضۂ اطہر سے رخصت کا وقت تھا۔ حضرتؒ سر جھکائے دست بستہ پر کاہ کی طرح لرزاں کھڑے تھے' اور اس شدت سے رو رہے تھے کہ جسے زار و قطار کہا جائے تو غالباً مفہوم ادا نہ ہو۔ اس قدر مضبوط اور عظیم انسان' جس نے مردانہ وار ہر اس طاقت کو للکارا جو اسلام کے خلاف ابھری اور زندگی بھر عصمت رسول ﷺ اور عصمت صحابہؓ کی پاسداری کی' جسے میں نے سفر و حضر میں' ہنگاموں اور اجتماعات میں تنہائی و علیحدگی میں' چٹان سے بھی

مضبوط پایا' اس ہستی کو اس طرح ٹوٹتے بکھرتے اور قدموں پر نثار ہوتے دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ آپ کی یہ آخری حاضری ہے۔ اور پھر شاید اس مادی جسم کے ساتھ حاضر نہ ہوں۔ اس کے بعد کتنے پروگرام عمرہ کے لئے' حرمین شریفین کی حاضری کے بنے 'مگر حضرت وہاں حاضر نہیں ہوئے!

پھر لنگر مخدوم کے پروگرام پر حضرت جیؒ نے سلسلہ عالیہ کے لئے خصوصی احکامات وہدایات ارشاد فرمائیں' انہوں نے فرمایا' مجھے لگتا ہے شاید اگلے اجتماع میں' میں آپ کے ساتھ نہیں آسکوں گا۔ وہیں حضرت جیؒ نے مجھے اپنے جانشین کے طور پر نامزد کیا۔ جس پر میں نے عرض کیا تھا کہ جماعت کی ذمہ داری دینا ہے تو میرے علاوہ کسی کو دیجئے گا۔ چونکہ میں آپ کے پاس پیر بننے یا گدی نشینی کیلئے نہیں آیا' میں اپنی اصلاح کے لئے آیا تھا۔ وہ ہوئی یا نہیں' مجھے منزل ملی یا نہیں' میری عمر یہاں اسکی جستجو میں لگ گئی اور میں الحمد للہ اس پر خوش ہوں۔ مگر یہ پیری اور یہ کام میرے کرنے کا نہیں ہے' آپ بے شک جسے مناسب سمجھیں اس کے ذمے لگا دیں' میں اس کے ساتھ بھی اسی طرح تعاون کرتا رہوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ آپ نے اس کے باوجود یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی' دو ساتھی اور بھی آپ نے نامزد کئے' اور فرمایا کہ یہ جو ہیں انہیں بھی میں مقرر کرتا ہوں' لیکن یہ فنافی الرسول میں بیعت نہیں کرا سکیں گے۔ یہ منصب ایک ہی آدمی کا ہوگا' جسے یہ بھی تیار کریں گے' بیعت کے لئے اسی ایک بندے کے پاس لے جانا پڑے گا۔

پھر 1984ء فروری اٹھارہ کو حضرت جیؒ اس جہان فانی سے پردہ فرما گئے۔ (ان کے وصال اور تدفین کے حالات اس کتاب میں ان کے متعلق مولانا محمد اکرم اعوان کے تحریر کردہ مضمون میں درج ہیں)۔

یاد رہے کہ جب بھی کوئی عظیم انسان دنیا سے اٹھتا ہے' تو اگرچہ اس کی خالی کردہ

جگہ پر نہیں کی جاسکتی۔ مگر اسے ہر کس و ناکس کے لئے خالی بھی نہیں چھوڑا جاسکتا ورنہ جس قدر عظیم فوائد حاصل ہو رہے ہوتے ہیں' ان سے بڑے نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ حضرتؒ دار دنیا سے پردہ فرماگئے۔ مگر وہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے اس دور کے بانی شیخ تھے، ہیں اور رہیں گے۔ نسبت اویسیہ روح سے روح کے مستفید ہونے کا نام ہے۔ اور دنیا ہو یا برزخ' روح سے استفادہ یکساں ہوتا ہے' فرق یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص خدمت عالیہ میں حاضر ہو سکتا تھا۔ اور برزخ میں کسی ایسے آدمی کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ جو برزخ تک اس کی رہنمائی کرے اور وہاں تک آدمی کو پہنچائے۔ اور ایسا وہی شخص کر سکتا ہے' جو ان حضرات کا خادم یا نمائندہ ہو۔ فیض انہی کا ہوتا ہے۔ مگر اس کی تقسیم اس ایک وجود کے ذریعے ہوتی ہے۔ اسی کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔

خلیفہ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو اسکا قائم مقام ہو اس کی جگہ پر کام کرے اور وہ شخص اسی عزت واحترام کا مستحق ہوتا ہے۔ جو اس کے شیخ کے لئے ضروری ہے کہ یہ عزت اس کی ذات کی نہیں بلکہ اسکے منصب اور مقام کی ہوتی ہے۔ خلیفہ ایک دم سے نہیں بنتا' اس کی پیچھے کڑی ریاضت' مجاہدے اور تربیت کی بھٹی ہوتی ہے جس سے راہ سلوک کے اس طالب نے کندن بن کر نکلنا ہوتا ہے۔ سلاسل کی قیادت نصیب ہونا آسان نہیں۔ رحمت خداوندی۔ اتباع رسولؐ اور توجہ شیخ کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔ یہاں توجہ اور درپردہ تربیت کے بارے میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

یہ 63/1962ء کی بات ہے کہ ہم حضرت اللہ یار خانؒ کے ساتھ موہڑہ کور چشم میں مقیم تھے۔ غالباً ہفتہ عشرہ کا اجتماع تھا۔ صبح وشام حضرت خود معمول کراتے تھے۔ وہاں حضرت حافظ صاحب' غلام جیلانی صاحب وغیرہ اس وقت کے ساتھی

موجود تھے۔ وہاں کے ایک ساتھی تھے۔ جن کا نام غلام سرور تھا' وہ حضرت کے ان کے ساتھیوں میں سے بھی تھے۔ ایک دن ذکر کے بعد' حضرت سے عرض کی کہ حضرت ذکر میں جس قدر انوار آپ پر وارد ہوتے ہیں۔ سارے اس شخص (حضرت جی اکرم اعوان صاحب) پر جاتے ہیں اور پھر اس سے تقسیم ہو کر باقی ساتھیوں پر پہنچتے ہیں۔ تو حضرتؒ نے فرمایا' ہاں ایسا ہی ہوتا ہے' تم نے صحیح دیکھا ہے' اس وقت یہ بات وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ بائیس برس بعد یہی گناہگار حضرت اور طالبین کے درمیان واسطہ رہ جائے گا۔

حضرت اللہ یار خانؒ نے جیسا کہ حضرت جی کو لکھے گئے اپنے خطوط میں فرمایا تھا:

آپ کو خیال ہونا چاہئے' آپ کو خدا اور رسولؐ اور مشائخ کی طرف سے زنجیر ڈال کر جج پرلے جایا جارہا ہے سوچیں۔ آپ کو غالباً بلکہ یقیناً آسمان و زمین کا ستونی منصب ملنے والا ہے۔ مگر اس امر کو دل میں رکھیں' کسی سے اظہار نہ کرنا۔ میں نے کافی عرصے سے اس منصب کے بارے میں آپ کا نام نامی پیش کیا تھا۔ یہ منصب اطاعت اللہ اور رسول کی وساطت سے اور مشائخ کی جوتیوں کی دھوڑ کو سرمہ بنانے سے ملتا ہے۔ اور خود ذات العالمین اس بندہ میں استعداد بھی ودیعت فرماتے ہیں۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں۔

—— آپ اپنی ذمہ داری کو سنبھالتے ہوئے کن فی الظاہر جسمانیاً و فی الباطن روحانیاً پر عمل کرتے ہوئے جو کام بھی مطابق شریعت کر گئے۔ وہ ذکر الٰہی میں داخل ہوگا۔ نماز کی باوقت پابندی۔ کوشش جماعت کی کرنی۔ نوافل تہجد کا خیال۔ ذکر و مراقبات میں مشغول ہونا۔ توجہ رفقاء میں سستی نہ کرنا اپنی ذمہ داری سے خبردار رہنا آپ کا وجود بے فائدہ تخلیق نہیں ہوا۔ خدا تعالیٰ جو اس وجود سے کام اپنی یاد و دین کا لینا چاہتا ہے اسکو ادا کریں۔ آپ کو میں اپنا مخلص و محبوب روحانی بچہ جانتا

ہوں۔ دل کو تسلی ہوتی ہے تو آپ کا وجود ہی خوشی کا سبب بنتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو یقیناً منصب "قطب الرارى" پر فائز المرام نہ ہوتے جو "ستون جہاں" ہے۔ میں کیا پوری جماعت کو اگر سہارا ہے تو آپ کا وجود ہے۔ آپ جماعت کے جرنیل ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو' آپ کے وجود سے خدا تعالیٰ نے دین کا کام لینا ہے۔ لے لیا اور لے رہا ہے!

ایک اہم بات جو حضرت جی کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہے اسے عرض کرتی چلوں۔ آپ نے 70ء میں منارہ' دوسری شادی کی؟ اس بارے میں حضرت جی فرماتے ہیں '72ء سے میری دونوں بیویاں میرے بزنس میں' دوستی دشمنی میں اور جماعت کے کاموں میں سو فیصد میری معاون رہی ہیں۔ میں نے بڑا خرچ کیا' جماعت سازی پر چونکہ ہمارے ہاں چندے کا کوئی Concept نہیں تھا۔ اس لئے 62ء سے لے کر 80ء تک جماعت کا جتنا لوڈ ہوتا تھا وہ مجھ اکیلے پر ہی ہوتا تھا۔ ان دنوں میری جتنی آمدن بھی تھی' اس میں سے کچھ پس انداز نہیں ہوتا تھا' ساری اللہ کی راہ میں خرچ ہو جاتی تھی' میری دونوں بیویوں میں سے کبھی کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا تھا کہ یہ پیسے ادھر کیوں جاتے ہیں' بلکہ وہ خوش ہوتی تھیں کہ اچھی جگہ پر پیسہ صرف ہو رہا ہے۔ یہ مجھ پر اللہ کا احسان ہے۔ دونوں بیویوں سے چار چار بچے ہیں' ان میں کوئی تفریق نہیں کہ وہ ادھر سے ہیں' یا ادھر سے' الحمد للہ بچے بھی ذکر کرتے ہیں اور بچیاں بھی ذکر کرتی ہیں۔ باقاعدگی سے اجتماعات میں شریک ہوتی ہیں۔ میری فیملی میرے مشن اور سلسلے میں میری پوری معاون ہے۔

صوفی کو لوگوں کی تعریف یا تنقیص سے بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے' خصوصاً ان حضرات کو جن کو فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نصیب ہو جائے۔ ان کا حق یہ ہے کہ کسی بھی کام کا معیار حضورؐ کی پسند ہو' لوگوں کی پسند نہ ہو۔ کیونکہ لوگ وہاں

تک نہیں پہنچتے' جہاں تک وہ پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ لوگوں کو وہاں حاضر نہیں ہونا ہوتا' شام کو جہاں اسکو جا کر کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ لوگوں سے اس درجہ کی پوچھ گچھ نہیں ہو گی' جس معیار کی اس سے ہو گی۔

کوئی شخص جسے یہ منصب نصیب ہو جائے' اس پر اللہ کی نعمتیں تمام ہو گئیں اس سے زیادہ اتمام نعمت کی عملی صورت کیا ہو گی ؟

کوئی بھی نعمت جو کائنات میں بٹتی ہے وہ اللہ کی رحمت ہے۔ اور رحمت مجسم ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ' اولین کے لئے بھی' آخرین کے لئے بھی۔ اللہ کے سوا ساری کائنات کے لئے رحمت مجسم ہیں۔ دو عالم کو ان کے نقش کف پا پر قربان کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ دنیا تو بڑی حقیر سی شے ہے اور اس نے چھوٹ جانا ہے۔ ہر ایک سے چھن گئی ہمارے پاس کب رہے گی۔ دنیا کو اگر حضورؐ کے ارشادات پر قربان کیا تو کیا کمال کیا۔ یہ تو ویسے ہی ضائع ہونے والی نعمت تھی۔ یہ سمجھے کہ میں نے قربانی دی اور دنیا کی راحتیں حضورؐ پر قربان کر دیں۔ تو اتنا یاد رکھیئے' یہ نعمتیں' ہمیشہ پاس رہنے والی تھیں کب۔ مزہ تو جب ہے کہ اپنی پسند ہی کو قربان کر دے۔ اپنا کچھ باقی نہ ہو۔ کسی چیز کی ضرورت نہ ہو' نام و نمائش کی تمنا نہ ہو' اپنی کسی خوبی اور صفت کے ساتھ متصف ہونے کی ضرورت نہ ہو۔ نہ بڑا بننے کی خواہش ہو۔ نہ پیری کی خواہش ہو۔ نہ فقیر کہلوانا چاہئے۔ نہ کوئی اقتدار کا شوق ہو۔ نہ دولت کی ہوس ہو۔ بس اسکے پاس جو کچھ ہو' انہی کا ہو' انہی کے لئے ہو۔

نہ آوردم از خانہ چیزے نخست
تُو دادی ہماں چیزے تست

تصوف اور سلوک کا ماحصل یہی ہے۔

اللہ جل شانہ' کی عطا تھی اور حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہ کرم کہ بے شمار لوگوں کو انعامات سے نواز گیا' آنے والا کوئی بھی فرد خالی نہ رہا۔ جو نعمتیں لوگوں نے عمریں صرف کر کے حاصل کی تھیں یہاں لمحوں میں لوگوں کو نصیب ہوئیں۔ لوگ کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے علاوہ کوئی شخص معصوم نہیں ہوتا۔ ہر شخص سے غلطی کے صادر ہونے کا امکان رہتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ منور القلوب ہوتے ہیں' ان کے ساتھ شیطان زیادہ محنت کرتا ہے۔ تصوف و سلوک کی غایت یہ ہے کہ انسان کو اپنا کوئی کمال بھی نظر نہ آئے' بلکہ ہر کمال میں ذات باری کی عطا نظر آئے۔ اور اس کا احسان۔ یہیں پر شیطان مداخلت کرتا ہے' اسکا طریقہ واردات بھی بڑا نرالا ہوتا ہے۔ پھر یہ انسان کے دل میں لوگوں کو بڑائی دکھانے کی خواہش پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ وہم ڈال دیتا ہے کہ وہ دوسروں سے برتر ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔

اللہ جل شانہ' کی عطا کسی کے مشورے کی محتاج نہیں ہے۔ بہت آگے نکل جانے والے لوگ بعض لغزشوں کی وجہ سے بہت نیچے گر جاتے ہیں۔ بہت نیچے بیٹھے ہوئے لوگ بعض اوقات ایک نگاہ میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اس راستے میں یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگ زندگی بھر شیخ کو تلاش کرتے رہے اور دنیا سے گزر گئے۔ مقامات کا حاصل کرنا تو دوسری بات ہے کوئی بتانے والا بھی نہ مل سکا۔ لیکن ان کی طلب ایسی صادق تھی کہ وفات کے سالوں بعد اور بعض اوقات صدیوں بعد کوئی ایسی ہستی انکے مزار سے گزری' ملاقات کسی ایسے انسان سے ہوئی کہ جس کے طفیل انہیں برزخ میں بھی منازل بالا بلکہ عالم امر تک کے مقامات نصیب ہوئے' اب یہ رب کی مرضی کون جانے کہ کس کو کس وقت کیا بخش دے۔

حضرت جی فرماتے ہیں۔

سلسلہ عالیہ کی قیادت کی ذمہ داری مجھ پر آئی تو' میں نے اپنی پوری کوشش کی' کہ اسے پورے خلوص اور دیانتداری سے نبھاؤں۔ اللہ کریم کا احسان ہے کہ میں عنداللہ مطمئن ہوں کہ مجھ سے جو ممکن تھا وہ میں نے کیا اور کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں 'انسان کا اپنا ضمیر ہی بہترین جج ہوتا ہے۔ کیونکہ باہر سے دیکھنے والے لوگ کسی کو اس طرح نہیں جان سکتے۔ جس طرح سے وہ خود جان سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ عقیدت میں آکر کارکردگی سے زیادہ نمبر دے جاتے ہیں اور بعض' جن کو عقیدت نہیں ہوتی' وہ ایک دم سے انسان کی کارکردگی کو صفر قرار دے دیتے ہیں۔ ایسے میں ضمیرُ بہترین منصف کا رول ادا کرتا ہے۔ تو الحمد للہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ میرا ضمیر 'مطمئن ہے۔ مجھے اللہ کے فضل سے جماعت کی ترویج' ذکر کی تلقین اور اتباع سنت رسولؐ کے پیغام کو پورے روئے زمین پر پہنچانے کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ ہر طبقہ فکر تک میں نے ذکر الٰہی کو پہنچایا ہے۔ کفار کو دعوت اسلام دی ہے اور ذکر پر لگا کر انہیں مشرف بااسلام کیا ہے۔ پھر علمی اعتبار سے جتنا کام اس صدی میں تصوف پر ہوا ہے' پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ المرشد کی بنیاد حضرتؒ نے رکھی تھی۔ جو اس وقت سے لے کر اب تک باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ اسکے علاوہ دیگر تصانیف' تفسیر اور تبلیغ کے حوالے سے خدائے برتر نے مجھ سے اتنا کام لیا ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سلسلہ عالیہ کی تعلیمات اور مقاصد کو اگر تین درجوں میں تقسیم کروں تو شکل کچھ ایسی بنتی ہے۔

پہلا درجہ: کہ اللہ اللہ کر کے فرد کی ذات کی اصلاح کی جائے۔

دوسرا درجہ: اللہ اللہ کو پھیلایا جائے اور افراد کو جمع کر کے ایک جماعت بنائی جائے۔ جماعت بھی ایسی جو اصلاح یافتہ ہو۔

تیسرا درجہ :جو 90ء میں شروع ہوا کہ اب معاشرے میں اصلاح ہونی چاہئے
یہی سنت نبویؐ ہے کہ حضورؐ نے مکہ میں افراد کو اپنی تربیت پر لگایا کہ وہ "اپنی اصلاح کریں دوسرے جو کچھ بھی کرتے ہیں۔ انہیں کچھ مت کہیں' جو ظلم بھی ہوتا ہے اسکو سہتے رہیں۔ مگر اپنے آپ کو ظلم میں شریک نہ کریں۔ یہ پہلا درجہ تھا۔

مدینہ منورہ میں دوسرے درجے کا آغاز ہوا۔

ریاست بن گئی سسٹم Establish ہو گیا' انسٹی ٹیوشن بن گیا۔

پھر تیسرے درجے میں۔ آپؐ نے فرمایا۔ معاشرے میں جو لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ اسے روکا جائے۔ دین کی تبلیغ کی جائے۔ اور اس کے لئے جہاد کا اعلان کیا جائے۔

تو اب ہماری وہی صورت حال ہے۔ ہم اس وقت اپنے مشن کے اس درجے میں ہیں' جہاں نفاذ اسلام ہماری ضرورت ہی نہیں مجبوری بھی ہے۔

تصوف دراصل تزکیہ نفس کا نام ہے۔ زبان سے مانی ہوئی بات کو دل کی گہرائی سے تسلیم کرنا تصوف ہے۔ عقیدے پر قلبی رغبت کا نام تصوف ہے۔

یہ تصوف کا ابتدائی درجہ ہے۔ اس کے بعد عقیدے کو منوانے کے لئے تبلیغ کرنا اور...... تصوف کا عظیم درجہ یہ ہے کہ ظلم کے خلاف جہاد کیا جائے۔ حضورؐ نے جتنے جہاد کئے ظلم کو مٹانے کے لئے کئے۔ تصوف کے مختلف درجات ہیں کہ کوئی کہاں تک پہنچتا ہے۔ مثلاً ایک صوفی نے لوگوں کو اللہ اللہ کرانا شروع کیا۔ دوسرے نے اسے آگے بڑھایا۔ جس طرح پرائمری' کے بعد ہائی سکول پھر کالج اور یونیورسٹی' اسی طرح ہم نے لوگوں کو درجہ بدرجہ اللہ کے دین کی طرف بلایا۔ لوگوں کو گناہوں کی دلدل سے نکالا' انہیں مسجدوں میں لا کر اللہ کے روبرو کھڑا کیا۔ اب اللہ کریم نے توفیق دی ہے کہ تصوف کے درجہ کمال کے مطابق ظلم کے خلاف کھڑے

ہو جائیں۔ یہ سنت رسول کا حقیقی اتباع ہے۔

سلسلہ تصوف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ' حضرت معین الدین اجمیریؒ شاہ ولی اللہؒ' سید احمد شہید اور مہدی سوڈانی کی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اسے روکنے کے لئے عملی طور پر میدان میں اترے۔ اب اللہ کریم ہمیں اس مرحلے پر لے آئے ہیں۔ ہر آنے والے دن وہ تبدیلی آرہی ہے' جس کی ہم توقع کرتے ہیں۔ پھر واضح کر دوں کہ ہمارا مقصد حکومت چھیننا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد اصلاح احوال ہے۔

یہ ہیں حضرت ملک محمد اکرم اعوان' سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ!

جو کبھی گھر سے نکلے تھے' اک وحشت بھری تلاش لے کر' ڈھونڈتے ڈھانڈتے' انہیں دھوپ کے راستے پر وہ شجر سایہ دار نظر آگیا۔ جس کے سائے میں انہوں نے تلاش کی تھکن اور سفر کی وحشت کو زمین کا بار کیا۔ اور خود بے فکری سے اس ٹھنڈی چھاؤں میں ستانے لگے' جو دھوپ کے راستے میں دیوار بنی کھڑی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ انہیں اس چھاؤں سے محبت ہو گئی۔

کچھ یوں کہ محبت' محبت سے راضی ہو گئی۔

دل نے دل کو پہچان گیا۔

روح نے روح کو جان لیا۔

...... پھر باقی کیا بچا!!!

بزرگ کہتے ہیں' ہر شے انتہا پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر ذکر اور خدمت لا منتہی ہیں۔

اہل خدمت جو ہوتے ہیں ان کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ اپنا ہی ڈھنگ ہوتا ہے وہ اُدھر دیکھتے ہیں نہ اِدھر' بس ان کی نگاہ زمین و آسمان کے ہر اس جز پر ہوتی ہے' جسے

کل کی تلاش ہے۔ وہ ذروں کے سینے میں دھڑکنے والی صادق طلب اور جستجو میں بے قرار پھرنے والی پاگل ہوا سے بھی پورے باخبر ہوتے ہیں۔

وہ تو در حقیقت ایسے مزدور ہوتے ہیں جنہیں مزدوری کے صلے سے ذرا برابر بھی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسلئے کہ ان کی نگاہیں آسمان پر' اور دل زمینوں کے اندر نمو کی طرح دھڑکنے والے کائناتی سچ کی طرف لگا ہوتا ہے۔ جو خدمت 'خدمت اور خدمت' پکار رہا ہوتا ہے۔

یہ اہل خدمت ہی تو در اصل اہل صفا ہیں۔ بزرگ کہتے ہیں۔ جب بندے کو اللہ اپنے کاموں کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں' پھر وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ اور یہ انتخاب بندوں پر الہی انتخاب کی حد ہوتی ہے۔

شب بیداری 'دل بیداری کا ایک باب ہے۔

جہاں سے کھولو' جہاں دیکھو' اندر عطا ہی عطا' سخا ہی سخا۔

شب بیدار کی پیشانی پر تڑپتے ہوئے سجدے 'زمین کا نہیں' عرش عظیم کا زیور ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ خدمت لی جاتی ہے' کی نہیں جاتی۔ یہ تو لینے والے کا کرم کہ اسے منتخب کر لیا۔ چن لیا۔ اتنوں میں سے ایک کو چن لیا۔ اسی لئے اہل خدمت کا شمار چنیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے۔ پھر ان چنیدہ ہستیوں میں کام کی استعداد اور قابلیت بھی ڈال دی جاتی ہے کہ اللہ کی رہنمائی معروف و مستقیم ہوتی ہے۔

اور شاید انہی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مخلوق کا خیر خواہ بندوں سے چنا ہوا ہوتا ہے۔ چنے ہوئے بندے مادر زاد ہوتے ہیں۔

اور فطرت کے مقلد ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی ہے کہ چنے ہوئے کاموں کے لئے منتخب بندے ہی مامور کئے جاتے ہیں۔ یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں اور ان چنے ہوئے بندوں کی عمدہ خصلت یہ ہوتی

ہے کہ جب تک وہ اپنے کام کو جس کے لئے انہیں چنا جاتا ہے۔ نہایت ہی خوش اسلوبی سے پورا نہیں کر لیتے، کبھی آرام نہیں کرتے۔

اہل اللہ کہتے ہیں۔

کام کا نام مقام ہے، جتنا اونچا کام، اتنا اونچا مقام، کرامت کوئی چیز نہیں۔ کام پہ استقامت ہی کا اصطلاحی نام ہے۔ کرامت کے خیال سے بے نیاز ہو کر، کام میں مصروف ہو کر کام کے سوا کسی اور چیز کی خبر نہ رہے۔ یہ بہترین کرامت ہے!!

اس مضمون کی تیاری میں !

۱۔ حضرت جی سے گفتگو اور ان کی یادداشتیں
۲۔ ارشاد السالکین
۳۔ حضرت اللہ یار خانؒ کے مکتوبات
۴۔ قومی ڈائجسٹ
۵۔ روزنامہ پاکستان۔ سنڈے میگزین
۶۔ روزنامہ اساس

حضرت مولانا اللہ یار خانؒ

آپ کی پیدائش ۱۹۰۴ء میں اپنے آبائی گاؤں موضع چکڑالہ ضلع میانوالی میں ہوئی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم چک ۱۰ الی ضلع سرگودھا میں حاصل کی اور دورۂ حدیث مدرسہ امینیہ دہلی ۱۹۳۰ء میں زیر سرپرستی مفتی کفائت اللہ مرحوم مکمل کیا۔ یونانی طب کے مطالعہ سے فارغ ہو کر درس و تدریس شروع فرمایا۔ ۱۹۳۶ء میں آپ نے تصوف کے میدان میں قدم رکھا اور ۲۴ برس کی مسلسل کاوشوں سے اس میں کمال حاصل کیا۔

۱۹۶۲ء میں آپ نے سالکین کی تربیت بسلسلہ نقشبندیہ اویسیہ شروع فرمائی۔ آپ کے تربیت یافتہ آج دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سینکڑوں صاحب کشف و کرامت بھی ہیں اور اس کتاب کی تعلیمات کی منہ بولتی تصویر بھی۔

آپ کی پوری زندگی مذاہب باطلہ کے رد میں گزری۔ آپ چوٹی کے مناظر رہے اور باطل فرقوں کو بے نقاب کرنے میں اپنی تقریر و تحریر کا بے دریغ استعمال

فرمایا۔ عبداللہ چکڑالوی کے باطل مذہب کی بیخ کنی بھی آپ ہی کے حصہ میں آئی۔

اس ضمن میں آپ نے تحذیر المسلمین، عن الکید الکاذبین، الدین الخالص اور ایمان بالقرآن جیسی معرکہ آرا کتب تصنیف فرما کر امت مرحومہ کو کسی مزید تحقیق سے رہتی دنیا تک بے نیاز فرما دیا۔ تصوف کے موضوع پر قلم اٹھایا تو دلائل السلوک۔ حیات برزخیہ۔ حیات انبیاء اور اسرار الحرمین جیسے گوہر ہائے نایاب سالکین کے ہاتھ آئے۔

یہی مشاغل دم آخر تک آپ کی مبارک زندگی کا جزو لاینفک بنے رہے حتیٰ کہ ۱۸۔ فروری ۱۹۸۴ء کو تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں آپ نے اسلام آباد میں دارالفنا کو خیرباد کہا اور ۱۹ فروری ۱۹۸۴ء غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کا یہ بحر بیکراں اپنے جملہ کمالات کے ساتھ ظاہری نظر سے اوجھل ہو کر اپنی آخری آرام گاہ موضع مرشد آباد داخلی چکڑالہ میں موجزن ہوا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

O..........O..........O

بابِ تلاش

تعارف وحالاتِ زندگی

اعوذ باالله من الشيطن الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم.
نحمده و نصلی علے رسوله الكريم و علے آله وصحبه وعلى
من تبعهم اجمعين

تصوف اور صوفیائے کرام کے متعلق عوام بلکہ علماء کے دلوں میں بھی کچھ شبہات پائے جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات وہ حضرات اس قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں کہ طریقت اور شریعت دو الگ چیزیں ہیں یا اسلامی تصوف عجمی سریت اور باطنیت کے مترادف ہے۔ یا یہ کہ تصوف تکلیفات شرعیہ سے آزادی کا نام ہے ان غلط فہمیوں کے ازالہ اور عوام و خواص کی علمی تشفی کی خاطر اللہ رب العزت نے یہ رسالہ تحریر کرنے کی توفیق عنایت فرمائی ہے۔

اگرچہ میری زندگی کا اکثر حصہ متکلمین کے نہج پر اسلام کی حقانیت کے اثبات اور فرقہ باطلہ کی تردید میں گزرا ہے اور کلامی مباحث اور تصوف و سلوک میں بظاہر

تقاضیر اور بُعد نظر آتا ہے، لیکن احقاق حق کے لئے علم کلام سے کام لینے اور تصوف کے ذریعے ایمان و یقین کی کیفیت پیدا کرنے میں فرق صرف دلیل سمعی اور دلیل ذوقی کا ہے۔ مگر بایں ہمہ لوگ یہ سن کر حیران ضرور ہوتے ہیں کہ وہ شخص جسے کل تک ہم ایک مناظر اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے جانتے تھے آج تصوف ذکر' حلقہ ذکر' تزکیہ نفوس اور منازل سلوک پر اظہار خیال ہی نہیں کر رہا بلکہ اپنا باطنی رشتہ صوفیائے کرام سے جوڑ رہا ہے مگر ان کی حیرت پر تعجب ہوتا ہے کہ

اھم یقسمون رَحْمتہ ربک　　　کیا وہی آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں۔

اور اس کا جواب اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ۔

ذلك فضل الله يوتيه من يشاء　　　یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تبلیغ واشاعت دین کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفوس کا کام انبیاء علیہم السلام سے لیا جاتا رہا۔ مگر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آخری امت میں اس کی ذمہ داری علمائے ربانیین پر عائد ہوتی ہے۔ جو ورثۃ الانبیاء ہیں اور ہر الحادی اور لاحادی دور کی تاریکیوں میں روشن چراغ کی مانند ہوتے ہیں موجودہ دور پر فتن میں اس ذمہ داری کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس دور میں اسلام کی زبوں حالی اور مسلمانوں کی دینی پستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا ایمانی اور روحانی تعلق برائے نام ہی رہ گیا ہے ان کی اعتقادی خرابیوں اور عملی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ انہیں اس قعر مذلت

ے نکال کر اور اس خواب غفلت سے جگا کر شریعت مطہرہ کے اتباع تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی طرف توجہ دلاتا ہے تو اسکی آواز پر لبیک کہنے کے بجائے الٹا اپنے آپ کو اوہام و تشکیک کی وادیوں میں دھکیل دیتے ہیں اور :۔

ظلمات بعضہا فوق بعض   تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں

کی صورت پیدا ہوتی جارہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حق کی حفاظت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اس کی رحمت یہ کب گوارا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے۔ چنانچہ ہر دور میں وہ اپنے خاص بندوں کے ذریعے حق کی حمایت اور اصلاح خلق کی خدمت لیتا رہا۔ اور صوفیائے کرام نے جس خلوص اور للّٰہیت سے یہ خدمت انجام دی ہے اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔

صوفیائے کرام کے ہاں تعلیم وارشاد اور تزکیہ واصلاح باطن کا طریقہ القائی اور انعکاسی ہے اور یہ تصوف کا عملی پہلو ہے۔ جس کا انحصار صحبت شیخ پر ہے۔ بقول امام ربانی مجدد الف ثانی' تصوف کا تعلق احوال سے ہے زبان سے بیان کرنے کی چیز نہیں'' مگر جہاں تک تصوف کے عملی پہلو کا تعلق ہے صحیح اسلامی تصوف کے خدو خال کا تعین اور اس کی حقیقت سے علمی حلقوں کو روشناس کرانا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ آجکل جس چیز کو تصوف کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور پیش کیا جاتا ہے اسے تصوف اسلامی سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح اسلامی تصوف کو بھی شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ عامۃ المسلمین کو صحیح اسلامی تصوف سے روشناس کرایا جائے جس کی اساس کتاب وسنت پر

ہے تاکہ اس کی روشنی میں اپنی فکری اور عملی اصلاح کر کے ابدی فلاح حاصل کر سکیں۔

وما توفیقی الا باالله علیه توکلت و الیه انیب.

اللہ یار خان۔ چکڑالہ (ضلع میانوالی)
یکم شعبان ۱۳۸۵ء

O..........O..........O

زندگی کوڈھونڈنے نکلے تھے ہم!

۲۳۔ ربیع الاول ۱۳۹۷ ھجری اور (غالباً) مارچ ۷۷ء کی ۱۳ تاریخ بعد نماز عصر ----یہ چند سطور 'مسجد الحرام' میں بیٹھا لکھ رہا ہوں ہر چند کہ لکھنے کا سلیقہ نہیں پھر بھی لکھ رہا ہوں بے علم و بے عمل 'انتہائی تہی دست' صرف اس علیم وخبیر اور عزیز و حکیم کے بھروسہ پر قلم ہاتھ میں لیا ہے کہ (الذی علم بالقلم) خیال ہے کہ یہ سطور 'بازخوانی' کا کام دیں گی۔

چل مرے خامے بسم اللہ :

سمند خیال زندگی کے اس دور کو جا پہنچا "جب آتش جواں تھا" "دور جوانی چنانکہ افتد دانی نہ فکر فردانہ غم دوراں' دنیا اور اسکی رعنائیاں احباب کی محفلیں' قہقہے اور خوش گپیاں' جوانی' قوت بازو' دنیوی غرور' اور خداتعالیٰ سے لاتعلقی اور محرومی نے مل کر فرعون بنادیا تھا۔

کسے خیال تھا کعبتہ اللہ کی زیارت کا اور کس کے دل میں اس کی عظمت تھی۔ عظمت تھی شرف تھا' کرامت تھی تو عنداللہ تھی میرے سینے میں تو صرف

اور صرف یہ بات تھی کہ اس عالم رنگ وبو کی زینت میں ہی ہوں اور پھر کیا ہوا۔

ارے ہونا کیا تھا ایک مذہبی جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کہاں میں اور کہاں مذہبی جلسہ 'کیوں گیا یہ ایک لمبی داستان ہے صرف اتنا عرض کروں کہ میں نے اپنے رات دن 'اپنی جوانی' اپنی قوت اور اپنی تمام کوششیں اور اپنی صلاحیتیں دنیا کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں لیکن دنیا نے ایسا پلٹا کھایا کہ اپنے بھی دشمن بن گئے ایک ہی جھٹکے میں منہ کے بل گرا۔ تکبر اور غرور کی عمارت متزلزل ہو گئی پستول جو میری اندھیری راتوں کا ساتھی تھا ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ انانیت پر چوٹ پڑی اور ایسی کہ چور ہو گئی 'خود کو ایک دوراہے پر پایا۔ ایک راستہ پھر دنیا میں گم ہو جانے کا تھا ایں خیال کہ اگر ایک مرتبہ دھوکا دیا تو پھر وفا کرے گی اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ اس سے وفا کی امید نہیں 'جس کی خاطر تو نے اپنا سب کچھ قربان کیا 'اور بجز بے وفائی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب کس بھروسے پہ اس سے وفا کا طالب ہے یہ تذبذب دین کی طرف لے گیا اور پھر کیا دیکھا بڑے بڑے درویش نما دنیادار 'جن میں بعض نیک بھی پھنسے ہوئے تھے مگر محض اپنی سادگی کی وجہ سے جانتے وہ بھی کچھ نہ تھے اور کثرت صنف اول کی تھی۔ اللہ اللہ کیا کروں کہاں جاؤں :

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

آج چشم تصور سے اس "یاسیت" کے دور کو دیکھ رہا ہوں جب کئی کئی دن کھانے کو طبیعت ہی نہ چاہتی تھی 'اسی متکبر جسم پر چیتھڑے بھی پہنے 'لباس کی الفت مٹ گئی تھی 'نیند میں مزا نہ رہا 'احباب سے تعلق ٹوٹ گیا اور پھر میں کیا تھا ایک جیتی جاگتی لاش 'ہاں ایک بات ضرور ہوئی۔

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

ہر طرف کی مایوسی نے اللہ کا دروازہ دکھا دیا۔ (امن مجیب المضطر اذا دعاہ د

بئس الموعد) اور میری راتیں اس کے در پر بسر ہونے لگیں ----- ایک امید پر کہ اس کی رحمت بے پایاں ہے ضرور دستگیری فرمائے گا۔ اور یہی ہوا۔ یہی امید مجھے کشاں کشاں جلسوں میں وعظوں میں اور مسجدوں میں لے جاتی :

لیکن مایوس ہی لوٹتا ------!

اور پھر ایک دن رحمت باری جوش میں آئی :

زندگی کو ڈھونڈنے نکلے تھے ہم دفعتاً اک موڑ پر تم مل گئے

موضع پدھراڑ کے ایک جلسہ میں حضرت الاستاذ مولانا اللہ یار خان (مدظلہ العالی) کو دیکھا بس وہی ایک نگاہ سرمایہ حیات ہے :

آپؒ تشریف لائے تو میں ایک آدمی کے پاس کھڑا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی اس نے رکھی ہوئی تھی ساتھ کے گاؤں پدھراڑ کا تھا۔ یہی بندہ لایا تھا حضرتؒ کو۔ اور شیعہ حضرات نے مولوی اسماعیل صاحب کو دعوت دے رکھی تھی۔ مولوی اسماعیل شیعہ کی نظیر نہیں ملتی ہے بلکہ متقدمین سے بہت زیادہ اچھے عالم تھے اور شیعہ حضرات کے پاس شاید پھر اس پائے کا عالم پیدا نہیں ہوا۔ بہت وسیع المطالعہ اور بہت ذہین' عادت یہ تھی کہ جہاں جایا کرتے تھے بہت زوردار انداز میں تنقید کیا کرتے تھے اور عام اہلسنت کے عالم ان کے سامنے نہیں ٹھہرتے تھے۔ بڑا وسیع مطالعہ تھا پھر عربی زبان پہ عبور تھا تو اکثر جہاں مولوی اسماعیل کو بلایا جاتا تھا تو پھر لوگ وہاں حضرتؒ کو دعوت دیتے تھے۔ تو حضرتؒ وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ آپؒ کا پروگرام تھا تین دن کا' پتہ چلا تو ہم بھی گئے۔ وہاں بے شمار لوگوں سے ملاقات رہتی تھی' لیکن میں نے حضرتؒ کو شخصی طور پر بہت مختلف پایا۔ دوسرے لوگوں سے' سادہ لباس' سادہ غذا' سادہ انداز' میں وہاں گیا تو خیال آیا پہلے مولانا سے مل لیا جائے' تو پتہ چلا' وہ آرام فرما رہے ہیں۔

وہ ایسا دور تھا کہ تقریباً ہر جلسہ ہی ایک مناظرانہ رنگ لئے ہوئے ہوتا تھا۔ شیعہ کے پاس ان دنوں بہت سے عالم تھے مولوی بشیر صاحب ٹیکسلا والے تھے مولوی اسماعیل، اور بھی کئی تھے مجھے ان کی فہرست یاد نہیں۔ اہلسنت کے پاس جواب دینے کے لئے دوچار حضرات تھے مولانا دوست محمد قریشی مرحوم حضرت عبدالستار تونسوی سید احمد شاہ بخاری تو یہ چار پانچ حضرات تھے اور یہ ایک رواج بن گیا تھا کہ بڑے جارحانہ انداز میں شیعہ علماء بات کرتے پھر اہلسنت بھی جواب دینا چاہتے اور ایک طرح کا مناظرانہ رنگ ہی ہوتا تھا اور جلسے اکثر ہی ہوتے تھے کامرہ کے علاقے میں بہت ہوئے، کیمبل پور اٹک کے علاقے میں' ہمارے اس علاقے سون میں اس طرح چو آسیدن شاہ کی طرف پھر نیچے دریائے جہلم کے علاقے میں ساتھ ساتھ جھنگ میں ملتان تک تو یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن ہوتا یہ تھا کہ جہاں مولوی اسماعیل پہنچتے وہاں پر لوگ حضرت کو بلاتے تھے۔

اب بعض لوگ کہتے ہیں مناظر صوفی نہیں ہو سکتا' مگر ایسا نہیں ہے دراصل مناظر کی تعریف یہ ہے کہ دلائل سے حق کو ثابت کیا جائے' جب کہ فاسد دلائل سے ایک آدمی لوگوں کی گمراہی کا سبب بن رہا ہے تو واجب ہو جاتا ہے عالم آدمی پر کہ وہ دلائل دے کر لوگوں کو گمراہی میں بھٹکنے سے بچائے حق کو واضح کرے مقابل کو ہرانا رواج ہے لیکن یہ شرعی مناظرہ نہیں ہوتا۔ دین کسی کی فتح اور شکست کا نام نہیں دین حق کا نام ہے اور صوفی جو ہوتا ہے اگر سادہ الفاظ میں ترجمہ کریں تو ہوتا ہے بہتر انسان۔ مسلمان عقیدے کے اعتبار سے عمل کے اعتبار سے اخلاق کے اعتبار سے علم کے اعتبار سے غیر مسلم سے بہر طور بہتر ہوتا ہے اور پھر صوفی بہترین مسلمان ہونے کو کہتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی جو بہت اچھا ہو وہ صوفی کہلاتا ہے کہ یہ جو شرعی مناظر ہیں خواہ عبادات کے باب میں ہوں تبلیغ کے باب میں ہوں جہاد کے

باب میں ہوں صوفی زیادہ محسوس کرتا ہے اس پر زیادہ محنت اور مجاہدہ کرتا ہے اور اس پر زیادہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

استدلال دونوں طرح سے ہر موقع پر دینا پڑتا ہے۔ علمی دلائل بھی اور عقلی بھی۔ قرآن حکیم کا انداز بھی یہی ہے۔ آپ جہاں دیکھیں دلائل عقلیہ کو بھی قرآن حکیم نے کبھی فراموش نہیں کیا سورج چاند تاروں کی روش ان کی تپش روئیدگی مخلوق کا پیدا ہونا ان کو دلیل بنانا یہ سارے عقلی دلائل ہیں اور علمی دلائل قرآن کے گذشتہ قوموں کے کردار پر بحث اسکے نتائج پر بحث لوگوں کے اعمال اور عقائد پر بحث یہ ساری علمی باتیں ہیں یہ سارے علمی اور عقلی دلائل مل کر کسی بندے کو متاثر کر سکتے ہیں۔؟ آپ علمی دلائل دے دیں وہ logically بندے کے ذہن میں نہ آئے تو وہ چپ ہو سکتا ہے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ آپ عقلی دلیل دے دیں لیکن علمی طور پر وہ ثابت نہ ہو سکے تو آپ بندے کو چپ کرا دیں گے مطمئن نہیں۔ مطمئن کرنے کے لئے آپ کو علمی دلیل بھی دینی پڑے گی اور اس انداز میں دینی پڑے گی کہ اس میں logic بھی ہو اور عقل سلیم بھی اسے تسلیم کرے۔

حضرت ؒ کو برصغیر میں جس قدر مذاہب باطلہ تھے تقریباً سب پر عبور حاصل تھا۔ سب کی کتابیں زیر نظر رہتیں سب کے عقائد پر عبور تھا۔ ہندوؤں کے، بدھ مت کے، سکھوں کے، برصغیر کے، مسلمانوں کے جو نئے نئے فرقے بنے' یہود و نصاریٰ کے ان کی کتابیں حضرت جی کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ آپ کا انداز عموماً یہ ہوتا تھا۔ زیادہ مناظرے اس زمانے میں شیعہ سے ہوتے تھے ملک تقسیم ہو چکا تھا تو ہندو سکھ کی بات ختم ہو چکی تھی۔ تو آپ پہلے مقابل کی کتابوں سے دلیل دیتے کہ تمہارے فلاں عالم نے تمہارے فلاں محقق نے تمہارے فلاں مفسر نے فلاں کتاب میں یہ بات کی اور پھر مصنف کا سن پیدائش سن وفات اسکی ساری تصانیف کی فہرست

جس کتاب کا حوالہ دے رہے ہیں اسکا صفحہ نمبر اور سطر ازبر رہتا تھا حضرتؒ کو، مجھے یاد ہے ایک مولانا گنتے رہے انہوں نے ایک گھنٹے کی مجلس میں ۷۰ مصنفین اور ان کی کتابوں کے حوالے دیئے اور سب زبانی دیئے ان کا سن پیدائش سن وفات ان کی باقی تصنیفات او رجو بات آپؒ کہہ رہے ہیں وہ کون سے صفحے پر کون سے Chapter میں اور آپؒ کے دلائل کا انداز جو ہوتا تھا وہ بہت مضبوط بہت Solid اور ایک حد تک بڑا جارحانہ ہوتا تھا لاجواب کر دیتا تھا۔

حضرت کے سامنے جو ہم نے مجاہدات کئے ان کا حال بڑا ہی مختلف تھا۔ تصوف میں دراصل بہت سارا دارومدار شیخ کے مزاج پر ہوتا ہے، حضرتؒ کا مزاج بہت انتاپسندانہ تھا یعنی آپ جس کام کو بھی کرنا چاہتے اسکو اس حد تک کرتے کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس اعتبار سے حضرت خود بھی بہت سخت مجاہدے کرتے تھے۔ مطالعہ بھی کرتے تھے بہت کم سوتے تھے غذا بھی بہت کم ہوتی تھی اور ہم جب آئے تو چار پانچ غیر معروف قسم کے ساتھی ذکر کرتے تھے۔ جن میں سے ایک آدھ ابھی ہیں باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے اور مجاہدے کا یہ عالم ہوتا تھا کہ شاید ہمارا کوئی لمحہ بھی مجاہدے کے سوا نہیں ہوتا تھا۔ لباس میں کھانے میں سونے میں آنے جانے میں فجر تک کے لطائف میں ساری ساری رات لگ جاتی۔ اس وقت سفید سفید گھڑیاں ہوتی تھیں Radium لگا ہوتا تھا۔ اس زمانے کی گھڑیاں تھیں تو ہم نے منٹوں کی سوئیاں نکال دی تھیں کہ منٹوں کو کون گنے تو دوسری عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں کشف کرامات یا مشاہدات سے شغف نہیں ہوتا تھا بلکہ ہمارا خیال تھا اپنی سوچ اور عملی زندگی میں کیا اثر پڑ رہا ہے اس کے کیا نتائج نکل رہے ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں یہ ہوتا تھا، اور ساتھ ساتھ کشف بھی ہوتا تھا لیکن اس کی ہمارے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ کشف ہو گیا یا نہ ہو گیا اس کی ہم پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر ایک

عجیب بات ہے جو میں نہیں سمجھتا کہ اب ساتھیوں کو کیوں محسوس نہیں ہوتی۔
میں اگلے دن بھی یہ تجزیہ کر رہا تھا اپنے آپ میں بیٹھا ہوا کہ کیوں لوگ مکہ مکرمہ میں اتنے تبدیل ہو گئے وہ لوگ بت پرست تھے شرابی معاشرے کے لوگ تھے قاتل تھے فاسق و فاجر لوگ تھے۔ لیکن وہ ایک دم اتنے بدل گئے پورے کفر کے لئے شعلۂ جوالہ بن گئے۔ ناقابل تسخیر ہو گئے ہم پوری محنت کرتے ہیں زور لگاتے ہیں تقریریں جلسے شور شرابہ لوگ بدلتے نہیں' اگر بدلتے بھی ہیں تو بہت تھوڑا۔ گناہ کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی جرات نہیں رہتی، اگر گناہ سے باز بھی آجائیں۔ تو میں محسوس کرتا ہوں یہ کمی ہم میں ہے مذہبی رہنماؤں میں ہے جو لیڈر بنے ہوئے ہیں، اور وہ کمال نبیؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں تھا لوگوں کا نہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم توجہ فرماتے تو وہ سو فیصد بلکہ ایک سو دس فیصد بدل گئے اور ہم سارا زور لگاتے ہیں تو ہم دس فیصد بھی نہیں بدلتے۔ میرا اپنا ذاتی تجزیہ ہے۔ تو حضرتؒ کے پاس ٹھہرتے ایک ذکر نصیب ہوتا' دو تین نصیب ہوتے تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی خالی ٹینک میں پٹرول بھر دیا گیا ہو یا کوئی خالی بیٹری چارج کر دی گئی ہو اور پھر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزر جاتا تو ہمیں محسوس ہوتا کہ ابھی اثر باقی ہے۔ پھر ایک لمحہ آتا کہ ہمیں محسوس ہوتا کہ ملنے کے لئے جانا چاہئے۔ جس طرح کھانے کے لئے بھوک لگتی ہے پانی کی پیاس لگتی ہے اسی طرح شیخ کو ملنے کی پیاس پیدا ہو جاتی تھی وہ کیفیت گھٹتی تھی تو پھر ایک ایسی کیفیت جسے آپ دیوانگی کہہ لیں کوئی دورہ کہہ لیں اسے کوئی نام دے لیں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ بندہ کہتا کہ جناب جس طرح پیاسا جب تک پانی نہ پی لے' جب تک ملاقات نہ ہو جائے بات نہیں بنتی تھی تو پھر جب ہم ملتے تو تسلی ہو جاتی۔ ملاقات ہو جاتی تو اطمینان ہو جاتا بیٹری چارج ہو جاتی۔ سکون مل جاتا۔

جماعت کی جو بنیاد بنی عام ساتھیوں کو لینے کی۔ مجھ سے بھی بہت بعد میں بنی۔ اور اس میں حضرتؒ نے اعلان بھی فرمایا تھا۔ اس میں آپ Selected لوگوں کو یا دو تین لوگوں کو لیتے تھے۔ پھر بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد ہوا کہ چونکہ گمراہی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے آپ اس نعمت کو عام کریں چونکہ یاد الٰہی ذکر اذکار تو گمراہی کو روکنے کا ایک آلہ ہے تو جتنی گمراہی بڑھ رہی ہے اسے بھی عام کیا جائے تو حضرتؒ نے بنیاد رکھی جماعت کی تو پھر بہت سے لوگ آئے ان میں سادہ بھی تھے ان پڑھ بھی تھے غریب بھی تھے فقیر بھی تھے لیکن ہم سب کو اپنا ہم سبق او رطالب سمجھتے تھے ہمارے ساتھ ایک بابا دوست محمد ہوتے تھے فقیر سے غریب سے آدمی تھے پھر ان کو مشاہدات ہو گئے فنا بقا تک ان کے اسباق چلے گئے۔ تو میں نے حضرت سے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو جتنے دن ہم آپ سے جدا رہتے ہیں اتنے دن یہ ہمیں ذکر کراتے رہیں تو آپ نے فرمایا یہ تو سادہ سے آدمی ہیں اور تمہارے ہم سبق بھی، تو ذکر کرانے کے لئے جو بندہ ہوتا ہے وہ شیخ کا نمائندہ ہوتا ہے تو اس کا بھی ادب شیخ کی طرح کرنا پڑتا ہے تو تم شاید اس کا ادب نہ کر سکو۔ میں نے کہا ایسی تو کوئی بات نہیں جب اللہ نے اسے نوازا ہے تو ہم اس سے استفادہ کریں گے۔ تو پھر وہ رہے ہم نے ان سے بھی سیکھا انہوں نے بھی ہمیں محنت کرائی تو کسی کو کشف کی وہ اہمیت نہیں ہوتی تھی جتنی عملی زندگی یا اس کے اسباق کی ہوتی تھی۔

بات یہ ہے کہ حقیقتاً یا واقعتاً پیری مریدی کیا چیز ہے۔ ہمارے ہاں اس کا کوئی تصور نہیں رہا تھا۔ سارا کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا اور بات ہی یہ تھی کہ پیر صاحبان کوئی جنات مسخر کرتا۔ کوئی بندے مسخر کرتا وظیفے کرتے لوگ شیرینیاں دیتے۔ بس اسی کو پیری مریدی کہا جاتا تھا۔ میں بنیادی طور پر دوسرے Way of life کا بندہ تھا۔ عملی زندگی کا آدمی تھا۔ جب پیروں کے قریب گئے تو تجربہ یہ ہوا کہ کوئی پیر اس

پہ لگا ہوا ہے کہ کشتہ بناؤ تو سونا بن جاتا ہے۔ تانبے سے بن جاتا ہے۔ چاندی سے بن جاتا ہے۔ کوئی جنات کو مسخر کرنے پر لگا ہوا ہے کوئی دوسرا ابدوں کی تسخیر پر لگا ہوا ہے کوئی وظیفوں پہ لگا ہوا ہے تو میں نے دو چار دفعہ یہ مشکل وظیفے جنات کے پڑھے اور وہ بھی میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ہے کیا لیکن اللہ کی شان ہے کہ نہ میرے پاس کوئی جن آیا نہ کسی نے مجھے پریشان کیا نہ کوئی تجربہ ہوا۔ دراصل مجھے ان چیزوں سے بنیادی طور پر ہی نفرت ہوگئی تھی کہ اگر دین بھی حصول دنیا ہی کا ذریعہ ہے تو پھر ہم دنیا مختلف ذرائع سے لے لیتے ہیں تو پھر اس میں وظیفے پڑھنے کی یا چلے کاٹنے کی کوئی تک نہیں یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو کسی دوسرے طریقے سے پیسہ نہیں کما سکتے تو وہ پھر چلہ کاٹ لیں یا ایسا ہی کچھ کر لیں تو مجھے یہ چیز پسند نہ آئی۔ اس کے بعد جب اس مرد قلندر نے مجھ شکستہ دل کو سہارا دیا' ساتھ رکھا' بنایا سنوارا پتہ نہیں کیا رنگ چڑھایا اب حیران ہوں کہ لوگ مجھ روسیاہ کی زیارت کرنے آتے ہیں۔ شاید جمال ہمنشیں کا کرشمہ ہے :

دگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اور آج اسی شمس فلک ولایت کے صدقے مسجد الحرام میں بیٹھا یہ تاثرات قلمبند کر رہا ہوں ورنہ :

کہاں میں اور کہاں یہ رحمت خاص
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

قبل ازیں ۷۴۔۳ ۱۹۷ء میں حضرت کے خادموں میں حج بیت اللہ نصیب ہوا اور آج پھر انہی کے صدقے عمرہ کی سعادت!

(یہ پس منظر کی ایک جھلک تھی)

O..........O..........O

سرور سوز مشتاقی

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

سحر کا پرنور وقت اور عرب کی مقدس سرزمین، فضا بوئے محبوب سے مہک رہی تھی کہ طیارے کے پہیوں نے زمین کو چھوا۔ نماز فجر جدہ ایئرپورٹ پر ادا کی حضرت استاذنا المکرم کے اکثر خدام جدہ میں ہیں جناب کرنل مطلوب گئے اور عزیزی زاہد امین کو تلاش کرلائے ناشتہ سے فراغت کے بعد گاڑیاں لیں اور مکہ مکرمہ کا رخ کیا۔ شاید دل نے بھی اپنا قبلہ راست کرلیا،

(انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض الخ)

حدائق حدیبیہ

جدہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے جہاں حرم شریف کی حد آتی ہے وہاں سڑک کے دونوں جانب سفید مینار نشاندہی کرتے ہیں گرداگرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور درمیان میں ایک چھوٹا سا صحرا نما میدان ہے ننھی ننھی جھاڑیوں نے یہاں وہاں جھنڈے بنا رکھے ہیں اسے حدائق الحدیبیہ کہتے ہیں۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو مع چودہ صد ۱۴۰۰ جاں نثاروں کے روک دیا گیا تھا، چشم فلک نے دیکھا کہ بیت اللہ کا طواف مشرک' یہودی' اور عیسائی تک تو کر سکتے ہیں مگر اجازت نہیں تو اس ہستی کے لئے جس کے کرم سے جہاں میں رنگ و بو ہے۔۔۔۔۔۔اگر رکاوٹ ہے تو ابوبکر صدیقؓ اور فاروق اعظمؓ کے لئے عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ کے لئے۔۔۔۔اللہ! تیری شان انسانی سمجھ سے بعید ہے اور تیری عظمت نارسا کی رسائی سے بالاتر!

دیکھ اے چشم تصور!

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک خاردار درخت کے نیچے جاں نثاروں کے جھرمٹ میں تشریف فرما ہیں۔اہل مکہ سے سفارت چل رہی ہے لیکن وقتی اقتدار نے صنادید قریش سے بینائی چھین لی ہے۔گروہی اور نسبی عصبیت نے اندھا کر رکھا ہے۔۔

دیکھتے ہیں مگر سوجھتا نہیں' ینظرون الیك و هم لا یبصرون۔کس قدر عظیم ہے فرمان باری۔آج بھی وہی لوگ اندھے پن کا شکار ہیں جنہیں اقتدار نے

اندھا کر رکھا ہے' اس اندھے پن کا شکار باوجود اندھا ہونے کے نہ کسی سے راستہ پوچھتا ہے اور نہ کسی کے بتانے سے راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں میں سفر عمرہ کی چند یادیں دہراؤں گا۔ ان میں ایک نہ بھولنے والی یاد' دہرانے پر' رب کریم اور اس مہربان ہستی کے لئے بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے جو اس سعادت کا باعث تھی۔
میں بیت اللہ شریف کے سامنے کھڑا ہوں دروازہ مبارک کھلا۔ سخت مزاج سپاہی مستعد کھڑے ہیں کہ کوئی اندر جانے نہ پائے مگر لوگ ہیں کہ اسطرح ٹوٹ کر گر جاتے ہیں کہ ان سے روکے نہیں رکتے' مار کھاتے دھکے برداشت کرتے اور سپاہیوں کی سخت کلامی برداشت کرتے ہوئے اندر چلے ہی جاتے ہیں مگر سب نہیں صرف وہ جو کچھ ہمت رکھتے ہیں یہ حالات دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ جھگڑا کر کے صرف اندر تو جایا جا سکتا ہے مگر ادب کعبہ کہاں اور احترام بیت اللہ کدھر، دراصل عبادت کی جگہ رسومات نے لے لی ہے اور یہی اس امت کی سب سے بڑی بے نصیبی ہے لیکن حمد اللہ اس سب ہنگامہ ہاؤ ہو میں جس قدر احباب اندر جانے کی سعادت سے سرفراز ہوئے انہیں جھگڑا کرنے کی نوبت نہیں آئی، شاید یہ اس حکم کا اثر ہے جو حضور اکرم ﷺ نے حاضری کے لئے صادر فرمایا۔ دنیا عالم اسباب ہے اور سنت اللہ یہی ہے کرتا تو خود ہے مگر چشم ظاہر بین کے لئے سبب کو آڑ بنا دیتا ہے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا تو فرمایا یہ اظہار قدرت تھا، مگر ترک سبب نہ فرمایا جبرئیل علیہ السلام کی پھونک کو سبب بنا دیا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کو مصر بھیجا مگر قافلہ والوں کو سبب ظاہری بنا دیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کلام کے لئے بلایا گیا مگر طلب نار کو سبب ظاہری بنا دیا۔ غرض ہر کام کی تکمیل کے لئے اس' عالم اسباب میں کبھی سبب کو ترک نہ فرمایا۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔
کچھ احباب کرام تو پہلے حاضر ہوئے آج یہاں قیام کا آخری دن تھا تو مجھ روسیاہ

کی باری بھی آگئی دروازہ کھلا تھا سپاہی اندر سمیں جانے دے رہے تھے اور میں کھڑا حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا' جو اندر جاتا بھی تھا لوٹتا بھڑ تا دھکے دیتا اور دھکے کھاتا، مگر یہ ادب کے خلاف تھا۔ اچانک مسبب الاسباب نے سبب اندر جانے کا پیدا فرمایا ایک بہت بڑا لوہے کا جنگلا اٹھائے ہوئے مزدور آئے تو میں بھی دیوانہ واران میں شامل ہو گیا، دراقدس سے اونچا کر کے اندر والوں کو پکڑایا کیونکہ بیت اللہ شریف کا دروازہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ کے قریب اونچا ہو گا اب حال یہ ہے کہ جنگلا دروازے کے اندر سے لوگوں نے پکڑ رکھا ہے اور میں باہر ایک لکڑی کے جنگلے پر کھڑا حسرت سے دیکھ رہا ہوں کہ نیچے سے سپاہی کہتے ہیں کہ بس اب اتر آؤ واپس آجاؤ' اسی کشمکش میں تھا کہ جنگلا اس قدر اونچا الجھا ہوا تھا کہ کوئی بھی وہاں تک دسترس نہ رکھتا تھا' الحمد اللہ درازی قامت بھی کام دے ہی گئی اور میں پنجوں کے بل کھڑا ہو کے اسے چھڑانے لگا وہ تو گویا اس بات کا منتظر تھا، جنگلا بھی بآسانی اندر پہنچ گیا اور یہ روسیاہ بھی' اس دوران بیگ صاحب بھی اندر چلے گئے۔

''اندرون'' کو چشم حسرت دیکھا کئی مناظر نگاہوں میں گھوم گئے کوئی وقت تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چابی مانگی تو نہ دی گئی اور پھر وہ منظر آنکھوں کے سامنے آیا کہ حضورؐ اس دروازے میں کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں: لاتثریب علیکم الیوم ''اندرون بیت بھی باہر کی مانند سنگ مرمر کی طرح کے سفید پتھر سے مزین ہے اور تمام دیواریں بھی کاش سب کچھ بدل دیتے مگر اندر کو' چھوڑ دیتے کہ ان ذرات کی زیارت ہو جاتی جنہوں نے قدوم اقدس کو بوسے دیئے تھے مگر شاید تمام آثار اس دور کے مادہ پرست انسان سے پردہ کرتے جا رہے ہیں۔ اندر تین ستون ہیں درمیانی ستون کے ساتھ دوگانہ ادا کیا پھر ہر چہار طرف کے ستونوں میں دوگانے ادا کئے اور درمیانی ستون سے لپٹ گیا۔ حضرتؒ فرماتے تھے' اس میں عجیب اثرات

ہیں۔ شاید کبھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹا ہو۔ دیکھا تو تقریباً چار فٹ تک ستون بھی لکڑی کے تختوں میں لپٹا ہوا ہے........ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر قلب کو ستون سے لگایا' شاید اللہ کریم اسی سبب دل کی سیاہی دور فرمادے۔ مسبب الاسباب نے ایک اور سبب پیدا فرمایا' شاید باہر لوگوں کا رش ہوا' سپاہیوں نے دروازہ بند کر دیا اور مجھ نالائق کو مراقبہ کا وقت میسر آگیا۔

اب یہاں حضرت جی کا تعارف حیثیت ایک صوفی کے کرا دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس لئے کسی حد تک مقامات تصوف و سلوک بیان کرنا ہوں گے۔ تو اس راہ میں ابتدا لطائف فنا و بقا ہے۔ مراقبات فنافی اللہ اور بقاباللہ والا اس قابل ہو جاتا ہے کہ راہ سلوک پر قدم رکھے۔ آگے کی پہلی منزل سالک المجذوبی ہے، جس کی سات منازل ہیں اور ان سات میں تقریباً سوا لاکھ نورانی حجابات ہیں جو سالک کو طے کرنے پڑتے ہیں اور پھر دریائے رحمت عبور کر کے پہلے عرش کی منازل میں داخل ہو جاتا ہے پہلے عرش کے اندر تقریباً سوا لاکھ منازل ہیں اور یہ شمار حتمی نہیں ہے۔ بلکہ ہم نے اندازہ اسی طرح لگایا تھا کہ حضرتؒ جی نے فرمایا۔ میں نے ایک سال پہلے عرش کی منازل شمار کیں تو اول سے لے کر سولہ ہزار تک طے کر سکا۔ پھر تین سال اور لگے تب جا کر عرش طے ہوا۔ یاد رہے کہ جوں جوں روح آگے بڑھتی ہے اس کی قوت اور رفتار بڑھتی چلی جاتی ہے کوئی صاحب حساب کے قاعدوں میں نہ پھنسیں بلکہ مجھ بے نوا پر ہی بھروسہ کریں کہ میں نے حضرتؒ جی کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف چیزوں کا جائزہ لے کر حساب جوڑا تھا تو اندازاً سوا لاکھ شمار ہوا تھا۔ ان منازل کے درمیان فاصلہ اس قدر ہے کہ ہر نیچے والی منزل سے اوپر والی منزل اس قدر بلند ہے کہ اگر نگاہ کی جائے تو یوں لگتا ہے جیسے زمین پر سے کوئی اتنا دور ستارہ جو معمولی ٹمٹماتا ہوا نظر آتا ہے۔ اب پورے عرش کی اندرونی وسعت کا خیال خود کر لیں کہ

سند عقل یہاں تھک کر گر تا ہے۔

عرش کی تعداد نو ۹ ہے

آنکہ آمد نہ فلک معراج او　　انبیاء واولیاء محتاج او

پہلے اور دوسرے عرش کے درمیان کا فاصلہ عرش اول کی موٹائی سے زیادہ ہے پھر دوسرے عرش کی موٹائی اس فاصلے اور خلاء سے زیادہ علیٰ ہذا ہر عرش کے بعد خلا بھی ہے اور اسی نسبت سے خلاء اور عرش کی موٹائی بڑھتی بھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ نویں عرش کی انتہا عالم امر کی ابتداء ہے جسے عالم حیرت بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہاں سے وہ دائرے شروع ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک ایک کی وسعت میں جہان گم ہو سکتا ہے۔اور ہو تا رہا ہے، اول تو بے شمار طالبوں کے نزدیک فنا بقاہی انتہائے سلوک ہے، لیکن بعض خوش نصیب جو اس سے آگے چلے سالک المجذوب بمشکل بن پائے۔ پھر عرش کی وسعتوں میں خلق خدا سر گرداں رہی۔ ان میں بر صغیر کے بھی ایسے نامور حضرات شامل ہیں جن کا نام اس غرض سے نہیں گنا سکتا کہ نااہل یہ کہیں گے کہ یہ اپنے آپ کو ان سے اعلیٰ شمار کر تا ہے۔ حالانکہ یہ ہر گز مقصد نہیں۔ میں اپنے کو ان کی خاک پا جانتا ہوں۔ پھر وہ اپنی منزل کو پاگئے اور ہم عالم ابتلاء کے گرداب میں ہیں۔ اللہ ہمیں بعافیت ان کے پاس پہنچائے۔ آمین!

ان دائروں کی تعداد ۳۶ ہے اور ان کی وسعت بے کراں پہلا دائرہ مقام تقرب ہے، جس کی پہنائیوں کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ نو عرش اور دنیا و مافیہا اسکے مقابلہ میں اس طرح ہیں جیسے کسی صحرا میں ایک مندری۔ اس دائرے میں علی ہجویریؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات ہوئی۔ یہاں سے آگے کے بعض دوائر کی بات حضرت مجدد صاحب نے ارشاد فرمائی ہے مگر وہ سیر نظری ہے جہاں

تک ان کی نگاہ نے کام کیا۔ بہر حال چوتھا دائرہ مقام تسلیم ہے۔ جہاں مقامات ولایت اولیاء کی انتہا ہے۔ اس دائرے میں ایک ایسی ہستی ملتی ہے جو بھیرہ میں دفن ہیں اپنے زمانے کے غوث تھے ظلماً شہید کئے گئے۔ اب ان کے اوپر آبادی ہے اور مکان بنے ہوئے ہیں۔ یہ بے نوا ایک بار کسی کام سے بھیرہ گیا، تو ملاقات اور حاضری نصیب ہوئی۔ فرماتے تھے کہ ان مکانوں کے رہنے والے اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ان کی عورتیں بدکار ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت نشاندہی ہو جائے تو ممکن ہے کہ لوگ جگہ خالی کر دیں تو فرمایا میں ہر صاحب کشف کو بھی اپنی جگہ دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا کہ اگر نشاندہی ہو گئی تو دنیا بھر کے بدکار یہاں جمع ہوں گے۔ اس سے یہ چند بہتر ہیں۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اس سے آگے ولایت انبیاء شروع ہوتی ہیں۔ جو نبی کو وہبی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ اور قبل نبوت بھی حاصل ہوتی ہے جس میں امتی صرف اتباع پیغمبر کی وجہ سے باریاب ہوتا ہے۔ ورنہ یہ منازل امتی کے لئے نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے شاہی محل میں بادشاہ کے ساتھ خدام بھی رہتے ہیں۔

یہاں سے چھ دائرے عبور کرنے کے بعد ساتواں دائرہ مقام رضا ہے جس کے آخر میں ایک ایسی ہستی ہے جو سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خلیفہ اول تھے اور یہاں سے آگے پانچواں دائرہ حقیقت رسالت کا ہے۔ جس کی ابتداء میں حضرت سید نذیر علی شاہ صاحبؒ (ان کا مدفن کشمیر میں ہے۔ اور غیر معروف ہے) کی وفات ہوئی اور اس دائرہ کی انتہا میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ عالم بقاء کو سدھارے۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

اور بے شمار ہستیاں ہوں گی۔ امت محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اس گزرگاہ میں نقش کف پائے حبیب ﷺ پہ بوسے دیتے چودہ صد سال بیت چکے ہیں۔ میں نے صرف ایک دو نام تبرکاً گنوانے کی جسارت کی ہے۔

آگے چھٹا دائرہ مقام افراد ہے۔ جس میں اکثر صحابہ کرامؓ علیہم اجمعین ملتے ہیں۔ یہاں ایک بات یاد رہے کہ یہ بہت نازک مقام ہے۔ حضرت مجددؒ نے جب بات کی تو ان پر فتویٰ لگا تھا کہ یہ اپنے آپ کو صدیق اکبرؓ سے افضل جانتا ہے لیکن یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جب نبی ان مقامات سے گزرتا ہے تو حیثیت نبی کے گزرتا ہے صحابی گزرتا ہے تو حیثیت صحابی کے گزرتا ہے اور ولی گزرتا ہے تو ان کا کفش بردار ہو کر۔ ورنہ قرون ثلٰثہ مشہود لہا بالخیر کا مرتبہ شان ولایت کی رسائی سے بالاتر ہے۔ رہی بات فتوؤں کی تو وہ لوگوں کا مزاج بن چکا ہے۔ جب معاملہ عنداللہ درست ہو تو فکر کی بات نہیں۔ ممکن ہے فتویٰ لگانے والے بھی خلوص سے کام لے رہے ہوں مگر حالات کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے معذور ہوں۔ اللہ کریم ہم سب کو ہدایت پر رکھے۔ آمین!

اس کا اگلا دائرہ قطب وحدت کا ہے اور اسکے بارے میں مناسب ہوگا کہ میں حضرتؒ جی کے مبارک الفاظ نقل کر دوں۔

"یہ وسیع دائرہ ہے۔ ڈیڑھ سال بندہ اسمیں سرگرداں رہا"۔

اس مبارک روح کی قوت پرواز اور رفتار کا اندازہ کر کے اس دائرے کی وسعت کا خیال کیا جائے تو بات حسب وشمار کی حدود کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

اگلا مقام دائرہ صدیقیت ہے اور پھر قرب نبوت، قرب رسالت، قرب اولو العزمی قرب محمدی، وصال محمدی، رضائے الٰہی، قرب الٰہی، وصال الٰہی، قرب رحمت بحر رحمت، خزانہ رحمت اور منبع رحمت یہ بارہ دائرے ہیں جن کی وسعتیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

یہاں حضرتؒ جی فرمایا کرتے تھے کہ تقریباً ایک چوتھائی سلوک یہاں طے ہو جاتا ہے۔ میری ناقص رائے میں جو اصحاب یہ لکھ دیتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے

سلوک مکمل طے کر لیا۔ شاید وہ کچھ اندازہ کر سکیں۔

اس سے آگے حجابات الوہیت ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ یہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ حضرتؒ جی نے فرمایا تھا کہ "یہ بدکار سوم حجاب میں ہے"۔

میں نے یہاں بھی حضرتؒ جی کے الفاظ نقل کرنے کی جرأت کی ہے۔ حجابات الوہیت ختم ہو کر قرب الٰہی شروع ہوتا ہے۔ وہاں مقامات و منازل کی تعیین نہیں ہو پاتی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ حضرت کا وصال ۱۸ فروری ۱۹۸۴ء کو ہوا۔ یعنی سترہ سال چار ماہ اور نو روز بعد ان ساڑے سترہ برسوں میں اس مسافر کو رب ذوالجلال نے جس قدر بلندی منازل طے کرائی یہ بات وہ خود ہی جانتا ہے۔

اب اس کا دوسرا پہلو مناصب کا ہے۔ اقطاب غوث وغیرہ اور یاد رہے کہ غوث روئے زمین پر ایک وقت میں ایک ہوتا ہے گاہے ترقی پا کر قیوم بنتا ہے اور پھر فرد۔ اگر اس سے ترقی نصیب ہو تو پھر قطب وحدت اور قطب وحدت اگر ترقی کرے تو صدیق بنتا ہے۔

خدا کے لئے ان الفاظ کو خار زار لغت میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ یہ اسماء ہیں مراتب ولایت کے اور مناصب اولیاء اللہ کے نام ہیں۔

پھر میں عرض کر دوں کہ نبی کے مناصب و منازل بحیثیت نبی' صحابی کے بحیثیت صحابی اور ولی کے بحیثیت ولی ہوتے ہیں۔

منصب صدیقیت کی آخر ایک اور صرف ایک مقام ہے یا منصب ہے۔ جسے قرب عبدیت کہتے ہیں اور وہ حضرتؒ (جی اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں برسائے) کو نصیب تھا۔ والحمد للہ علی ذالک۔

یہ جملہ امور دلائل ذوقیہ سے متعلق ہیں اور صرف صاحب ذوق و احوال حضرات ہی جان سکتے ہیں یا پھر اعتماد ہو بیان کرنے والے پر۔ مگر ایک دلیل ایسی بھی

پیش کرنا چاہوں گا جسے ہر صاحب عقل بھی سمجھ سکے اور وہ یہ کہ برکات نبویؐ میں ایک کمال یہ تھا کہ ہر آنے والا صحابیؓ بن جاتا تھا۔ مرد' عورت' بچہ' بوڑھا' عالم' جاہل' شہری یا بدوی گورا ہو یا کالا۔ ہر آنے والا ایک نگاہ میں درجہ صحابیت حاصل کر لیتا تھا۔ پھر خود صحابہ کرامؓ کے اندر جو مدارج ہیں وہ علیحدہ بات ہے۔ صحابہؓ میں بھی یہ کمال منعکس اور منتقل ہوا کہ ان کی صحبت اور زیارت سے مشرف ہونیوالا تابعی بن جاتا تھا۔ تابعین کو بھی یہ کمال حاصل ہوا کہ ان کی نگاہ شفقت تبع تابعی بنا دیتی ہے۔ خیر القرون کے بعد امت مرحومہ میں بیشمار جلیل القدر ہستیاں آئیں اور اللہ نے ہر دور اور ہر ملک میں بہت اعلیٰ مدارج کے حامل اولیاء اللہ پیدا فرمائے۔ لیکن ساری تاریخ میں کوئی ایسی ہستی نہیں مل سکتی جس کے پاس حاضر ہونے والے تمام آدمیوں کے دل منور ہو جائیں۔ لطائف روشن ہو جائیں اور ولایت خاصہ سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے۔ بلکہ بے شمار افراد آئے جن میں سے مخصوص چند حضرات ایسے خوش نصیب ہوئے جو سینہ روشن لے کر جاتے۔ باقی سب لوگ ظاہراً بیعت اور تعلیمات ہی تک رسائی پاتے اور بس۔

یہ حقیقت کسی ایک یا دو یا چند حضرات کے بارے میں عرض نہیں کر رہا۔ بلکہ چودہ صدیوں پہ پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور جب اس کے ساتھ نگاہ قلزم فیض' بحر العلوم' حامل قرب عبدیت حضرت استاذی المکرم و محترم کی جانب اٹھتی ہے تو وہی بہار رلتی نظر آتی ہے یعنی خدمت میں آنے والے ہر آدمی کا سینہ منور ہو جاتا ہے۔ ایک نگاہ میں لطائف چمکنے لگتے ہیں کوئی بھی فیوضات و برکات روحانی و قلبی سے محروم نہیں رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ جس کا جتنا ظرف ہے یا جتنا نصیبہ ہے اتنا ہی پا سکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ "لا یشقیٰ جلیسہ" اور اس گئے گزرے دور میں بارگاہ نبویؐ میں کشفاً اور روحانی طور پر باریاب ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک

بڑھ جاتی ہے۔ سبحان اللہ۔

یہ چند سطور بطور تعارف لکھ دی ہیں کہ احباب کو کسی حد تک اپنے شیخ کی عظمت کا اندازہ نصیب ہو۔ اب وصال کے حالات درج کرتا ہوں۔

وما توفیقی الا باالله العلی العظیم

یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے جب میں حضرتؒ جی کے ہمرکاب تھا تو روضۂ اطہر سے رخصت ہونے کا منظر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت سر جھکائے دست بستہ پرکاہ کی طرح لرزاں کھڑے تھے اور اس شدت سے رو رہے تھے کہ جسے زار و قطار کہا جائے تو غالباً مفہوم ادا نہ ہو۔ حضرت ٹوٹ کے برسے اور بلک بلک کر روئے۔ اس قدر مضبوط اور عظیم انسان جس نے مردانہ وار ہر اس طاقت کو للکارا جو اسلام کے خلاف ابھری۔ اور زندگی بھر عصمت رسول ﷺ اور عصمت صحابہؓ کی پاسداری کی جسے میں نے سفر و حضر میں' ہنگاموں اور اجتماعات میں اور تنہائی و علیحدگی میں ہر حال میں ایک چٹان کی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ مضبوط پایا۔ اس ہستی کو اسطرح ٹوٹتے بکھرتے اور قدموں پر نثار ہوتے دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ آپ کی یہ آخری حاضری ہے اور پھر شاید اس مادی جسم کے ساتھ حاضر نہ ہوں۔

اس کے بعد کتنے پروگرام عمرہ کے لئے حرمین شریفین کی حاضری کے بنے۔ ہر بار میں نے جناب کرنل مطلوب حسین صاحب سے یہی عرض کیا کہ میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اب حضرت وہاں حاضر نہیں ہو رہے اور ہر بار وہی ہوا لیکن اس میں ایک بات تھی۔ یہ کھٹکا نہ تھا کہ حضرت کا فوراً وصال ہو جائے گا۔ صرف یہ تھا کہ اب شاید دوبارہ حرمین شریفین میں حاضر نہ ہوں۔

پھر احباب کو یاد ہو گا کہ جب لنگر مخدوم کے پروگرام پر حضرتؒ جی نے سلسلہ عالیہ کے لئے خصوصی احکام و ہدایات ارشاد فرمائیں تو جناب کرنل قریشی صاحب

مرحوم 'بندہ کے پاس تشریف لائے اور مبارک باد دی کہ تمہیں حضرت نے بہت نوازا ہے اور اللہ کا بڑا احسان ہے۔ توانہیں یاد ہوگا کہ میری آنکھیں جل تھل تھیں اور میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مجھے اس میں حضرت کے وصال کی خبر نظر آتی ہے۔

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ حضرتؒ کی خدمت میں حاضری اور معمولات جاری رہے کہ امسال جنوری میں مجھے اوکاڑہ ایک سیرۃ کانفرنس پہ جانا پڑا۔ جو چھاؤنی میں منعقد ہوئی تھی۔ واپس آکر میں نے حضرتؒ جی کی خدمت عالیہ میں حاضری دی۔ بہت دیر تک جلسہ کی کارروائی کا پوچھتے رہے۔ بہت خوش ہوئے اور پھر احباب سے بھی بارہا اس کا تذکرہ فرماتے رہے۔

اس دن حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے کچھ تکلیف ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ غالباً کوئی دوائی ایسی کھالی ہے۔ جس سے منہ اور زبان خشک ہے۔ یہ تکلیف بڑھتی رہی تا آنکہ دہن مبارک اندر سے پھٹنے لگا اور خون رسنا شروع ہو گیا۔ کھانا تو درکنار کوئی چیز پینا بھی مشکل ہو گیا۔ راولپنڈی اطلاع ہوگئی اور کرنل محمد بشیر کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ حضرتؒ کی زندگی کے آخری سفر میں ہمرکاب تھے۔

اسلام آباد میں جناب فضل کریم بٹ صاحب کے گھر میں حضرتؒ جی کا علیحدہ کمرہ ہے آپ وہاں تشریف لے گئے۔ دوسرے دن بندہ بھی حاضر ہوا۔ احباب جمع تھے۔ علاج شروع ہوا اور بحمد للہ جس حد تک ممکن تھا علاج ہوا۔ احباب نے جی بھر کے خدمت کی اور جھولیاں بھر بھر کر انوار و کیفیات کو لوٹا۔ دور دراز سے احباب حاضر خدمت ہوتے رہے اور دید ار پر انوار سے دل و نگاہ کو روشن کرتے رہے۔ تکلیف بڑھتی گئی۔ غذا تو درکنار حضرتؒ بات کرنے سے بھی عاجز تھے۔ لکھ کر ارشاد فرماتے تھے کاپی اور پنسل میز پر رکھی رہتی پھر مزید تکلیف بڑھی تو ملٹری

ہسپتال میں حضرت کو لایا گیا۔ ایک خصوصی کمرہ حضرتؒ کے لئے تھا اور ڈاکٹروں کا بورڈ۔ یہ سلسلہ کافی دنوں چلا کہ طبیعت سنبھل گئی۔ ڈاکٹر شب و روز بارگاہ عالی میں حاضر تھے۔ گھر سے بھی لوگ آتے تھے اور شرف ملاقات حاصل کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ نیز حضرتؒ بہت تسلی دیتے تھے اور سب کو ہمت اور حوصلے کی تاکید فرماتے کہ بندہ ایک شام کو حاضر ہوا۔ بہت سے احباب تھے اور حضرتؒ مختلف صاحب نظر خدام کو مشائخ سے رابطہ کراتے اور حالات کے بارے سوال فرماتے۔ جس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ مشائخ سے پوچھو میں کس روز گھر جا رہا ہوں۔ اس روز جمعرات تھی تو جواباً ارشاد ہوا کہ اگلے اتوار کو آپ گھر تشریف لے جائیں گے کہ بندہ سے مخاطب ہوئے تو اور باتوں کے علاوہ میں نے عرض کیا کہ حضرتؒ آپ کا چلہ پورا ہو چکا ہے۔ میری ناقص رائے میں آپ کی آخری منازل کا تقاضا تھا کہ من جانب اللہ آپ سے مجاہدہ کرایا گیا' خوراک ختم' بات کرنا ختم اور آنکھ جھپکنا ختم ہو گیا۔ یعنی قلت طعام قلت کلام اور قلت منام کا وہ کڑا معیار پورا کرایا گیا۔ جو صرف ان ہی کا حصہ بھی تھا اور حوصلہ بھی کہ کسی نے آپ کے لب مبارک سے اف تک نہ سنی۔ نماز ادا فرماتے تو بمشکل اشارے کے ساتھ اور پھر احباب کو رخصت فرما رہے ہیں۔ غالباً اہل فہم نے محسوس بھی کیا ہو گا اور گھر سے بھی جب خود رخصت ہوئے تو بالکل فارغ ہو کر تمام مسائل کا حل عطا کر کے کہ میرے بعد کیا کرنا ہو گا۔ جائیداد کا کیا ہو گا اور کس آدمی کو کیا فریضہ سونپا جائے گا۔ میری قبر کہاں ہو گی۔ اور اس کے ساتھ کیا کچھ تعمیرات کی جائیں۔ سلسلہ عالیہ کے احباب کس طرح اپنا کام جاری رکھیں گے۔ غرض ہر طرح سے مکمل ہدایات دیں اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ کے وصال کے بعد کوئی ایسا سوال موجود نہیں جس کا جواب حضرتؒ عطا نہ فرما گئے ہوں۔ خیر جو بات میں نے منازل کے بارے میں عرض کی تھی دراصل تو وہ بھی

وصال کی خبر تھی کہ جہاں تک منازل طے فرمانے تھے۔ الحمد اللہ پورے ہوئے۔بندہ نے دوسرے روز جمعہ پنڈی پڑھایا اور واپس آ گیا۔ حضرتؒ اسلام آباد تشریف لے گئے۔بیماری دور ہونے لگی تا آنکہ ڈاکٹروں نے علاج ختم کر دیا۔بندہ حاضر ہوتا رہا اور آخری بار جمعرات حاضر ہوا مختلف باتیں مختصراً ارشاد فرمائیں اور واپسی کی اجازت بخشی۔

جمعہ منارہ پڑھا۔ ہفتے کے روز طبیعت بے چین سی تھی تو بندہ گھر سے نکلا۔راستے میں عزیزم خدا بخش کو لیا اور ڈلوال محمد یوسف صاحب کے پاس چلا گیا۔بات دراصل یہ تھی کہ دل کو قرار نہ تھا۔

اثنائے راہ میں عزیزم خدا بخش سے بات بھی کی کہ حضرتؒ کی طرف سے دل بہت متفکر ہے اور باوجود اسکے کہ حضرتؒ روبصحت ہیں۔مجھے حضرتؒ کے صحت یاب ہو کر واپس آنے کی امید نہیں۔پھر محمد یوسف صاحب سے پنڈی جانے کا پروگرام بنا اور واپس آ گئے۔اب میں وہ بات عرض کروں جس کی خاطر یہ تمہید عرض کی ہے۔

میں نے مغرب کی نماز ادا کی تو انوار کی بارش نے گھیر لیا۔حتیٰ کہ میرے لئے بیٹھنا محال ہو گیا۔میں بستر پر لیٹا تو استغراق طاری ہو گیا۔استغراق راہ سلوک کی ایک کیفیت ہے۔جس میں ظاہر بدن بے حس ہو جاتا ہے اور روح پوری طرح متوجہ الی اللہ بھی ہوتی ہے جسم کی حالت سے باخبر بھی یہاں تک کہ لوگوں کی باتیں سنائی دیتی ہیں۔جواب دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔

یہ ساڑھے چھ بجے شام کا وقت تھا کہ بارگاہ نبوتؐ سے بلاوا آیا۔ مجھے تقریباً پچیس سال ہوئے ہیں کہ میں بارگاہ نبوتؐ کی حاضری سے مشرف ہوں۔الحمد للہ مجھ بے نوا پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ شیخ کامل کو وسیلہ بنا کر میری جوانی کی طویل راتوں کو محفل نبویؐ سے چراغاں کر دیا۔غالباً یہ شعر اگر میں اپنے شیخ کے لئے عرض کروں تو سب سے زیادہ مناسب ہو گا۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا با جان جاں ہمراز کردی

میں نے اس طویل حاضری میں اس طرح کا اجتماع نہ دیکھا تھا۔ خصوصاً شیخین کریمین امیر المومنین سیدنا ابو بکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کو بہت زیادہ متوجہ پایا' اور خصوصی اہتمام میں حضرتؒ جی کو گھرا پایا۔ میں بے نوا ہمرکاب تھا۔ بہت شاندار اور عجیب طرح کا لباس حضرتؒ کے زیب تن تھا۔ سر پر تاج جگمگا رہا تھا۔ خصوصی نشست بنی تھی۔ اور نبی رحمت ﷺ تبسم کناں ابر رحمت برسا رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ عزت افزائی جو ایک بالکل انوکھی طرز پر ہے۔ غالباً حضرتؒ جی کو کوئی بہت ہی خاص منصب عطا ہو رہا ہے اور یہ کیفیت ساڑھے چھ بجے سے کر پونے آٹھ بجے تک رہی۔ میں نے حضرتؒ جی سے بارہا سنا تھا کہ مراقبہ فنائی الرسول ﷺ اگر مضبوط ہو تو ایسے لوگوں کی ارواح قبض کر کے پہنچائی نہیں جاتیں بلکہ روح تو دربار نبویؐ میں حاضر ہوتی ہے اور ملک الموت جسم سے دنیوی زندگی والا تعلق ختم کر دیتا ہے لیکن اسکا مشاہدہ اس روز ہوا اور حضرت جیؒ کے وصال پہ ہوا کہ جن مبارک ارواح کو حضوری حاصل ہوتی ہے۔ انہیں کس طرح شرف باریابی حاصل ہوتا ہے۔ ساری کیفیات کو نقل کرنا محال ہے۔ اگر احباب میں سے کسی کو شوق ہو تو صاحب کشف احباب کو انشاء اللہ ایک نگاہ میں ساری کیفیات دکھائی جا سکتی ہیں اور دوسروں کو اگر شوق ہو تو محنت کریں کہ باطن روشن ہو جائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

میں اسی طرح ان کیفیات میں مستغرق تھا کہ عزیزم کرنل محمد اکرم صاحب کی طرف سے ٹیلیفون پر اطلاع پا کر ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور حضرتؒ کے وصال کی خبر دی میں اگرچہ بڑی شدت سے اپنی کیفیات میں مستغرق تھا۔ مگر صحن میں یہ آواز کہ حضرتؒ کا وصال ہو گیا ہے سن کر استغراق ختم ہو گیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ گاڑی نکالی اور راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ جسد مبارک اپنے کمرے میں محو استراحت تھا اور روح مبارک اعلیٰ علیین میں متوجہ الی اللہ۔ احباب پروانہ وار نچھاور ہو رہے تھے۔ پشاور سے لاہور تک آنے والے آ رہے تھے کہ دو بجے ذات حضرت کے جسد

مبارک کو غسل دیا گیا۔ زاہد صاحب' خصوصی خدمت پر مقرر تھے اور باقی جملہ احباب بھی اپنا اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ سحری کو تین بجے وہاں سے نکلے۔ میں زندگی میں آخری بار حضرتؒ جی کی موٹر چلا رہا تھا۔ فجر کی نماز دارالعرفان میں ادا کی اور یہاں میں نے روح پر فتوح کو دارالعرفان کی طرف متوجہ پایا۔ برادرم کرنل مطلوب حسین صاحب مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ حضرتؒ جی سے اجازت کیوں نہیں حاصل کرتے کہ جسد مبارک کو دارالعرفان میں دفن کیا جائے میں نے پوری کوشش کی۔ عرض کیا کہ حضرت آپ کے اہل خانہ کو یہاں گھر بنا کر پیش کر دیں گے اور ہر طرح سے آرام میں ہوں گے انشاء اللہ۔ مگر نہیں۔ فرمایا۔ زندگی میں بے شمار افراد کو مجھ پر بھروسہ تھا اور اللہ نے مجھے ان کا آسرا بنا دیا تھا۔ تم سب کو یہاں نہیں لا سکتے۔ اب میری قبر ان کے لئے ایسا ہی آسرا ہوگی۔ جس طرح زندگی میں میری ذات تھی اور آپ نے حرف حرف حق ارشاد فرمایا۔ سبحان اللہ کیا لجپال لوگ تھے اللہ ان پر کروڑوں کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

میں حالات دنیوی اور دفن کے ارکان کی تکمیل عرض کرنا نہیں چاہتا۔ کیفیات عرض کر رہا ہوں۔ حتیٰ کہ پچھلے پہر جنازہ اٹھا۔ پہلے عصر کی نماز اور پھر نماز جنازہ مجھ بے نوا نے پڑھائی۔ لحد میں اتارا۔ ایک ہجوم عاشقاں تھا جسے سنبھالنا میرے بس سے نکل نکل رہا تھا۔

اپنا دل درد سے پھٹنے کو آ گیا تھا۔ لیکن مجبور تھا کہ مجھے بے شمار یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا تھا اگرچہ میں خود یتیم ہو چکا تھا۔ مگر محمد اللہ بالغ تھا۔ مگر مجھ سے چھوٹے میرے ساتھ لپٹ رہے تھے۔ تمام مراحل طے ہوئے اور یہی اتوار کی شام تھی جس کے بارے میں مشائخ کرامؒ نے اطلاع دی تھی کہ آپ گھر پہنچ جائیں گے۔ اس سے مراد دنیا کا گھر تھا۔ تو بھی اور برزخ کا مکان تھا تو بھی دونوں طرح سے درست ثابت ہوئی۔

میں ذرا سخت مزاج اور مضبوط قسم کا آدمی ہوں۔ مجھ پر گریہ طاری نہیں ہوا کرتا۔ یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کے سامنے لوگوں کو دھاڑیں مارتا دیکھ کر بھی

چاہتا کہ میں بھی روؤں لیکن کیسے ؟

اور پھر دوسری مرتبہ حضرتؒ جی کے ہمرکاب عمرہ کے لئے حاضری نصیب ہوئی۔ تو مدینہ منورہ میں روضۂ اطہر کے قریب عشاء کے وقت ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو حضور اکرمؐ کے مدنی حیات مبارکہ کے مختلف حالات و مناظر منکشف ہونا شروع ہوئے۔ جب بات وصال نبویؐ پر پہنچی۔ حضور کا سفر آخرت منکشف ہوا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا کس طرح محبوب کو لحد میں اتار رہے ہیں۔ اور کس دل سے قبر اطہر پر مٹی ڈال رہے ہیں تو دل پھٹ پڑا۔ رونا آیا اور یوں آیا کہ آج تک نہیں تھما۔ خود ہی بیان کر رہا ہوتا ہوں اور خود ہی رو بھی رہا ہوتا ہوں اور پھر رہی سہی کی حضرتؒ جی کے سفر آخرت نے پوری کر دی۔

میں نے خود قبر کو سنوارا۔ خود پتھر اپنی گاڑی پر لاد کر ڈھوئے۔ حضرتؒ کا جنازہ پڑھایا اور اپنے شیخ اپنے بزرگ، اپنے مربی اور اپنے استاد کو لحد میں اتروایا۔ وجود مبارک، زاہد صاحب اور کرنل سلطان کے ہاتھوں میں تھموایا۔ کیا کڑی آزمائش تھی کہ کرنل سلطان جیسا مضبوط آدمی چھلک پڑا۔ اور جسد مبارک سے چمٹ گیا۔ پھر مٹی ڈالی اور قبر بنا دی۔

تو میں نے جو احباب بصیرت مجھے مل سکے۔ سب کو جمع کر کے قبر شریف کے پاس بٹھایا کہ جو سمجھ آئے مجھے بھی اطلاع کرنا۔ لیکن واللہ باللہ جیسے قبر پہ مٹی ڈالی گئی تو ایک تجلی تھی ایک جلوہ تھا ایک چمک تھی جو ایک آن میں لپکی اور حضرتؒ بھی اسی کے ساتھ منازل بالا کو تشریف لے گئے۔ اگر فرشتے تھے تو اسی چمک میں تھے اور اگر سوال جواب ہوئے تو اسی میں ہوئے ہوں گے۔ اگر بارگاہ رب العزت کی پیشی ہوئی تو اسی میں ہوئی ہوگی۔ ہم ناکارہ تو اس سے آگے کچھ نہ دیکھ سکے۔ اس کے بعد کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا، یہ الگ بات ہے۔ ہاں اتنا عرض کروں کہ حضرتؒ جی نے دو باتیں ارشاد فرمائیں تھیں۔ ایک یہ کہ پوری توجہ اور محنت سے جماعت کو چلاؤ انشاء اللہ کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ اگر کوئی اختلاف کر کے جانا چاہے تو اسے پیچھے سے آواز

دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تمہیں کسی کا محتاج نہیں رکھے گا۔ ممکن ہے الفاظ کچھ حد تک بدل گئے ہوں۔ مفہوم یہی تھا اس ارشاد نبویؐ کا جس سے اسی شام حضور ﷺ نے اس بے نوا کو نوازا۔ دوسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ فضل کریم بٹ صاحب نے میری بہت خدمت کی ہے۔ جماعت کے دنیاوی امور میں ان سے مشورہ لیا کرنا۔ ان کی تعمیل میں 'میں نے انہیں ناظم اعلیٰ صاحب کا مشیر مقرر کیا ہے۔ جملہ احباب کو اطلاع رہے۔ تیسری بات آپ کے گھر کے بارے میں تھی۔ یہ جملے احباب حلقہ اور اصحاب ذوق حضرات کے لئے ہیں۔

نہ کسی کو مخاطب کیا ہے نہ کسی سے غرض۔ ایک کیفیت بطور امانت تھی جو نقل کر دی۔ میرے خیال میں اس پر کسی کو فتویٰ صادر کرنے کا تکلف نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی نہ ہی رہے تو اپنا شوق پورا کر لے۔ میں سب کے لئے صرف دعا کروں گا۔ تاکہ اللہ جملہ مسلمانان عالم کو استقامت علی الدین نصیب فرمائے۔ خصوصاً احباب حلقہ کو ہمت و استقامت اور بلندی درجات عطا کرے۔ مجھ بے نوا کو دین کی خدمت کی توفیق ارزاں فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے اور برزخ اور آخرت میں شیخ المکرم کے ساتھ بارگاہ نبویؐ میں باریاب رہنے کی توفیق ارزاں رکھے۔ آمین!

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

فقیر بے نوا دعاگوئے عالم

محمد اکرم اعوان

(منارہ، ضلع چکوال)

O..........O..........O

حوالہ جات

۱- دیار حبیب میں چند روز

۲- ارشاد السالکین

۳- حضرت جی کا انٹرویو

خطوط بنام حضرت محمد اکرم اعوان صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب
چکڑالہ ضلع میانوالی

تاریخ ....

بخدمت عزیزم ملک محمد اکرم صاحب

السلام علیکم [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۲۰۰ [illegible]

[illegible] ۲۰۰

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بخدمت عزیزم ملک محمد اکرم صاحب

السلام علیکم۔ اچھا یہ کہ آپ آج رات کو چکڑالہ آ جائیں۔ لاہور
سے واپس کار لانے والا آدمی اور خدا بخش علی الصبح ۱۹ کو
چکوال حاضر ہوں رہنا معمولی دو کمبل وغیرہ ہمراہ کا ریر
راتیں دن بالکل چھوٹے ہیں آپ اگر منارہ سے ۱۹ صبح
صبح کو چلیں تو لاہور جانے میں بڑی دیر ہو جائے گی آپ
آج ہی ۱۸ شام کو کار شاہین پاس چھوڑ کر آ جائیں
تاکیداً عرض ہے مبلغ رقم ۸۰۰ روپیہ میرا خدا بخش کے پاس
ہے ان سے کہنا کہ وہ ضروری۔ جس طرح ہو۔ ہمراہ چکوال،
لائے اور ۲۰۰ میں ہمراہ لاؤں گا۔ یہ ایک ہزار روپیہ مولانا
سلیمان صاحب کی امداد ہوگی۔ تاکیداً۔ اگر مولوی صاحب
رہ جائیں تو یقیناً صبح خاص کر دربار نبوت؟ جو چیزیں
ملی ہیں۔ ان میں سخت نقصان ہو۔ [illegible]
کر دوں۔ [illegible]
اور مشائخ کی طرف [illegible] سوال کر ج ہو [illegible]
سے ہو چکیں۔ آپ کو [illegible] ایمان و عزم کا
ستون منصب۔ ملنے والا ہے مگر اس امر کو دل میں رکھیں کسی
سے اظہار نہ کرنا۔ میں نے کافی عرصے سے اس منصب کے
بارے میں آپ کے [illegible]
[illegible]
جنسیات [illegible] اور خود
ذات العالمین [illegible] میں [illegible] و ولایت
فرماتے ہیں۔ آپ [illegible] میں
میں [illegible]۔ نوافل کی [illegible]
پھر وہ شخص جس کو [illegible] کی حفاظت [illegible]
نبایا جائے [illegible] ہے۔ [illegible]

بہر طور شکر کرنا جیسا جوہر آباد بشیر کے متعلق کہا گیا بہرحال
خلیفہ صاحب کروائیں گے۔ خاص طور پر میں نے اس
دن اس بات کا۔ ہر ہی کام کو دیکھ لیں۔ آپ پہلے یہ فیصلہ
و اصول خیال کر لیں۔ خواہ وہ آپ کی شان جو منصب
کے سامنے ایک چوکیدار ہی ہو۔ یہ تو یقینی امر ہے اگر
سے زاہد آپ کے منصب کے سامنے چپڑاسی ہیں جگہ
خود کی رب کو منظور نہیں [illegible] ہر ایک کی خیر سگالی
ہم کریں [illegible] ہیں۔ کی انتظامی اہتمام میاں جی کام
موں خیال کرنا۔ باقی رقم بشیر کو میں نے دی تھی اس
میں میری ذاتی رقم 12 ہزار تھی تین ہزار کا یہ سود لے
کر آیا ہے وہ اب ملنی مشکل۔ میں نے خود بھی معاف
کیا۔ سال تک لگایا۔ ایک ہزار مولوی صاحب کی امداد
ہوگی 800 صد خدا بخش کو قرض کیا کر دے۔ خواہ بینک
سے قرض لے۔ سات ہزار اور کچھ زاہد جج کے ہیں اور
خرچ گھر کیتے۔ اور لگایا امانتیں تھیں وہ تمام واپس
کر دی۔ یہ زندگی موت کا علم نہیں ہے۔ شکیل نے ٹرانسفر
ارسال کر دیا ہے۔ بشیر کے ہاتھ امانتیں واپس کروں گا۔
اور کر دی ہیں۔ میں آج تمام ختم کر دوں گا۔ فقط۔ بہرحال
آپ 12/18 شام کو جلد آ جائیں۔ سستی نہ کریں

اللہ یار

بندہ عزیز محمد اکرم صاحب ۔ السلام علیکم [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۰۰۰ [illegible] 1300 [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



ایک تقریب میں

تقریر کاایک انداز

۷۸۶

13/11

بخدمت عزیزم محمد اکرم صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ ملا کاشف حال ہوا ۔ آپ کو خیال گزرا کہ شاید
شیخ کو ناراضگی ہو ہرگز نہیں ہے ۔ پریشانی میری تو آپ
کو آئندہ بھی نہایت تکلیف دے گی خواہ کسی عزیز کی
وجہ سے ہو ۔ بوجہ گہرے تعلق کے ۔ آخری فقرہ ۔ وہ
آپ کا لباس وہ منصب جناب کے احکام شرعی
میں تساہل بجری مجالس ، منحوس غذائیں ہیں نہ
میری وجہ سے ۔ آپ کو میں اپنا مخلص و محبوب
روحانی بچہ جانتا ہوں ۔ خدا جانتا ہے عبد الرؤف
کی ناراضگی کے بعد اگر دل کو تسلی ہوتی ہے تو آپ
کا وجود ہی خوشی کا سبب بنتا ہے یا بنے ۔ مجھے
تو یہ بھی یقین ہے میرے بعد بھی آپ کلثوم و منور کی
کی سرپرستی کیا کروگے وہ بھی آپ کی بہنیں ہیں
میں آپ کو اس شعر کا مصداق جانتا ہوں

من تو شدم تو من شدی
من تن شدم تو جان شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں
من دیگرم تو دیگری ۔

میں آپ کو اپنا روحانی بچہ خیال کرتا ہوں
آپ کی بیویوں کو اپنی بیٹیاں اور آپ کی اولاد
کو اپنی اولاد ۔ آپ کی عزت کو اپنی عزت
آپ کی تکلیف کو اپنی تکلیف ۔ اگرچہ یہ نہ سمجھتا

تو لفسانہ مطلب الدادی پر فائز الزام نہ ہوتے
جو ستون جہاں تھے ۔ ہیں کیا پوری جماعت کو
اگر بسیار رہے ۔ تو آپ کا وجود اور مولوی سلمان
صاحب کا وجود ہے ۔ ان کی نگی میں کبھی ؟ آپ
اب دونوں پر ہیں آپ جماعت کے فرنیل ہیں
خدا تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو ۔ آپ کے وجود
سے خدا تعالیٰ نے دین کا کام لینا ہے لہذا بیگما للہ
بے رہا ہے ۔ رہ حصہ رقم کا وہ ۔ میں نے اس
بنا پر لکھا تھا کہ گھر بلو خرچ حد سے بڑھا ہوا
ہے آمدن ظاہری کوئی نہیں ہے ۔ جماعت کی
آمد و رفت حد سے بڑھ گئی ہے خرچ ہر ماہ 1000
کبھی 1200 کبھی 1300 آ جاتا ہے باقی جز و دیا جائے ۔ کبھی
تو ہوتے ہیں ۔ دیکھ سکتے ہی لگا ہوا ہے ۔ سو اس
بنا پر عرض کی تھی کہ رقم بند نہ کریں ۔ اب رہا
سوال مائنوں کا ۔ اگر ان میں اس کو خدا تعالیٰ
کامیابی عطا فرمائے تو وہ ان ہی کے لئے دی ہے
وقف ہی لگا دیں ۔ اگر بالفرض کامیابی کی صورت
نظر نہ آئے تو پھر خود کسی اچھے کام میں لگا کر
کام کریں ۔ سبزہ پانی آ گئی تو خرچ ہو جائے گا
پھر جمع کی ہے ۔ ان کا قرض نہیں ہو گا جو دینی
ہے اس کی تو فکر ہے ۔ لہذا جماعت کا بوجھ سر
پر ہو گا بہر حال آپ بھی پہلی میں ہیں لگا دیں
یا کسی اور مشغول آمدنی والے کام میں لگا دیں ۔
وہ آپ کی مرضی پر ہو گا ۔ سبزہ کو کچھ بیچ خاص

بعد ربھی جماعت کے اخراجات کی ضرورت ہے
جس کا بوجھ بیان کے سر پر ہے بہر حال میری
زندگی میں یہ کام ہیں نہ لگا ہیں ۔ بعد کو
اپنی بہنوں کو اسکی آمدنی دیتے جانا
زور کیا کہوں ۔

10/5/65

مکتبہ نقشبندیہ اویسیہ مسجد مجددیہ چکوال (جہلم)

تاریخ

حضرت عزیزم محترم و مکرم صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ [illegible]

[illegible]

مکتبہ نقشبندیہ اویسیہ مسجد
مجددیہ چکوال (جہلم)

تاریخ ________

ج [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

1-10-63 بخدمت عزیزم محمد اکرم صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ الحمد للہ کہ تعارف کا [illegible]
ہو گیا۔ اور باعث تسکین قلب ہوا۔ بندہ کے دل کو سخت
اضطراب تھا۔ خود بھی اور [illegible] سے بھی حسب معمول آپ
کے حق میں دعا کرتا تھا اور مشائخ عظام کی دعائیں بھی
آپ کے حق میں شامل تھیں جس میں سمجھتا تھا
کہ آپ کا صاحب مجاز ہونا اس کی وجہ سے ہے
کیونکہ جب آپ پر بیرونی حملہ ہوا تو مشائخ رحمۃ
اللہ علیہم کی مہربانی دیکھی اور حیران ہوئے [illegible]
[illegible] صاحب مجاز ہونے
کی وجہ سے تھی جس نے خوب سمجھا [illegible]
[illegible]
[illegible] مشورہ [illegible] رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم [illegible] خلق [illegible] ہمیشہ برتن دیکھ
اس میں چیز ڈالی جاتی ہے جس دن اس عاجز نے آپ
کو [illegible] صاحب [illegible] حضرت سلطان العارفین
کی خدمت میں اجازت [illegible] پیش کیا تھا تو
عرض کی تھی [illegible] نوجوان ہے [illegible] تو جواب [illegible]
[illegible] سلسلے کے لیے [illegible]
کو [illegible] کی قوت نہ ہلا سکے گی۔ یہ جواب تھا کہ یہ بچہ ہے
[illegible] کا جواب توجہ میں [illegible] فرمایا۔ آپ کو
[illegible] جو [illegible] نہیں دی گئی [illegible]
وہ عالم تھے [illegible] گو دیر بعد مشائخ نے شروع
[illegible] سلسلے کا شیخ مقرر فرمایا تھا۔ مگر [illegible]
[illegible] فرمائی ہے

آپ دونوں کے بعد مولانا اکرام الحق و جناب حافظ
عبدالرزاق ہیں۔ یہ چار اشخاص مشائخ کے مقرر کردہ
ہیں۔ صرف لاڈلے مقرر کردہ مولانا عبدالحق جو آبا
اور رشید صاحب ہیں۔ بغیر مشورہ مشائخ کے۔ یہ دونوں آپ
لوگوں کے باہم پلہ تک ہو سکتے ہیں۔ جس طرح میں مشائخ کا مقرر
کردہ ہوں۔ آپ چاروں بھی مقرر کردہ مشائخ ہیں۔ صرف یہ
ہے آپ بالواسطہ نہیں بلاواسطہ ہیں۔ مگر سلسلہ بھی
چلانے ہیں۔ مشائخ نے آپ کو بھی میرا شریک بنا دیا ہے
کیا آپ نے میری اس تقریر کو سمجھا ہے۔ میں نے یہ کوشش
یہ کی ہے اب میں ہیں آپ خدا رسول کی باطنی
افواج کے ذمہ دار افسر ہیں۔ اس ذمہ داری کو ذرا اچھی
طرح سمجھیں۔ دنیا کی چیز ~~دولت~~ دولت حکومت کوئی
چیز نہیں۔ بے شک دنیا مال ہے یہ تو ٹھیک ہے بہت سے صحابہ
کرام میں تین ہستیاں بہت مشہور و معروف دولت مند تھیں
خاص طور پر حضرت عمرو بن عاص وقت وفات
۹۰ ارب سونا کی اشرفی کا مالک تھا۔ یہ بھی ٹھیک
ہے اولیاء اللہ سے حضرت عبیداللہ احرار بہت بڑے
رئیس تھے۔ مگر قطب الاقطاب بھی تھے۔ جن کی
مدح و ثنا مولانا جامی فرماتے ہیں۔

چوں فقر اندر قبائے شاہی آمد
زتدبیر عبیداللہ آمد

اور فرماتے ہیں

اگر تیمور مغفور چنیں است
بگرد خرمن او خوشہ چیں است

مگر ان کو خدائی کی اور یاد خدا سے کسی چیز نے
غافل نہیں کیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ والصلوٰۃ

علیہ السلام کی تین ۷۰۰ بیوی تھیں ۳۱۰ ساٹھ لونڈی تھیں روئے
زمین کی حکومت کے مالک تھے لیکن خدا سے کبھی جُدا
غافل نہیں کیا ۔ آپ ایسا نہ ہو کہ دنیا کے نشے میں
آکر خدا سے غافل ہو جائیں ایسا نہ ہو کہ کوئلہ میں
مشین (engine) اپنے جسم کو مشین بنا کر غفلت میں
دل کو کوئلہ بنا دیں قرآن کی اس آیت پر عمل کرنا۔
رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ
وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ ۔ از شعر

ستون وقت است شوند خواب بیدار

دل اندر یار بند و دست بکار

آپ اپنی ذمہ داری کو سنبھالتے ہوئے لیکن ذمی الظاہر
جسمانیاً و من الباطن روحانیاً ہر عمل کرتے ہوئے
جو کام بھی مطابق شریعت کر گئے وہ ذکر الٰہی میں
داخل ہو گا اور جو بھی بیوی بچوں کو کھلائیں گے وہ
حضرت ہود علیہ السلام کی والدہ کے حکم میں برکت
منجوارہ خزانوں سے وصول ہوتی دودھ اپنے بچے کو
دیا ۔ آپ پرورش اپنے بچوں کی کریں گے ثواب
خدا سے ملے گا ۔ آپ برابر فیاض العین تبدعوت الی
اللہ مخلوق دو بلوچستان میں ہیں شکر ۔ عشق میں
الحلم نہ ہونے پائے ۔ شادی کے بعد انشاء اللہ ملاقات
ہوگی نماز کی پابندی وقت پابندی کوشش جماعت کی
کرنا تو امل اپنی کا خیال ہر پر مراقبات میں
مشغول رہنا ۔ تو خود فقاب میں بیٹھی نظر کرے اپنی
ذمہ داری سے خبردار رہنا آپ کا وجود بے فائدہ

عزیزم محمد اکرم صاحب السلام علیکم زید مجدکم
مزاج مقدس

تاریخ لاہور کی 15/1/79 والتوی ہوگئی ہے اب 31/1/79 تک رفعت ہے
غالباً 2 کو پتہ چلیگا - باقی عورتوں کے لئے ضروری تو نہیں
کہ ان کی بیعت بدست اقدس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم سپرد کرائی جائے - خلیفہ مجاز کے ذریعہ بیعت ہو سکتی
[illegible] کپڑے کا ایک سرا پکڑ کر یا بندھی جائے تو کرادو -
جس طرح پردہ والی کرائی جاتی ہے اسکی ایک چادر لے
گی پردہ کے لئے ایک معمولی لمبی لیجئے - بعض کو کوزہ
میں دیا جاتا ہے - اس طرح کرادیں - کل امان اللہ
خاں کی گجرات سے خط آیا ہے شاید 8/2/79 کے اجتماع
پر چکڑالہ آجائے - اگر آپ سے ہو سکے تو آپ بھی
8/2 کو آجائیں - اور لائسنس ہمراہ لائیں -
باقی بشیر صاحب اور دیارت کا جھگڑا تنکر خورشید
سنڈیمن - اپنے باپ دادا کی گدی پر جا بیٹھا ہے
اب وہ دائیاں کا سلوک طے کرا رہا ہے چھوٹی
سی دکان لے لی ہے ربانی کی خلافت اسی دکان
میں رکھدی ہے - دل سخت پریشان ہے آج رات
کو شفیع وصادر چھوٹے بھائی مہر خاں جو فوت ہو
گیا ہے اس کا ایک لڑکا ہے تین لڑکیاں ہیں - دو لڑکیاں
رات کو اٹھا کر لے گئے ہیں اللہ اعلم کہاں لے گئے ہیں
اب وہ لڑکی میرے دروازے پر زار و قطار رو
رہا ہے -

بہر حال [illegible]
[illegible]

[illegible]

تخلیق نہیں ہوا۔ خدا تعالیٰ جو اس نے جو اس سے کام لینی
یاد ہو دین کا لینا چاہتا ہے اس کو ادا کریں
آپ کی تیزی اثرات کی وجہ اصل میں۔ جب
آپ پر مقدمہ تھا تو میری ہمہ تن توجہ جناب کی
طرف مبذول ہو گئی اس وجہ سے۔ تمام رفقاء سے بھی دعا
کراتا تھا اور خود بھی بعد معمول و بعد ادائے فرض نماز
کے بعد معمول کے اور معمول کے وقت آپ کا تصور بھی
ہوتا تھا۔ اور غائبی توجہ کی صورت بھی۔ یہی ہے کہ مرید
کی صورت مثل شیخ سامنے رکھ کر اس پر القاء کرے
اس طرح ضیاء القلوب میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
نے تحریر فرمایا ہے۔ اور میرا تصور کرنا تو محض محبت
کی وجہ سے تھا کہ بوجہ آپ کی تکلیف کا دل پر
اثر تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اولاد کی تکلیف آخر والدین
کے قلوب پر اثر انداز ہوتی ہے اس توجہ دائمی نے آپ
کے قلب میں انوار لاتعداد جمع کر دیئے تھے۔ پھر ز
تبرکات بشکل زیارت نے آگ لگا دی۔ جیسے میں
لکھ چکا ہوں کہ آپ اور مولانا سلمان صاحب خصوصیت
طور پر باقی عبد الرزاق اور مولانا اکرام الحق
صاحب مشائخ کی بالذات روحانی اولاد میں آگئے
گو بشیر صاحب ہوں گو وہ میرا روحانی بیٹا ہے
یا مولوی عبد الحق صاحب بھی ہوں۔
آپ کے مقابل تو مشائخ کے نزدیک وہ
پوتا کا حکم رکھتے ہیں نہ بیٹا کا۔
بہر حال اگر وقت ملنا ہو کہ جواب خط بذریعہ
تک مل جائے تو جواب بذریعہ تار کہ تسلی ہو جائے۔

اللہ یار

نور خدا مرام

حوالہ نمبر .... تاریخ ....

۷۸۶

۵-۷-۶۱

[illegible] محبوب دنیا کو

بخدمت عزیزم ملک [illegible] السلام علیکم [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تصوف و سلوک اسلامی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں انحطاط و زوال کے آثار نظر آ رہے ہیں' خصوصاً ان کی زندگی کا دینی پہلو اس عمومی انحطاط سے زیادہ متاثر ہوا ہے' جس امت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپی گئی' دنیا بھر کی رہنمائی اور امامت کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور خیر الامم کا عظیم الشان لقب عطا ہوا' وہی امت آج مادہ پرستی کا شکار ہو کر دنیا کی رہنمائی تو درکنار' خود اپنی اصلاح سے بیگانہ محض ہے' اس امت میں شریعت مطہرہ کی حقیقی روح کا پایا جانا تو درکنار' اس کے ظاہری احکام پر عمل بھی مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

تصوف و سلوک اسلامی' دین کی اصل اور روح ہے سارے سلسلہ ہائے تصوف کا مقصود اصلی اسی روح دین یعنی تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کا حصول تھا' مگر مرور زمانہ سے آج ان سلاسل کے متوسلین (الا ماشاء اللہ) اپنے مقصد اور طریق کار سے اتنی دور جا چکے ہیں کہ ابتدائی پاکیزہ زندگی سے ان کی کوئی نسبت ہی نظر نہیں آتی۔ نتیجہ یہ کہ عوام و خواص یا تو سرے سے حقیقی تصوف کے منکر ہیں یا بیگانہ محض'

حالانکہ صحیح اسلامی تصوف نہ کوئی شجر ممنوعہ ہے اور نہ کوئی انوکھی اور ان سنی چیز۔ یہ تو اس دور کی پیداوار ہے' جب حضور اکرم ﷺ غار حرا میں بیٹھ کر ذکر الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے' اس غار میں بیٹھ کر تصوف کا جو مقدس پودا لگایا وہ حضور ﷺ کی مقدس تحریک کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا اور ایک تناور درخت بن کر صبر' شکر' عزیمت' استقامت' اخلاص' للّٰہیت' اطاعت الٰہی اتباع نبوی ﷺ کی صورت میں برگ وبار لانے لگا۔ اور اس عظیم الشان درخت کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو سکون میسر آیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے ایک علیحدہ اور مستقل حیثیت حاصل نہ تھی' بلکہ "احسان" کے نام سے دین کے ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر جس طرح علوم دین کے دیگر شعبے مثلاً حدیث' فقہ' کلام' اصول وغیرہ عہد رسالت کے بعد ہی مستقل اور علیحدہ فن کی صورت میں معرض وجود میں آئے۔ اسی طرح تصوف وسلوک کے مروجہ اعمال واذکار اشغال کی تدوین بھی اس وقت ہوئی جب مخلص اور بلند مرتبہ بزرگان دین نے محسوس کیا کہ خیر القرون کے بعد بندے اور خدا کے درمیان جو بُعد اور دوری ہوتی جارہی ہے اسے کم کرنا اور بندے کو خدا کے قریب لانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے چنانچہ ان اکابر دین نے قرآن وسنت کے روشن چراغ ہاتھ میں لے کر ان وسائل وذرائع کا کھوج لگایا جو اس بعد کو قرب سے بدلنے میں اور بندوں کے لئے اپنے مالک کے احکام پر رغبت شوق اور اخلاص سے عمل کرنے میں ممد ثابت ہو سکتے تھے۔

موجودہ دور میں اس کی ضرورت کا احساس شدید تر ہو گیا ہے کہ امت مسلمہ کے بھٹکے ہوئے راہی اپنی منزل سے بے خبر اور مقصد حیات سے یکسر ناآشنا ہو چکے ہیں اسلئے ان کی فکری اور عملی اصلاح کرنی چاہئے۔ آج ہمارے گردو پیش۔ ضلالت' الحاد' بے دینی' بدعات' فواحش اور بے عملی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے ہیں،

قرآن وسنت سے ہمارا تعلق روز بہ روز ٹوٹتا چلا جارہا ہے۔ قلوب واذہان پر مادہ پرستی کا غلبہ ہے۔ محبت الٰہی اور محاسبہ اخروی کا احساس ناپید ہے اس پر طرہ یہ کہ متاع کارواں کے یوں کھو جانے کے باوجود ہمارے اندر احساس زیاں نام کو بھی نہیں پایا جاتا ہم اپنی اس دینی اور اخلاقی تہی دستی پر کف افسوس ملنے کی بجائے الٹے خوش ہیں کہ ہم نے ترقی کا راز پالیا ہے۔ حالانکہ مسلمان کی ترقی کا راز صرف نبی آخر الزماں ﷺ کی لازوال شریعت کی اتباع میں مضمر ہے۔

ان حالات میں اس امر کی سخت ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کرایا جائے اور انہیں شریعت مطہرہ کے ظاہری اور باطنی سرمایہ کی طرف دعوت دی جائے اسی اہم مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس میں حضرت مصنف مدظلہ العالی نے طالبین حق کے لئے صحیح اسلامی تصوف پیش کیا ہے قرآن و سنت کی روشنی میں سلف صالحین کے ذریعہ تصوف و سلوک کی عملی صورت ہم تک پہنچائی ہے۔

ہمارے ہاں جمہور مسلمانوں میں تصوف و سلوک کے وجود اور اس کی ضرورت سے انکار تو بہت کم پایا جاتا ہے البتہ تصوف و سلوک کے ناقص اور جھوٹے دعویداروں کے عقائد' اعمال' اخلاق' اور معاملات نے لوگوں میں نفس تصوف و سلوک کے متعلق بدگمانی پیدا کردی ہے۔ آج بھی آپ کو کثرت سے ایسے افراد ملیں گے جو سلوک کی طلب و جستجو میں مدت سے سرگرداں ہیں اور عرصہ سے کسی نہ کسی "شریف" سے منسلک ہیں مگر انہیں کوئی ایسا مرد راہ داں نہیں ملا جو انہیں سلوک کی ابتدائی منازل طے کرانا تو درکنار صرف اتنا ہی بتادے کہ تصوف و سلوک کیا ہے اور اس کی ضرورت واہمیت کیا ہے اور اسکے حصول کا طریقہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ عوام تو کیا خواص نے بھی یہ سمجھ رکھا ہے کہ تصوف و سلوک اگلے وقتوں کی چیز

ہے۔ موجودہ دور کے مسلمان اس قابل نہیں کہ اولیاء اللہ کی بتائی ہوئی تدابیر کو عملاً
اختیار کر کے منازل سلوک طے کر سکیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی ولی اللہ نے وفات
کے وقت سلوک کے دروازے مقفل کر کے یہ وصیت کی تھی کہ خبردار آنے والی
نسلیں اس کے قریب نہ جائیں۔ یا کسی نے یہ وصیت کی تھی کہ آنے والی نسلوں کا کام
صرف اتنا ہے کہ حسن بصریؒ، جنید بغدادیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ
نقشبندؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، معین الدین چشتیؒ، مجدد سرہندیؒ اور دیگر اولیائے کرام
کا نام لے لیا کریں مگر ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی جسارت نہ کریں ظاہر
ہے کہ تاریخ نے کسی ایسے وصیت نامے کی نشاندہی نہیں کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ
تزکیہ نفس اور اصلاح قلب کی ضرورت پہلے زمانہ کے لوگوں کی نسبت ہمیں بہت
زیادہ ہے بلکہ اسکی ضرورت کا اعلان تو ابدالآباد تک کے لئے ان الفاظ میں ہو چکا ہے
کہ

قد افلح من زکٰہا اور یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من
اتی اللہ بقلب سلیم۔

یہ ابدی اور عالمگیر حقائق ہیں اور معتقدمین صوفیہ اور متاخرین علمائے حق نے
اسی تزکیہ کے ذریعہ ظاہری شریعت کی پابندی کرنے اور فلاح اخروی حاصل کرنے
کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ شریعت حقہ کی پابندی کے بغیر نجات ممکن نہیں مگر جس
طرح جسمانی بیماری کی صورت میں انسان کوئی جسمانی نوعیت کا کام صحیح طور نہیں کر
سکتا اسی طرح قلبی بیماری کی صورت میں شریعت کے احکام پر بھی کما حقہ، عمل نہیں
ہو سکتا۔ جسم انسانی میں قلب کی مرکزی حیثیت اور اسکے عملی کردار سے ہر ذی علم
واقف ہے۔ اگر یہ سلطان بدن ہوا و ہوس کا شکار ہو جائے تو سارا جسم اور تمام جسمانی
صلاحیتیں گناہ اور بغاوت، شرک اور بدعت، فحاشی اور بے حیائی کے لئے وقف ہو کر

رہ جائیں گی اور بندہ اپنے خالق سے یکسر بیگانہ ہو جائے گا اس لئے اصلاح قلب کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں رہا۔ یہ سوال کہ اصلاح قلب کا ذریعہ اور طریقہ کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے فضل سے قرآن و سنت دنیا میں محفوظ ہیں ان کی رہنمائی میں جہاں ہم دین و دنیا کے دوسرے شعبوں میں خوب و ناخوب، صحیح و غلط میں تمیز کر کے راہ ہدایت پر گامزن ہو سکتے ہیں وہاں تصوف و سلوک کے شعبہ میں بھی روشنی کے ان دو میناروں سے رہنمائی حاصل کر کے اصلاح قلب کا مقصد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ تصوف و سلوک کی نعمت غیر مترقبہ مخصوص اوقات پر عرس اور میلے کرنا گانے جانے، طاؤس و رباب کی محفلیں آراستہ کرنے، دن منانے، سڑکوں اور گلیوں میں گشت کر کے فلک بوس نعرے لگانے، دین کامل میں نت نئے پیوند لگانے، تصوف کے ادارے اور نذر و نیاز وصول کرنے کی دکانیں کھول لینے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اسکے حصول کے لئے تو محبت الٰہی اور اتباع سنت درکار ہے کسی رہبر کامل کی رہنمائی میں قدم بقدم چلنا پڑتا ہے۔ ظاہری علوم بھی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے بغیر حاصل نہیں ہوتے تو اصلاح قلب اور روحانی ترقی جو سراسر القائی اور انعکاسی عمل ہے، شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی خوش قسمت پورے خلوص سے اصلاح قلب اور تزکیہ نفس کی خاطر اولیائے کرام کے نقش قدم پر چلنے کے لئے تیار ہو جائے اور اللہ کے فضل اور شیخ کامل کی توجہ اور رہنمائی سے منازل سلوک طے کرنے لگے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اسے وہابی، کشفی وغیرہ کے کھوکھلے نعروں اور دین فروشوں فتوی بازوں کے فتوؤں سے مرعوب نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اتباع سنت اور ذکر الٰہی کی کثرت سے جو لذت و سرور اور جو وصل اسے نصیب ہو گا اسے ترک کرنے کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں ہو گا---------- مختصر یہ کہ اگر ان اولیائے کرام نے، جنہیں آج ہم

بڑی عقیدت سے اور نیک نام سے یاد کرتے ہیں۔ ذکر واشغال کی یہی تدابیر اختیار کر کے منازل سلوک طے کئے تو آج ہمارے لئے اس راہ پر چلنا کیوں ممنوع قرار پایا؟

وہ راہ ہمارے لئے مسدود کیوں ہو گئی؟

کیاان بزرگوں کی اس موضوع پر لکھی ہوئی سینکڑوں تصانیف محض ورق گردانی اور قصہ گوئی کے لئے ہیں؟ کیاان کے بیش قیمت ارشادات عملی جامہ پہنانے کے لئے نہیں ہیں؟

جب محبت الٰہی اور اتباع سنت کی ضرورت آج بھی ایسی ہی ہے' جیسے پہلے تھی تو پھر اس کے حصول کے حقیقی راستہ پر گامزن ہونے میں تردد اور تامل کیوں؟ ضرورت ایسے مرد حق آگاہ کی ہے جو تصوف و سلوک کی حقیقت سے آشنا کر کے اولیاء اللہ کی راہ پر چلائے اور جس کی رہنمائی میں ہم عملاً ان مقامات سلوک تک پہنچ سکیں جو عشق سے بھی بلند تر اور حسن سے بھی لطیف تر ہیں۔

حافظ محمد شریف



تعلیمات شیخ

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ فلاح کا دارومدار تزکیہ پر ہے۔ قد افلح من تزکی۔(وہ فلاح پا گیا جس نے اپنا تزکیہ کیا)۔ تصوف و سلوک کے چاروں مشہور مروج سلسلے دراصل تربیت گاہیں ہیں جہاں تزکیہ باطن کے اصول بتائے جاتے ہیں اور عملی طور پر اس کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ تصوف کے تین سلسلوں میں اسکی ترتیب یہ ہے کہ ہر نئے سالک کو پہلے ذکر لسانی کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے آخر میں ذکر خفی، قلبی کرلیا جاتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں اول و آخر ذکر قلبی ہی کرایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

اول ما آخر ہر منتہی

یعنی ہماری ابتداء وہ ہے جو دوسروں کی انتہا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں اتباع سنت کا اہتمام سختی سے کیا جاتا ہے۔ جس کی برکت سے سالک کو جلدی اور زیادہ ترقی ہوتی ہے پھر نقشبندیہ کے دو طریقے ہیں----نقشبندیہ مجددیہ اور نقشبندیہ اویسیہ----ہمارا طریقہ نقشبندیہ اویسیہ ہے جس میں اللہ کریم مہربانی فرمادے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر روحانی بیعت کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

شجرہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

۱ الٰہی بحرمت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ

۲ الٰہی بحرمت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳ الٰہی بحرمت حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

۴ الٰہی بحرمت حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ

۵ الٰہی بحرمت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ

۶ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ

۷ الٰہی بحرمت حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ

۸ الٰہی بحرمت حضرت ابوایوب محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ

۹ الٰہی بحرمت حضرت سلطان العارفین خواجہ اللہ دین مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰ الٰہی بحرمت حضرت مولانا عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ

۱۱ الٰہی بحرمت قلزم فیوضات حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

۱۲ الٰہی بحرمت ختم خواجگان خاتمہ من وخاتمہ حضرت مولانا محمد اکرم خیر گردان (اس شجرہ کو زبانی یاد کرلیں اور روزانہ مجلس ذکر کے بعد دعا میں اسے شامل کرلیا کریں۔)

آپ کو اس سلسلہ عالیہ

میں داخل ہونا مبارک ہو

اس بات کو نہ بھولئے کہ

آپ کا مقصد صرف تزکیہ باطن ہے

جس کا

واحد ذریعہ ذکر الٰہی کی

مداومت ہے

ذکر الٰہی کی ضرورت واہمیت

انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ روح اور جسم مل کر انسان کہلاتا ہے دونوں کی تخلیق جداگانہ ہے۔ جسم مادی ہے اس کی اصل مٹی ہے روح عالم امر سے ہے اور پرتو صفات باری ہے اب حیات انسانی کا نظام ایسا ہے کہ اسے مسلسل غذا یا انرجی کی ضرورت درپیش ہے اس میں اگر بگاڑ آجائے تو بیمار پڑ جاتا ہے اگر غذا مکمل روک دی جائے تو اسکی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جس طرح غذا جسم کی ایک اہم ضرورت ہے اسی طرح یہ روح کی ضرورت بھی ہے مگر دونوں کی غذا جداگانہ ہے۔ دونوں کی دوا بھی جداگانہ ہے جسم کی غذا بھی مادی ہے جس کا جزو اعظم مٹی ہے اور روح کی غذا تجلیات باری ہیں جو اسے عالم امر اور بالائے عالم امر سے نصیب ہوتی ہے۔ غذائے مادی کی تعمیر میں جو مقام سورج کو حاصل ہے کہ بقائے عالم کا سبب ہے تمام عناصر کو اسکی گرمی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ یہی مقام روحانی طور پر آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا ہے جس کی طرف قرآن حکیم سراجا منیرا

فرما کر نشاندہی کرتا ہے۔ مادی غذا کا جزو اعظم تو مٹی ہے مگر پانی، ہوا گرمی، سردی وغیرہ مل کر مٹی سے مختلف چیزیں صورت پذیر ہوتی ہیں۔ جو بدن کی غذا کا بھی اور دوا کا بھی کام کرتی ہیں ایسا ہی نظام روحانی بھی ہے اصل برکات حضور اکرم ﷺ کی ہیں مگر اولوالعزم رسولؑ ان انوارات کو روح تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں جو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرتے ہیں۔ ان انوارات کے بغیر مثبت تبدیلی ہونا محال ہے ورنہ زبانی بھی اور تحریری بھی تبلیغ میں تو کوئی کسر باقی نہیں، مگر یاد رہے کہ ان انوارات و کیفیات جنہیں برکات نبوت کہہ لیجئے، ان سے دل بدل جاتا ہے اور عملی زندگی میں انسان گناہ سے نیکی کی طرف سفر شروع کر دیتا ہے جو اسکو مکمل نیکی تک پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ یہی اس کی پہچان بھی ہے کہ اگر اصل کیفیات نہ ہوں گی محض دعویٰ ہوگا تو وہ عملی زندگی کو مثبت کی بجائے مزید منفی اور ناروا رویہ دے گا۔

لطائف کیا ہیں؟

جس طرح جسم میں معدہ، جگر، دل و دماغ یعنی اعضاء رئیسہ ہیں جو غذا کو تحلیل کر کے جزو بدن بناتے ہیں' اسی طرح انسانی روح میں جو اعضائے رئیسہ ہیں انہیں اصطلاحاً لطائف کہا جاتا ہے جو لطیفہ کی جمع ہے اور اپنی اس لطافت کی وجہ سے 'جو اسے حاصل ہے' لطیفہ کہلاتا ہے۔ محققین صوفیاء نے جسم انسانی میں اس کی نشاندہی کی ہے جس میں مختلف سلاسل تصوف میں اختلاف بھی ہے مگر سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ میں ان کی تعیین مندرجہ ذیل ہے:

اول قلب: یہ دل کا مقام ہے جس کی دھڑکن سے ہم سب واقف ہیں'

دوم روح: اس کے مقابل دائیں طرف'

سوم سری: یہ قلب کے اوپر ہے'

چہارم خفی: دوم کے اوپر اس کے مقابلے میں'

پنجم اخفا: ان کے درمیان ہے'

ششم نفس: پیشانی جو سجدہ کے وقت زمین پر لگتی ہے

ہفتم سلطان الاذکار: جو سارے بدن کو شامل ہے کہ ہر بن مو سے اللہ اللہ کا ذکر جاری ہو جائے۔

اولوالعزم رسول پانچ ہیں: حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ ان کی ذوات عالیہ کا تعلق لطائف سے اسطرح ہے کہ لطیفہ اول پر برکات وانوارات حضرت آدم علیہ السلام سے آتے ہیں، یہ پہلے آسمان سے آتے ہیں اور اگر مشاہدہ نصیب ہو تو ان کا رنگ زرد نظر آتا ہے آسمان اول بھی نظر آسکتا ہے اور آدم علیہ السلام کی زیارت ہو نا بھی محال نہیں۔ دوسرے لطیفے کا تعلق حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام سے ہے، اس کے انوارارت دوسرے آسمان سے آتے ہیں اور ان کی رنگت سنہری مائل سرخ ہوتی ہے تیسرے لطیفے پر جو انوارات آتے ہیں ان کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے اور ان کا رنگ صاف شفاف سفید ہوتا ہے، یہ تیسرے آسمان سے آتے ہیں، چوتھے لطیفے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انوارات چوتھے آسمان سے آتے ہیں رنگ گہرا نیلا ہوتا ہے۔ پانچویں لطیفے کا تعلق آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے۔ اس کے انوارات کا رنگ سبز ہوتا ہے، پانچویں آسمان سے آتے ہیں اور پانچوں لطائف پر چھا جاتے ہیں۔ چھٹے اور ساتویں لطیفے پر تجلیات باری ہوتی ہیں جن کی رنگت یا کیفیت وکمیت کچھ بھی متعین نہیں کی جا سکتی۔ بس جیسے بجلی چمک جاتی ہے اور کچھ سمجھ نہیں آتا سوائے اس کے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، کچھ اسی طرح کا حال ہے۔ اللہ کریم اگر چشم بصیرت عطا کر دیں تو یہ سب کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ عموماً شروع میں تعیین ذرا مشکل ہوتی ہے، رنگ گڈ مڈ نظر آتے ہیں مگر رفتہ رفتہ قوت مشاہدہ میں پختگی آتی جائے تو ہر چیز صاف ہوتی جاتی ہے۔

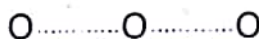
ذکر قلبی کا طریقہ۔

اس طریقے کا اصطلاحی نام پاس انفاس ہے یعنی اپنے سانسوں کی نگرانی کرنا۔ بعض نادانوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ سانس سے ذکر کیا لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ذکر دل سے کیا جاتا ہے' سانس صرف ایک خاص ترکیب سے لی جاتی ہے اور بس۔ اگر اس طرح اور ارادی طور پر قوت سے سانس نہ لی جائے تو جو کام ایک دن کا ہے اس پر دو سال بھی لگ سکتے ہیں۔ سو قبلہ رو بیٹھ کر اور متوجہ الی اللہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ منہ بند ہو۔ تعوذ تسمیہ کے بعد سانس لینا شروع کریں اور خیال کریں کہ جب سانس اندر کھینچی جاتی ہے تو لفظ اللہ دل کی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ جب سانس چھوڑتے ہیں تو لفظ "ھُ" خارج ہوتا ہے اور "ھُ" کی چوٹ دل پر یا اس لطیفہ پر لگے جس پر آپ ذکر کر رہے ہیں سو اس طرح اپنا وقت دیکھ کر ہر لطیفے پر مناسب دیر تک ذکر کیا جائے اور کوشش یہ ہونی چاہیے کہ سانس نہ ٹوٹے اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے چنانچہ ساتوں لطائف پر ذکر کرنے کے بعد پھر سے ساری توجہ پہلے لطیفے پر لے آتے ہیں جو قلب ہے اور تھوڑی دیر ذکر کر کے لمبا سانس لینا بند کر دے' بدن کا خیال یکسر چھوڑ دے اور سانسوں کو طبعی طور پر چلنے دے ساتھ دل پر نگرانی کرے' یہ کہ اللہ کا لفظ دل سے نکلے اور "ھُ" کی ٹکر عرش عظیم سے جا کر لگے۔ یہ پہلا سبق ہے' اسے رابطہ کہتے ہیں' یہ جب مضبوط ہو جائے تو اگلے مراقبات یا مقامات کرائے جا سکتے ہیں۔

ضرورت شیخ

یاد رہے کہ معاملہ از خود نہیں ہو پاتا' اس کے لئے شیخ کی توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ یہ جملہ کیفیات انعکاسی طور پر آگے تقسیم ہوتی ہیں جس طرح آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونے والا مومن ہی شرف صحابیت سے سرفراز ہوا صحابہؓ کی صحبت میں حاضری دینے والا تابعی بنا اور ان کی خدمت میں تبع تابعین نے ان سے مشائخ عظام نے یہ دولت حاصل کی اور نسلاً بعد نسلاً سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہی اور انشاء اللہ ہوتی رہے گی۔ یاد رہے کہ ہر مومن اسے حاصل کر سکتا ہے۔ مرد ہو یا عورت 'عالم ہو یا ان پڑھ 'امیر ہو یا غریب۔ بس اس کے لئے صرف ایمان شرط ہے اور صحبت شیخ خلوص کے ساتھ۔ کبھی شیخ کے ساتھ خلوص قلبی میں فرق آجائے تو یہ دولت یک آن چھن جاتی ہے۔



وصیت !!

حضرت المکرّم اللہ یار خانؒ

حیات دستور !!

حضرت المکرّم حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کی وصیت مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۸۲ء دستور العمل سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ کے لئے بنیادی دستاویز ہے۔ وصیت مذکورہ میں حضرت المکرّم نے جو اصول طے فرما دیئے ہیں۔ انہیں بطور حتمی ودائمی کلیات دستور ھذا حضرت المکرّمؒ کے اپنے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے

الف : مقصد

"حلقہ ذکر سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کا انتظام دائمی طور پر چلانے کے لئے حکم اللہ اور اتباع سنت رسول اللہ ﷺ میں نے اپنی زندگی کے بعد ہدایات بطور وصیت نامہ چھوڑنا اسلئے ضروری سمجھا ہے کہ سلسلہ نظم و ضبط کے ساتھ ہمیشہ ذکر الٰہی جاری

رکھے۔ میں اللہ تعالیٰ سے جہاں دعا کرتا ہوں وہاں متوقع ہوں کہ میری زندگی کے بعد یہ سلسلہ پھلے پھولے گا اور صدیوں پر محیط ہوگا۔ سنت محمدی ﷺ کی مکمل اتباع کرتے ہوئے صحیح العقیدہ مسلمان صوفی۔ مبلغ زندگی کے ہر شعبے میں صابر، شاکر اور غالب اسلام کے لئے کام کرنے والے افراد پیدا کرے گا اور اس لئے اسی مرکزیت کا قائم کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔"

ب: مرکز

"میں نے موجودہ اور آئندہ حالات کے پیش نظر اپنی عقل و بصیرت اور تائید غیبی کی روشنی میں منارہ ضلع جہلم کے مضافات میں جگہ حاصل کرکے "دارالعرفان" کے نام سے مرکز سلسلہ کی تعمیر کا منصوبہ اپنے متوسلین کو پیش کیا"۔

۲۔ "دارالعرفان منارہ کی حیثیت مرکزی ہوگی اور اس کے ذیلی مراکز تعمیر کئے جائیں اور انشاء اللہ ہوتے رہیں گے جو مرکز کے تابع ہوں گے"۔

۳۔ "دارالعرفان چونکہ میرے متوسلین کی ذاتی کوشش اور قربانی سے تعمیر ہوا ہے اور اس کے ذیلی مراکز بھی اسی طرح متوسلین کی کوشش کا نتیجہ ہوں گے۔ اس لئے میرے عزیزو اقارب یا ورثاء یا میرے کسی روحانی جانشین کے ورثاء دارالعرفان یا دارالعرفان سے منسلک کسی ادارہ کی جائیداد کے وارث نہ ہوں گے اور نہ ہی ان کا کوئی واسطہ یا استحقاق ہوگا اور یہ

خالصتاً سلسلہ کے زیر انتظام اور ملکیت ادارہ نقشبندیہ اویسیہ ہو گی۔"

ج: جانشین

۱-"چونکہ یہ سلسلہ حسب و نسب سے بالاتر اور مروجہ پیری مریدی سے ہٹ کر دنیوی مفادات اور مصلحتوں سے مختلف ہے اس لئے سلسلے میں میرا جانشین صرف وہی شخص ہو گا جس کی روحانی اہلیت سب سے زیادہ ہو گی۔ میں اپنی زندگی میں ملک محمد اکرم صاحب کو اپنا روحانی جانشین مقرر کرتا ہوں کیونکہ اس وقت سلسلہ میں میرے بعد سب سے زیادہ روحانی اہلیت وہی رکھتے ہیں جنہوں نے اپنے خلوص اور جانثاری سے اب تک سلسلہ کے تقاضوں اور میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کیا۔ اور ہر جانشین اسی اصول پر نامزد کیا جائے گا۔"

۲-"ہر جانشین اپنی زندگی میں اپنا ایسا جانشین نامزد کرے گا جس کی روحانی اہلیت سب سے زیادہ ہو گی۔ جانشین کا تقرر مجلس منتظمہ کی منظوری کے تابع ہو گا۔ اگر کوئی جانشین اپنا جانشین مقرر یا نامزد کیے بغیر فوت ہو جائے یا خود جانشین بر طرف کیا جائے تو اس صورت میں مجلس منتظمہ مرا جانشین نامزد کرنے کی مجاز ہو گی اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

۳-"میرے بعد سلسلہ میں ہر جانشین کے لئے مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل پیرا رہنا لازمی ہو گا جن سے انحراف جانشینی سے

محرومی کا باعث متصور ہوگا۔

(ا) شریعت مطہرہ پر استقامت یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی۔

(ب) سنت خیر الانام ﷺ کا کامل اتباع۔

(ج) بدعات سے مکمل اجتناب۔

(د) دوام ذکر و شغل مع اللہ سبحانہ۔

(ر) اعراض عن الخلق اور رجاء من اللہ صبر توکل اور قناعت کے ساتھ۔

(س) کثرت ذکر کے ساتھ مراقبات سلسلہ۔

(ط) سلسلہ کے اذکار و مراقبات کی حفاظت بطور امانت کرنا۔ اپنی طرف سے کمی یا بیشی نہ کرے۔

(ع) ہر جانشین کو مجلس منتظمہ کو بااختیار تسلیم کرنا ہوگا۔



شیخ المکرمؒ حضرت مولانا اللہ یار خانؒ
فہرست تصانیف

نمبر	تصنیف	زبان
1-	تعارف	اردو
2-	تعارف	انگریزی
3-	دلائل السلوک	اردو
4-	دلائل السلوک	انگریزی
5-	حیات النبی ﷺ	
6-	حیات برزخیہ	اردو
7-	حیات برزخیہ	انگلش
8-	اسرار الحرمین	
9-	مکتوبات	
10-	علم وعرفان	اردو
11-	علم وعرفان	انگلش
12-	عقائد و کمالات علمائے دیوبند	
13-	سیف اویسیہ	
14-	تفسیر آیات اربعہ	
15-	الدین الخالص	
16-	ایمان بالقرآن	

17- تحذیر المسلمین عن کید الکاذبین
18- تحقیق حلال یا حرام
19- حرمت ماتم
20- ایجاد مذہب شیعہ
21- شکست اعدائے حسینؓ
22- داماد علی صلی اللہ علیہ وسلم
23- بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم
24- الجمال والکمال
25- نفاذ شریعت اور فقہ جعفریہ
26- فقہ جعفریہ کی تاریخی سرگزشت
27- فقہ جعفریہ کی تاریخ
28- عقیدہ امامت اور اس کی حقیقت
29- شیعہ مذہب کے بنیادی اصول

دارالعرفان منارہ

کرنل (ر) مطلوب حسین

1958ء میں جب حضرت مولانا محمد اکرام اعوان کو سلسلہ عالیہ میں داخل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تو آپ کے شیخ قلزم فیوضات وبرکات حضرت العلام مولانا اللہ یار خان کا وادیٔ ونمار میں آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ عالیہ کی تجدید کا ابتدائی دور تھا اور گنتی کے چند احباب ان محافل ذکر میں شامل ہوتے تھے جو موجودہ دارالعرفان کے شمال میں کوئی 6/7 میل کے فاصلہ پر واقع پہاڑ کے دامن میں ایک ڈھوک میں منعقد ہوا کرتی تھیں جہاں ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب بھی موسم گرما میں حضرت شیخ تشریف لاتے تو اس دور افتادہ علاقہ میں یہ ڈھوک مرکز نزول تجلیات باری تعالیٰ بن جاتی۔

1960ء کی دہائی کے آخری حصہ میں جب احباب کی تعداد قدرے بڑھ گئی اور دوسرے بلاد میں بھی سلسلہ عالیہ کی خوشبو پہنچی تو یہ حاضری اس ڈھوک سے منتقل ہو کر منارہ گاؤں کے ایک سکول میں آگئی۔ جو مولانا اکرم کے گھر کے قریب تھا اور

جن کے ذمہ ان خدائی مہمانوں کی میزبانی تھی۔ جب سالانہ تعطیلات کے لئے سکول بند ہو جاتا تو احباب ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک ماہ کے لئے منارہ کا رخ کرتے۔ اس دہائی کے اوائل میں ہی حضرت شیخ کی شہرہ آفاق تصنیف "دلائل السلوک" منظر عام پر آکر سلسلہ عالیہ کے تعارف کا ایک بڑا ذریعہ بنی اور جس نے بعض علمائے کرام کو ادھر متوجہ کیا۔

اس سکول میں میری پہلی حاضری 1974ء جولائی سالانہ اجتماع میں ہوئی جب میں ہندوستان سے جنگی قیدیوں کی رہائی کے بعد وطن واپس لوٹا۔ یہ وہ دور تھا جب منارہ گاوں میں نہ بجلی تھی اور نہ پانی۔ 17 میل دور کلر کہار سے پانی ڈرموں میں بھر کر ٹرک کے ذریعہ لایا جاتا تھا جو زیر شدید مجاہدہ سالکین کے پینے اور وضو کے لئے افلاس کی حد تک ناکافی تھا۔ حتیٰ کہ 1978ء کے سالانہ اجتماع میں شیخ المکرم نے مستقل دارالعرفان تعمیر کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ جس کے لئے آپ نے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ مولانا محمد اکرم اعوان صاحب نے اس مقصد کے لئے 11 کنال اراضی موجودہ دارالعرفان کی جگہ پر اپنے شیخ المکرم کی خدمت میں پیش کی جو آپ نے اپنی قیمتی زرعی زمین کے عوض حاصل کی۔ اس مقام پر ملحق 5 کنال اراضی میں حضرت مولانا صاحب کے کول مائنز کے دفاتر پہلے سے موجود تھے۔

چنانچہ دارالعرفان کی مجوزہ عمارت کی پلاننگ احباب سلسلہ نے کی۔ 30 جولائی 1978 موجودہ باغیچہ لگایا گیا جو جامن۔ انار۔ امرود اور خوبانی کے درختوں پر مشتمل ہے۔ اسی رات قطبی ستارے کی مدد سے ہم نے قبلہ کا تعین کیا تاکہ دوسرے دن عصر کی نماز شیخ المکرم یہاں پڑھا کر باضابطہ افتتاح فرمادیں۔ صبح جناب قاضی صاحب لیئی والے جو 97-12-31 کو 130 برس کی عمر میں فوت ہوئے اور جنہیں شیخ المکرم کے پہلے شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے تلاوت

قرآن کریم فرماتے ہوئے اچانک گویا ہوئے "اوہ چو۔ جو تم نے رات قبلہ کی تعین کی ہے وہ درست نہیں اور چونکہ یہ تمہارا مرکز امام مہدی کی آمد کے وقت موجود ہو گا اس لئے احتیاط کریں۔" آپ ایک صاحب کشف بزرگ تھے۔

حسب پروگرام عصر کے وقت جب شیخ المکرم افتتاح کے لئے تشریف لائے جہاں کھلے میدان میں چھوٹے چھوٹے پتھر ترتیب دے کر عمارت کی نشاندہی کی گئی تھی اور مسجد کے محراب کی جگہ مصلیٰ اور پیچھے صفیں بچھائی گئی تھیں۔ شیخ المکرمؒ نے گاڑی سے اترتے ہی قاضی صاحب کو آگے آنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ وہ اب بیت اللہ شریف پر خیال کر کے بتائیں کہ تعیین شدہ قبلہ کی لائن کہاں سے گزر رہی ہے۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ حضرت یہ حطیم کے اوپر سے گزر رہی ہے اس پر حضرت مولانا اللہ یار خانؒ نے استفسار فرمایا کہ کیا حطیم بیت اللہ شریف کا حصہ نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے جواباً عرض کیا کہ ہاں حضرت مجھے غلطی لگی ہے۔ قبلہ کا تعین درست ہے۔

اس کے بعد دارالعرفان کی تعمیر شروع ہوئی جو درج ذیل نمایاں خصوصیات کی حامل ہے :-

(۱) تعمیر کے جملہ اخراجات احباب سلسلہ عالیہ کے ذاتی عطیات سے ہوئے۔

(۲) معمار اور مزدور بھی سلسلہ عالیہ کے افراد تھے جس طرح مسجد نبویؐ صحابہؓ نے اپنے ہاتھوں تعمیر فرمائی تھی۔ دوران تعمیر چشم فلک نے بریگیڈیئر رینک تک کے افسران کو گارہ مٹی اٹھاتے دیکھا ہے۔

1986ء میں جب صقارہ نظام تعلیم کے لئے دارالعرفان کی چاردیواری کے اندر صقارہ اکیڈمی کے نام سے پائلٹ پراجیکٹ شروع ہوا تو امیر محمد اکرم اعوان صاحب۔ (جو اب شیخ سلسلہ اور حضرتؒ کے جانشین تھے) کے کول مائنز کے دفاتر

سڑک کے پار منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا۔لہٰذا وہ جملہ دفاتر گرا کر ان کا ملبہ صقارہ کے ڈائننگ ہال میں استعمال ہوا۔اور 5 کنال مزید اراضی دارالعرفان میں شامل ہو گئی۔19-01-87 جب صدر پاکستان محمد ضیاء الحق شہید صقارہ اکیڈمی کے افتتاح کے لئے بذریعہ ہیلی کاپٹر تشریف لائے تو مذکورہ ڈائننگ ہال کی دیواریں اٹھ رہی تھیں اور چار دیواری کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔

دارالعرفان کی تعمیر کا عمل جاری وساری ہے جیسا کہ مسجد کے مینار کی تازہ ترین تعمیر سے ظاہر ہے۔اس مرکز کو چلانے کے لئے احباب حسب توفیق اعانت فرماتے ہیں لیکن وہ رقم کافی نہیں ہوتی۔باقی حضرت امیر محمد اکرم اعوان' دامت برکاتہم اپنے ذاتی وسائل سے اخراجات پورے کرتے رہتے ہیں۔

دارالعرفان منارہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ کا عالمی روحانی مرکز ہے جہاں تعلیم وتربیت کا سلسلہ پورا سال مستقل طور پر جاری وساری رہتا ہے۔تقریباً پانچ ہفتے ہر سالانہ اجتماع پر پوری دنیا سے ممبران تشریف لاتے ہیں حضور ﷺ کے دست اقدس پر روحانی بیعت اس مرکز میں ہوتی ہے نیز رمضان المبارک میں آخری عشرہ کے اعتکاف کی رونقیں دیکھنے لائق ہوتی ہیں۔جس میں معتکفین کی تعداد ایک ہزار تک چلی جاتی ہے۔ان دو عظیم سالانہ اجتماعات کے دوران لنگر کے اخراجات کے لئے کسی سے کوئی چندہ نہیں مانگا جاتا۔گندم حضرت کی زمینوں سے آجاتی ہے اور باقی اخراجات وہ خاموشی اور خوش اسلوبی سے پورا کرتا رہتا ہے جس کے نام پر لنگر چلتا ہے۔

اللہ کریم سلسلہ عالیہ کے اس روحانی مرکز کو تا قیامت قائم ودائم رکھے اور اس سے فیوضات وبرکات نبویؐ کے جو چشمے جاری ہیں ان سے چار دانگ عالم جملہ مسلمان خواتین وحضرات کو سیراب فرمائے۔آمین

تنظیم الاخوان کی روحانی درسگاہ دار العرفان میں
رمضان المبارک کے اعتکاف کے شب و روز

تنظیم الاخوان کے کارکن اپنی روحانی تربیت کی غرض سے ہر سال رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کی غرض سے روحانی درسگاہ دار العرفان منارہ ضلع چکوال میں اکٹھے ہوتے ہیں جہاں امیر تنظیم مولانا محمد اکرم اعوان کارکنان کی روحانی تربیت کرتے ہیں۔ دار العرفان کے شب و روز میں شامل ہو کر عاشقان رسول ﷺ یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، کس طرح ایک بندہ خدا رسول اللہ کا خادم اس مادی دور میں علم و عرفان کی مجلس قائم کیے ہوئے ہزاروں انسانوں کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور ہر آنے والے دل کو اللہ تعالیٰ سے آشنا کروا دیتا ہے اس دور کی عظیم کرامات سے ہے ایسا لگتا ہے کہ ربوبیت الٰہی نے ایک نئی کروٹ لی ہے جب ہر انسان مادہ پرستی اور نفا نفسی کے عالم میں گم ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے جب ہر طرح کی وعظ و نصیحت کسی بھی معاشرے پر بے اثر ہے اور خود اسلامی معاشرہ اپنے اسلاف کی روایات کا مذاق اڑا رہا ہے سکون نامی کوئی شے

کسی بستی شہر ملک میں نہیں ہے مسلمان یقین محکم سے خالی ہو کر واہمات پر زندگی بسر کر رہا ہے مسلم خلیفہ اللہ تعالی کا نائب ہونے کے بجائے کفار کی تقلید کر رہا ہے دور جہالت کی تقلید کر رہا ہے پھر سے دور جہالت کی روایات عروج پر ہیں۔انسانی اخلاق پستی کی انتا کو پہنچ چکا ہے برائی مساجد کے تہہ خانوں تک پہنچ گئی ہے تو اس دور میں انسانیت کو اللہ تعالی سے آشنا کروانا اس میں رحمت باری تعالی کی مرضی شامل ہے۔پوری دنیا کے کونے کونے سے آنے والے مسلمان مرد مجاہد کی مجلس میں بیٹھ کر اپنے دلوں کے شیشے صاف کر رہے ہیں، کسی طبقاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر عدلیہ کے اعلیٰ جسٹس صاحبان سے لے کر عام جج اور وکیل صاحبان سے لے کر کچہری کے کلرک تک۔پولیس کے سپاہی سے لے کر اعلیٰ عہدیداروں 'فوج کے تینوں' شعبوں کے سپاہی رینک سے اعلیٰ آفیسر تک تعلیم کے پرائمری سکول ٹیچر سے لے کر سیکرٹری تعلیم تک غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے والے حکمران' علماء' صنعتکار 'کاشتکار مزدور' سیاستدان لوگ تزکیہ نفس کی غرض سے دارالعرفان پہنچتے ہیں، جولائی اگست میں ہر سال سالانہ اجتماع چالیس دن کا مقرر ہوتا ہے بیرونی ممالک سے بھی ہزاروں افراد شامل ہوتے ہیں، مگر رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی رونق ہر مجالس پر نمایاں رہتی ہیں۔تزکیہ نفس کے متلاشی خود کو ایک ٹائم ٹیبل کے تحت پابند کر لیتے ہیں جس میں ذکر الٰہی نماز باجماعت تعلیم بالغاں کے پروگرام کی طرح چوبیس گھنٹے کا ٹائم ٹیبل تیار ہوتا ہے نماز تہجد کے لئے رات تین بجے کے قریب بیداری ہوتی ہے سحری کھانے کے بعد اجتماعی ذکر الٰہی کی مجلس منعقد ہوتی ہے۔جو نماز فجر تک جاری رہتی ہے۔نماز فجر سے اشراق تک قرآن خوانی درس حدیث اور اشراق کے نوافل ادا کرنے کے بعد ایک گھنٹہ آرام ہوتا ہے پھر آٹھ بجے دن کے قریب اجتماعی ذکر ہوتا ہے جو ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے پھر روحانی طور پر

حدیث اور اشراق کے نوافل ادا کرنے کے بعد ایک گھنٹہ آرام ہوتا ہے پھر آٹھ بجے دن کے قریب اجتماعی ذکر ہوتا ہے جو ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے پھر روحانی طور پر کلاس کا گروپ وار پروگرام شروع کرتے ہیں جو دس بجے تک انفرادی گروپ وار ذکر الہی ہوتا ہے دس سے گیارہ بجے تک دین متین کے ابتدائی مسائل سیکھنے کا پروگرام رہتا ہے۔ گیارہ بجے سے نماز ظہر تک آرام ہوتا ہے نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد امیر تنظیم الاخوان اور شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کا درس قرآن ہوتا ہے۔ پھر اجتماعی و انفرادی ذکر کی مجلس قائم ہوتی ہے۔ نماز عصر کے بعد قرآن خوانی اور صحبتِ شیخ کا پیریڈ جاری رہتا ہے۔ افطاری کے لئے معتکف جمع ہوتے ہیں۔ افطاری کے بعد نماز مغرب کے بعد کھانا ہوتا ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد پھر اجتماعی ذکر الہی کی مجلس قائم ہوتی ہے جس کے آخر پر کچھ افراد کی روحانی بیعت بھی کرائی جاتی ہے اس طرح رات دس بجے کے بعد آرام ہوتا ہے جو تہجد تک جاری رہتا ہے ہر سال معتکفین کی تعداد کم و بیش ہزار کے قریب ہو جاتی ہے جس میں سنت و نفل اعتکاف والے شامل ہوتے ہیں۔ جمعہ اور ستائیسویں پر یہ تعداد بڑھ جاتی ہے لنگر کا پروگرام ساتھی خود تیار کرتے ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق لنگر میں حصہ بھی ڈال دیتے ہیں جس شخص نے زندگی میں دار العرفان کا اعتکاف کر لیا اسکی خواہش رہے گی کہ بقیہ زندگی میں بھی اسکو ضرور حاصل کرے' ایک ہی اعتکاف تزکیہ نفس اس حد تک ضرور کر جاتا ہے کہ انسان کچھ نہ کرے نماز روزہ کا پابند تو ہو ہی جاتا ہے۔ سارے ساتھیوں کی کلاسیں لطائف والے ساتھی اور مراقبہ ثلاثہ سے مسجد نبوی تک مراقبات والی دوسری کلاس میں روحانی بیعت والے تیسری کلاس میں فناء وبقاء سے عرشی منازل تک یا منازل بالا تک چوتھی کلاس میں اپنے اپنے اساتذہ سے گروپ وار ترتیب دے لیتے ہیں یہی تربیت کارکنان تنظیم الاخوان کے عشق کو عملی میدان میں کام کرنے

کے لئے تازہ رکھتی ہے جس کو وہ دہراتے رہتے ہیں اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ عہد کئے ہوئے ہیں۔

پھر سے دیوانے تیرے ہوں گے جنوں میں جتلا
موڑ کے رکھ دیں گے پہیہ گردش ایام کا
پھر سے اس محفل کو تیرے نام سے چمکائیں گے
اپنے سینے میں بسا کر یہ تجھ کو واپس لائیں گے
خون دے کر بسایا تھا چمن تیرے لئے
اس میں پالے تھے سبھی سرو و سمن تیرے لئے
تیرے ہی روشن قدم سے اس کو پھر چمکائیں گے
پتے پتے پر تمہارا نام لکھتے جائیں گے
لا الہٰ کی تیغ کاٹے گی اندھیرے کا جگر
گنبد خضرای سے روشن ہو گی پھر اپنی سحر
اپنا خوں سیماب دے کر اتنا ہم کر جائیں گے
نام آقا کا چمن میں پھر رقم کر جائیں گے

عبدالحمید چھینہ

حوالہ

ہفت روزہ "صدائے امن"

2 تا 9 مارچ 1994ء



بابِ شخصیت

جمالِ ذات

مختلف اخبارات رسائل میں چھپنے والے تعارفی نوٹ جو انٹرویوز کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان سے ایک کا انتخاب۔

کسی "مولویانہ انداز" "عالمانہ شان" اور پیروں جیسے جاہ و جلال کا تصور لئے ان سے ملنے جائیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی۔ ان کے ہاں کسی مصنوعی انداز کی بجائے فطری سوز و گداز ہے۔ اظہار شان کی بجائے جذبہ ایمان ہے۔ جاہ و جلال کی بجائے احساسِ جمال ہے۔ کرختگی کی بجائے دلبستگی ہے۔ سٹیریو ٹائپ مصنوعی وعظ کی بجائے دل کو دل سے ہم کلام کرنے والی سادہ سادہ گفتگو ہے۔

مضبوط قد کاٹھ کے دہقان جیسے جسم و قامت، چشمے سے جھانکتی ہوئی تفکر و تدبر سے معمور آنکھوں، کشادہ پیشانی، مسنون داڑھی سے مزین پر کشش نقوش کے حامل مسکراتے ہوئے پر وقار چہرے کے ساتھ سراپا ایسا کہ جس سے کسی جری اور شجاع قبیلے کے سردار کی تمکنت شجاعت اور وجاہت جھلکتی نظر آتی ہے۔ کسی تصنع بناوٹ اور رکھ رکھاؤ سے مبرا کھری کھری اور اجلی اجلی شخصیت .... یہ ہیں پینسٹھ سالہ مولانا محمد اکرم اعوان، جو سلسلہ اویسیہ نقشبندیہ کے روحانی سربراہ بھی ہیں اور تنظیم الاخوان کے مرکزی امیر بھی!!!

روزنامہ پاکستان
سنڈے میگزین

حضرت جی

انٹرویو حضرت محمد اکرم اعوان صاحب

سوال :۔ زندگی کیا ہے اسے گزارنے کا آسان طریقہ آپ کی نظر میں کیا ہے ؟
جواب :۔ زندگی ایک عطیہ خداوندی ہے۔ یہ اتنی قیمتی ہے کہ جب ختم ہو رہی ہوتی ہے تو اس کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آدمی ایک پل خرید نہیں سکتا۔ واپس نہیں لا سکتا۔ زندگی گزارنا نہیں ہوتی زندگی انجوائے کرنے کے لئے ہے اور زندگی انجوائے تب ہو سکتی ہے جب وہ ان حدود و قیود کے مطابق گزاری جائے جو اس کی اساس ہیں۔ اگر ان حدود و قیود سے گزر جائے۔ ان سے باہر چلی جائے ان کو توڑ دے تو زندگی ' زندگی نہیں رہتی۔ قرآن کی اصطلاح میں خود زندگی موت ہو جاتی ہے۔ اور سارے مسائل کا سبب بنتی ہے۔ اللہ کریم نے بڑا آسان اصول دیا ہے۔
ترجمہ :۔ "زمین پر جو کچھ ہے وہ تمہاری خاطر ہے۔ تمہارے استعمال کے لئے ہے۔ تم اسے استعمال کر سکتے ہو"۔ اب ہر چیز حلال ہو گئی تب تک جب تک کسی چیز کا استعمال منع نہ ہو، اصل چیز یہ ہو گی دنیا کی ہر نعمت آپ استعمال کریں، پھر کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے روک دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی کے لئے مفید نہیں

کچھ حدود بنادیں گئیں کہ ایک دوسرے کے لئے جو چیزیں ہیں۔ ان میں مداخلت نہ ہو اور ایک حسن ترتیب کے ساتھ ہر کوئی اپنی اپنی سطح پر زندگی کو انجوائے کرے اسلام جو آخرت کی بات کرتا ہے تو اس سارے کی بنیاد بھی یہی زندگی ہے۔ نبی پاکؐ نے فرمایا کہ یہ زندگی آخرت کی کھیتی ہے تم وہ کچھ وہاں وصول کرو گے وہ کاٹو گے جو یہاں بوؤ گے، یہاں کا اٹھنا بیٹھنا دوستی' دشمنی تعلقات بول چال ایمانیات سے لے کر اخلاقیات تک اور اعمال سے لے کر کردار تک یہ ساری چیزیں زندگی کا حسن ہیں۔ دنیا ایک خارزار بھی ہے۔ اس میں پھل بھی ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں اور زندگی یہ ہے کہ آپ کانٹوں میں الجھنے کی بجائے اس سے پھول حاصل کر سکیں۔ اس سے پھل حاصل کر سکیں۔

سوال :۔ آپ نے زندگی کو کیسا پایا؟

جواب :۔ میری داستان بڑی عجیب ہے۔ میں نے زندگی کا ہر رخ دیکھا ہے۔ کسی کا بہت پرانا ایک شعر تھا۔

گردش ایام تیرا شکریہ
ہم نے ہر پہلو سے دنیا دیکھ لی

یہ جو میں نے ہر پہلو سے دنیا دیکھی ہے۔ اس کا مجھے ایک فائدہ بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جہاں میں اب ہوں مجھے کبھی کوئی حسرت نہیں ستاتی کہ کاش میں اس طرح کا ہوتا میں اس طرح کا ہوتا، میں مشہور ہوتا میرے پاس اقتدار ہوتا میں طاقتور ہوتا میرے پاس دولت ہوتی میں فلاں ہوتا؟ کچھ بھی نہیں، کیوں کہ میں نے زندگی کا ہر رخ دیکھا ہے۔ دوستیاں' دشمنیاں' تلخیاں' نرمیاں' بیماریاں صحت اتنے حوادث سے گزر کر میں جب یہاں حضرت کے پاس پہنچا تو میں زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور میں نے زندگی کو سوائے دکھوں' مصیبتوں اور پریشانیوں کے کچھ نہیں پایا تھا۔ یہاں پہنچ

کر مجھے احساس ہوا کہ نہیں، زندگی توراحتوں کا نام ہے۔ زندگی تو محبتوں کا نام ہے۔ زندگی تو جینے کی چیز ہے اور یہ سارا کچھ مجھے اس شعبے سے ملا جس پر میں کام کر رہا ہوں الحمد اللہ اس میں مجھے ۴۰ سے زیادہ سال ہو گئے ہیں۔ میں سن ۵۸۔ ۵۹ کا اس میں ہوں تو اب تک الحمد اللہ مجھے کوئی پریشانی کوئی دکھ کوئی تکلیف اس میں نہیں آئی اللہ کا احسان ہے۔

سوال :۔ سکون قلب کیسے ملتا ہے ؟ خواہشات کے پورے ہونے سے یا ترک خواہشات سے ؟

جواب :۔ اس کا جواب بھی اللہ کریم نے دیا ہے۔ دراصل سکون ایک کیفیت کا نام ہے۔ کسی جنس کا نام نہیں ہے۔ سکون کا لفظی مطلب تو ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ لیکن جب قلب کی بات آتی ہے۔ تو ان حقائق تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد اس کا اضطراب ختم ہو جائے۔ پریشانی ختم ہو جائے۔ اس کیفیت اس حالت 'ان حقائق تک پہنچنے کا نام سکون ہے اور میں اس کا کیا جواب دوں گا اللہ تعالیٰ نے اس کا اصول بتا دیا ہے۔

(۱)

ترجمہ 'خوب اچھی طرح جان لو کہ سکون قلب جو ہے وہ اللہ کی یاد میں ہے۔ ذکر الہی میں ہے۔

اللہ کی یاد اور ذکر الہی کے مختلف انداز جو قرآن پاک نے بتائے ہیں ان کا ماحصل لیا جائے تو یہ سمجھ آتی ہے کہ اسم ذات کا ذکر کیا جائے اپنے پروردگار کے ذاتی نام کا ذکر یعنی اللہ اللہ کی تکرار کا، کتنی ؟

ترجمہ :۔ جب بھی کر تو اتنی کر کہ دنیا سے تیرا رشتہ ایک طرح سے یعنی سوچوں کا خیالات کا کٹ کر صرف اللہ سے جڑ جائے اگر یہ کیفیات نصیب ہوں۔ تو دل کا اضطراب اور بے چینی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کسی کے رنج دینے سے بھی کلفت نہیں

ہوتی۔ اور کسی کی خوشامد کرنے سے بھی کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ پھر آدمی کو ان چیزوں کے پیچھے جو حقیقتیں ہیں ان کا ادراک ہوتا ہے پیچھے جو اسباب ہیں ان کا ادراک ہو جاتا ہے اور پھر افراد سے الجھنے کی بجائے اسے پتا ہوتا ہے کہ یہ جو ہوا ہے ایسا ہونا چاہئے تھا اور یہ چیز اسے پریشانیوں سے بچاتی ہے۔

سوال :۔ اہل اللہ کی توجہ کیسے حاصل ہوتی ہے کیا توجہ سے اندر کی تبدیلی ممکن ہے ؟

جواب :۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اہل اللہ کون ہے اور توجہ کیا ہے، اس کی تھوڑی سی چند جملوں میں وضاحت ہو جائے تو پھر بات آسان ہو جائے گی۔ یہاں جو مراد ہے اہل اللہ سے مراد ہے اور توجہ سے مراد یہ ہے کہ جو کیفیات قلب اطہر رسولؐ سے ملیں اور وہاں سے جو صحابہ کرامؓ کو نصیب ہوئیں۔ صحابہ کرامؓ سے تابعین کو پھر تبع تابعین کو اس کے بعد انسٹی ٹیوشن بن گیا، اہل اللہ سے مراد وہ بندہ ہے کہ جو ذاتی طور پر اولاً ان کیفیات کا حامل ہو اور اس درجے کا حامل ہو اس قوت کا حامل ہو کہ وہ کیفیات دوسروں میں منتقل کر سکے۔ یہ جو عمل ہے ان کیفیات کو منتقل کرنے کا اسے توجہ کہا جائے گا۔ اب رہی آپ کے سوال کی بات کہ اہل اللہ کی توجہ کیسے حاصل ہوتی ہے تو اس کا بنیادی جو نقطہ ہے وہ جو قرآن پاک نے فرما دیا۔

ترجمہ :۔ انابت ہوتی ہے انسان اپنے دل کی گہرائی میں کوئی فیصلہ کرے کہ مجھے اللہ کے حضور جانا ہے۔ مجھے اللہ کے قرب کو پانا ہے میری منزل میرا رب ہے۔

سوال :۔ یہ فیصلہ بندہ خود کرتا ہے ؟

جواب :۔ ہاں یہ بندہ خود کرتا ہے۔ اس کا اختیار ہے اس کے پاس، یہ بڑی عجیب بات ہے بس یہی کچھ اختیار اس کے پاس ہے۔ باقی سب اس کے شاخسانے ہیں جب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اللہ کی ضرورت نہیں ہے تو پھر اس کے باقی فیصلوں کا مدار اس

پر ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کس سے مل رہا ہے کونسی غلطی کر رہا ہے کہاں جا رہا ہے۔ جب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ نہیں مجھے اللہ کے پاس جانا ہے تو اس کی زندگی کے سارے فیصلے اس سے متاثر ہوں گے۔ اللہ نے یہ طے کر لیا ہے کہ جب کوئی دل میں خلوص کے ساتھ یہ طے کر لے گا کہ مجھے اللہ کے پاس جانا ہے۔ اللہ کے قرب کو پانا ہے تو وہ اس کے لئے ہدایت کے راستے کھول دیتا ہے۔

ترجمہ :۔ اپنی طرف اسے راستہ دکھا دیتا ہے جس کے دل میں انابت آجائے انابت ہوتی ہے خلوص کے ساتھ طلب الٰہی۔ اب یہاں مفسرین لکھتے ہیں کہ کیسے راستے کی جانب۔ فرمایا اپنے ان بندوں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ جو اس کے مقرب ہوتے ہیں اور اس کا رابطہ کرا دیتا ہے۔ جس سے برکات نصیب ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

سوال :۔ تبدیلی آجاتی ہے ؟

جواب :۔ بہت بڑی تبدیلی آتی ہے۔ بہت بڑی۔

سوال :۔ یقین اور ایمان میں کیا فرق ہے۔ کیا یقین کی رسائی ایمان تک ہو سکتی ہے ؟

جواب :۔ میرا جو آج کا درس ہے اسی سوال پر ہے یقین کی رسائی ایمان تک ہونا ثابت نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا ایمان کیا یقین کی حدوں تک ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ جسے ہم ایمان کہتے ہیں کیا وہ یقین کی حدوں تک ہے۔ دیکھیں ناں قرآن پاک نے ساری بات بتائی کہ قرآن کتاب ہدائت ہے اس پر کسی شے کی گنجائش نہیں ہے یہ ان لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں دنیا کی چیزوں میں الجھتے نہیں بلکہ دوسروں کے فائدے کے لئے خرچ کرتے ہیں پھر فرمایا غائبانہ ان حقیقتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ جو آپ پر نازل ہوئیں یا آپ سے پہلے نازل ہوئیں اب اس میں ساری باتیں آگئیں۔ آخرت بھی آگئی حشر نشر بھی آگیا دنیا بھی آگئی۔

ترجمہ :۔"یہ سارا ایمان ہے ان کا لیکن اس کے بعد جو ہے آخرت پر یقین ہے "یقین کے مختلف مدارج ہیں مثلاً کوئی ہمیں بتاتا ہے کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم مان لیتے ہیں یقین کا ایک درجہ ہے ایمان، یہی ایمان ہے۔ یہی یقین کا ایک درجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں۔ شور شرابہ سنتے ہیں ہم کہتے ہیں وہاں آگ لگی ہے۔ یہ اس سے مضبوط ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ ہم وہاں دیکھ لیتے ہیں کہ آگ لگی ہوئی ہے چیزیں جل رہی ہیں۔ اسے عین الیقین کہتے ہیں۔ یعنی کہ ایسا یقین جو آنکھوں دیکھا ہو ایک درجہ اس سے آگے ہے جو مشہود ہے اور وہ ہے جو اس آگ میں گر گیا ہوا سے بمشکل نکالا جائے یا وہ تڑپ کر نکلے اس کا آدھا بدن جل گیا ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں جل گئے ہوں اس کے کپڑے جل گئے ہوں بھن جل کر نکلے۔ جو یقین آگ کی تلخی کا اسے ہوگا وہ مطلوب ہے اب یہ کیسے ہو، اصل بات یہی ہے کہ جو کچھ اللہ کا کلام ہے۔ یہ نرا فلسفہ نہیں۔ اس کے ساتھ کیفیات ہیں جو کچھ رسولؐ نے فرمایا اس کے ساتھ کیفیات ہیں اور وہ بدن پر وارد کی جا سکتی ہیں۔ روح پر وارد کی جا سکتی ہیں۔ ان کیفیات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک ادراک حاصل ہوتا ہے اللہ کے بندوں کو کہ ان کے قلوب صاف ہوتے ہیں ان کیفیات تک ان کی رسائی ہوتی ہے تو ایسا عجیب حال ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین عطار کی توجہ کا سبب بنا، اور سنا ہے کہ وہ معروف عطار تھے تاریخ گواہ ہے۔ دوائیں بیچتے تھے بہت رش ہوتا تھا ان کے پاس۔ ان دنوں یہ ایلوپیتھی تو ہوتی نہیں تھی۔ بعض نسخے ہوتے تھے، عطار کی بہت بڑی دکان تھی ان کی، ایک درویش ۔۔ آدمی تھا اسے کچھ چیز چاہیے تھی۔ مگر اس کی باری ہی نہیں آ رہی تھی بڑے بڑے نسخوں والے لوگ بیٹھے تھے رش اس قدر تھا کہ شیخ فریدالدین عطار بھی ملازموں کے ساتھ دکان پر مصروف تھے۔ اس درویش منش آدمی نے کہا بھئی فریدالدین تم اتنے مصروف ہو یوں لگتا ہے جیسے تمہیں تو موت بھی بھول گئی

ہو آخر میں بھی انسان ہوں مجھے تھوڑی سی چیز چاہئے۔ ٹھیک ہے بڑے بڑے گاہکوں کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں۔ تم اتنے مصروف ہو کہ تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمہیں مرنا بھی ہے۔ شیخ نے غصے سے کہا مرنا تو تمہیں بھی ہے، انہوں نے کہا ہاں مجھے بھی مرنا ہے۔ شیخ نے جواب دیا تو جیسے تو مرے گا میں بھی مرلوں گا، تو درویش نے کہا نہیں میں تو بڑے آرام سے مر جاؤں گا۔ دیکھو میں تجھے بتاتا ہوں دوکان سے باہر نکلا اپنی چادر زمین پر رکھی اس پر سر رکھ "اشہدان لا اللہ الا للہ کہا" کچھ دیر نہیں اٹھا جا کر دیکھا تو وہ مر چکا تھا اس واقعہ نے ان کی زندگی تبدیل کر دی۔ وہ اہل اللہ کی خدمت میں گئے توجہ حاصل کی اور فرید الدین عطار معروف ولی اللہ ہیں۔ تو یقین کی وہ قوت جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے اسے اپنے اوپر وارد کر لے مثلاً قرآن نے کہا

ترجمہ :۔ اس طرح جیئو کہ تم مرنے سے پہلے موت کی حقیقتوں کو پا سکو مرنے سے پہلے موت تمہارے لئے عجیب نہ ہو۔ نبی پاکؐ نے فرمایا۔

ترجمہ '۔ دنیا میں اس طرح رہو جس طرح مسافر ہوتے ہیں۔ یا راہ چلنے والا راہرو ہوتا ہے کہ کسی جگہ ستانے کے لئے رک گیا اس کی منزل آگے ہے اسے جانا ہے اور اپنے آپ کو اہل قبور میں شمار کرو" ہمارے ہاں اس سلسلے میں بلکہ باقی سلاسل میں بھی یہ باقاعدہ مراقبہ کرایا جاتا ہے۔ جس میں آدمی موت کو وارد ہوتے دیکھتا ہے۔ روح کو جاتے دیکھتا ہے۔ دوسروں کے کندھوں پر اپنا جنازہ دیکھتا ہے۔ وہ حالات اس کی قبر کہاں ہو گی۔ قبر میں منکر نکیرین کیسے آئیں گے قبر کے بعد میدان حشر ہے یہ ساری حقیقتیں نظر سے گزرتی ہیں۔ اگر یہ کیفیات وارد کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے تو یہ یقین ہے یہی ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔

سوال :۔ آپ نے اللہ کو کیسا پایا؟

جواب :۔ کراچی میں میرا ایک گھنٹے کا ایک بیان تھا، سامعین عام لوگ تھے۔ ایک بزرگ نے کہا آج آپ نے ایک گھنٹہ بات کی اور ہمیں اللہ سے ڈرایا ہی نہیں۔ کوئی خوف خدا کی بات کوئی اللہ سے ڈرانے والی بات۔ میں نے کہا جی میری مجبوری ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) مجھے ڈراتا ہی نہیں میں آپ کو اس سے کیوں ڈراؤں۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ میں نے آپ کو پیار کی محبت کی باتیں بتائیں۔ میں نے آپ کو دعوت دی کہ اللہ سے پیار کرو اللہ سے محبت کرو کہ وہ محبت کرنے والا ہے۔ وہ خالق ہے ہمارے اور اکات سے بالاتر ہے۔ لیکن مشت غبار کے پیار کی حیثیت کو سمجھتا ہے۔ قبول کرتا ہے۔

ترجمہ :۔ "جو کوئی اس سے پیار کرتا ہے اس کے پیار کو قبول کرتا ہے" وہ جانتا ہے کہ یہ میرے لئے روتا ہے یہ میرے لئے تڑپتا ہے اور یہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اللہ کو سب سے بڑھ کر کریم محبت کرنے والا محبت دینے والا اور محبت قبول کرنے والا پایا۔

سوال :۔ کیا یہ راستہ آپ نے خود چنا ہے یا طے شدہ لگتا ہے ؟

جواب :۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں زندگی کی تلخیاں اور زندگی کے مصائب اور اس کے بے شمار نشیب و فراز دیکھ چکا ہوں۔ میں نے بڑی جدوجہد کی ہے میں نے بہت ہمت کی ہے۔ میں نے بہت محنت کی ہے۔ میں بڑا ضدی 'تگڑا' ڈٹ جانے والا۔ محنت کرنے والا مجاہدے والا آدمی ہوں۔ لیکن میں جو کچھ کرتا تھا۔ وہ میرے سامنے ایک نئی تلخی پیدا کر دیتا تھا۔ پھر کچھ میں فیصلے کرتا تھا۔ بڑا عرصہ میرے فیصلے جو میں کرتا تھا چلتے رہے پھر مجھے سمجھ آئی نہیں یہ محض اتفاق تھا فیصلے میں نافذ نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا کوئی ایسی چیز ہے جو انہیں توڑ دیتی ہے۔ مجھ میں شکستگی سی آئی ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ میری انا کی شکست ہوئی۔ میں نے سوچا کون ہے ایسا، پھر میرا دھیان اللہ کی

طرف گیا۔ پھر میں بزرگوں کے پاس گیا۔ پیروں کے پاس گیا۔ وہاں میں نے چور پائے' عیار پائے' زر کے طلب گار اقتدار کے بھو کے ان ساری چیزوں کی میرے لئے کوئی حیثیت نہیں تھی۔

میں کہتا تھا سال بھر مکر کرکے دو دو روپے شرینی لینے کی بجائے ، مندوق پکڑو' ایک بس لوٹ لو آرام سے کھاؤ پیئو۔ دو دو روپے سے کیا بنے گا۔ مگر ان میں ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر میری ملاقات حضرتؒ سے اتفاقاً ہوئی اور یہ ملاقات ۲۵ طویل برسوں پر محیط ہوگئی۔ میں اٹھ نہیں سکا وہاں سے ، یہ اللہ کا ترتیب دیا ہوا پروگرام تھا کیونکہ میں اتفاقات کا قائل نہیں ہوں۔ اتفاق ہم اسے کہتے ہیں یا حادثہ اسے کہتے ہیں۔ جس کے پیچھے جو سبب ہوگا ہماری عقل یا ہماری نظر میں نہیں ہوگا مگر پیچھے سبب ہوتا ہے۔ دست قدرت ہوتا ہے۔ اس کا پروگرام ہوتا ہے اس کی کائنات میں اس کے پروگرام کے باہر کچھ نہیں ہوتا۔ الحمد اللہ اللہ نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ میں سمجھتا ہوں اسی کا فیصلہ تھا اور بہت خوبصورت فیصلہ تھا بہت حسین فیصلہ تھا۔ مجھے اب سمجھ آتی ہے۔ کہ یہ جتنی پریشانیوں' تکلیفوں' دکھوں سے میں گزرا ہوں یہ میری ضرورت تھیں۔ آج وہ ساری چیزیں میرے لئے معاون ہیں۔ الحمد للہ۔

سوال :۔ عشق کا اصل مطلب کیا ہے؟

جواب :۔ اس نام کی بہت سی تعبیریں ہیں بہت سی تشریحات ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن ایک مصرعہ ایک جملہ جو ایک عرب شاعر نے کہا تھا میری ذاتی رائے میں وہ اس کا مفہوم ہے۔

ترجمہ : "محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے اس کا غیر مشروط غلام بن جاتا ہے۔ چوں چراں باقی نہیں رہتی" میری ذاتی رائے میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس سے ہم عشق کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ وہاں ہمارے دلائل' ہماری پسند' ہماری خواہشات'

ہماری آرزوئیں دم توڑ دیں اور وہی ہماری پسند ہو جو وہ چاہے۔ ایک بہت مزے کا عربی کا شعر ہے۔

ترجمہ: میں اس کے قرب کا طالب ہوں جبکہ وہ مجھے دور رکھ کر خوش ہے میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ مجھے ہجر میں رکھ کر خوش ہے"

ترجمہ: "جو کچھ وہ چاہتا ہے اس پہ میں نے اپنی خواہش کی دستبرداری اختیار کی میں وہی کروں گا جو وہ چاہے گا" تو جہاں جا کر اپنی خواہشات اپنے سوال اپنا لاجک اپنی آرزوئیں دم توڑ جائیں اور تمنا یہ بن جائے کہ جو محبوب چاہتا ہے مجھے وہ کرنا ہے وہ عشق کہلاتا ہے۔

سوال:۔ اصل راستہ کیا ہے وہ راستہ جسے سچ کا راستہ کہتے ہیں، کوشش سے ملتا ہے یا تقدیر سے؟

جواب:۔ اصل راستہ ایک ہے۔ اسی ایک راستے کو جس کا ایک سرا اللہ کی ذات سے ملا ہوا ہے۔ ہر نبی اس راستے کی شمع ہے۔ محمدؐ سراج منیر ہیں ایسا چراغ جو روشنیاں بانٹتا ہے آپؐ کو بھی اسی راستے کا چراغ فرمایا گیا ہے۔ اصل راستہ وہی ہے جو بندے کو حقیقت آشنا کر دے سب سے بڑی حقیقت اللہ کی ذات ہے اب اس میں نماز روزہ عبادات کی حیثیت ثانوی آجاتی ہے کہ وہ کیفیت وہ ذوق نصیب ہو اور پھر یہ پتا چلے کہ ہر سجدے سے اس راستے کا ایک قدم طے ہوتا ہے۔ پھر سجدوں میں مزا آجاتا ہے پھر یہ پتا چلے کہ ایثار کرنے سے یا یہ کام کرنے سے میں اس راستے میں تھوڑا آگے چلا جاؤں گا تو تب لطف آتا ہے عبادات کا معاملات، اخلاقیات کا اگر وہ سمت درست ہو جائے اور وہ راستہ اور اس کی بنیادی بات یہ ہے کہ سارے دروازے اس راستے کے بند ہو چکے ہوں۔ سوائے اتباع محمد رسولؐ کے "کسی یکجائی سے ملت احمد مرسل کو مقامی کر لو" ایک ہی راستہ ہے۔

سوال :۔ سوال میں یہ بھی تھا کہ یہ راستہ کوشش سے ملتا ہے یا تقدیر سے ؟

جواب :۔ دونوں باتیں ہیں۔ کوشش بھی ہے اور تقدیر بھی میں نے پہلے آپ سے عرض کیا ہے کہ بندے کا اختیار کیا ہے۔ کیا وہ اپنی مرضی سے پیدا ہو سکتا ہے نہیں۔ اپنی مرضی سے مر نہیں سکتا۔ اپنی مرضی سے بیماری نہیں اپنی مرضی سے پسند کی شکل نہیں بنا سکتا اپنی پسند سے دماغ نہیں بنا سکتا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مجبور ہے بس ہے بے چارہ، ایک فیصلہ ہے اس کے پاس

(ترجمہ :)

یہ فیصلہ نرا انسان کا ہے اس میں اللہ کا شکر کرنا ہے یا اس کی ناشکری کرنی ہے۔ جب یہ طے کرتا ہے۔ اگر شکر کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ فیصلے میں کتنی قوت ہے۔ دیکھیں نہ آپ ایک گولی چلاتے ہیں اس میں جتنا بارود ہو تو اتنی دور تک جائے گی سو گز تک جائے گی ہزار گز تک جائے گی دس ہزار گز تک جائے گی۔ ایک پاور ہے نا اس میں۔ آخر میں پاور کام کرتی ہے۔ اس فیصلے میں کتنی طاقت ہے۔ جتنی اس فیصلے میں پاور ہے اتنا دور وہ چلا جائے گا۔ اللہ اسے لے جائے گا اور اگر اس نے یقین سے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے اللہ کی طرف جانا ہے اللہ اس کے اسباب پیدا فرما دے گا آگے تقدیر کا کام ہے وہ اس کا ساتھ دیتی چلی جائے گی۔

سوال :۔ قسمت بنانے میں انسان کی اپنی محنت و کوشش کا کتنا ہاتھ ہے ؟

جواب :۔ قسمت سے مراد دنیاوی اسباب و وسائل ہیں یا؟

سوال :۔ میرا مطلب تقدیر اور تدبیر سے ہے ؟

جواب :۔ تقدیر کیا ہے اور تدبیر کیا ہے۔ تقدیر دو قسم کی ہے قضا جسے کہتے ہیں تقدیر جسے کہتے ہیں اس کی دو اقسام ہیں۔ ایک ہے قضائے مبرم۔ ایسے فیصلے جو ٹلتے نہیں جو طے شدہ ہیں اور دوسری ہے قضائے معلق وہ تقدیر جس کے فیصلے معلق رہتے ہیں۔

انسانی کردار کے مطابق نافذ ہوتے ہیں۔ مثلاً اب دیکھیں ایک پوری قوم غرق ہو گئی ان سب کی موت ازل سے ایک دن مقدر نہیں تھی لیکن قضا معلق تھی۔ اللہ کی گرفت میں آئے، گناہ اس لیول تک پہنچے یہ ان کا کردار تھا کہ اس کی وجہ سے وہ قضائے معلق ان پر مسلط ہو گئی تو تدبیر جو ہے یا حسنِ تدبیر جو ہے وہ قضائے معلق کو تبدیل کرتی ہے جو فیصلے انسان کے کردار پر نافذ ہونے والے ہیں، اگر وہ سدھر جاتا ہے فیصلے بدل جاتے ہیں نہیں سدھرتا تو فیصلے بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت یونسؑ کی قوم، جسے حضرت یونسؑ چھوڑ کر چلے گئے کہ اب تم پر عذاب آئے گا۔ انہوں نے توبہ کر لی عذاب نہیں آیا۔ تو تدبیر کا دخل قضائے معلق کو اس کے نفاذ یا اس کی تبدیلی میں ہے، البتہ جو مبرم ہیں جو فیصلے نہ ٹلنے والے ہیں جو طے شدہ ہیں ان میں تدبیر بے اثر ہے۔

سوال :۔ کیا محبت کا تعلق ارادے سے ہے یا بے اختیاری سے۔ اگر بے اختیاری ہے تو انسان کا اس میں کتنا دخل ہے ؟

جواب :۔ محبت کبھی ارادے سے نہیں ہوتی۔ ارادے سے لین دین ہوتا ہے تجارت ہوتی ہے۔ بہت سی محبتیں جنہیں ہم محبت کہتے ہیں۔ وہ محبت نہیں ہے۔ باہمی مفادات کا لین دین ہے۔ ہمیں کسی سے کچھ چاہئے ہوتا ہے اسے ہم سے کچھ چاہئے ہوتا ہے وہ اپنے فائدے کی چیز ہم سے لیتا ہے ہم اپنے فائدے کی چیز اس سے لیتے ہیں۔ جیسے پیسہ دے کر غلہ خرید لیا کپڑا خرید لیا۔ جوتا خرید لیا اسی طرح کچھ جذبات کا تبادلہ کر لیا یا کچھ مادی فوائد دوستی یا اس کے پردے میں ایک دوسرے کے مفادات اکٹھے ہو گئے۔ تو یہ محبت نہیں یہ ضرورتیں ہیں، یہی بات ہے تو محبت ارادوں سے نہیں ہوتی محبت ایک حادثہ ہے جو ہو جاتا ہے۔ محبت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بندے کی اللہ سے محبت اور ہے بندے کی رسولؐ سے محبت اور ہے بندے سے تم

ہندے سے محبت اور ہے عورت اور مرد کی محبت ایک اور شئے ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں اس میں وہ پہلو بھی آ سکتا ہے جو ہندے کو ہندے سے ہوتی ہے اور ایک فطری تخلیقی پہلو بھی ہے۔ جس پر سائنس اب پہنچی ہے اور جس سے نبی پاکؐ نے ۱۴۰۰ سال پہلے آگاہ فرمایا تھا۔ اب یہ جدید ریسرچ آئی ہے، تو جس طرح اینیمل کی لائف میں ہمیں ملتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جانوروں میں بھی سلیکشن ہوتی ہے۔ کوئی فی میل کسی گھٹیا یا کمزور میل کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ انسانوں کی فریکونسی ہے۔ یہ جو محبت ہے اس کو جہاں سے ہم چھیڑیں میل فی میل پر رکتی ہے۔ جہاں سے اس فسانے کو چھیڑا جائے بات وہاں پہنچتی ہے۔ تو اس میں میل اور فی میل میں فریکونسی ہے۔ اس کے دل سے ایک چیز اٹھتی ہے ایک کیفیت اٹھتی ہے۔ جو اس کی آنکھوں سے منعکس ہوتی ہے۔ یہ جو قرآن نے پردے کا کہا ہے۔

ترجمہ :۔ نگاہوں کو جا کر رکھو نیچا رکھیں، اسی طرح مردوں کو بھی کہا کہ نگاہیں جا کر رکھو، یہ جو کیفیات آتی ہیں آنکھوں سے دل کے راستے، اگر میل فی میل کی نظریں دوچار ہوں اور ان کی فریکونسی قریب تر ہو۔ جتنی قریب ہو مثلاً یہ کہ ایک کی دس دوسرے کی آٹھ تو اس نسبت سے انہیں ایک دوسرے سے رغبت ہو جائے گی۔ اگر ایک کی دس ہے دوسرے کی نو ہے تو اور زیادہ محبت ہو گئی اور اگر دونوں کی دس دس ہے تو پھر لیلیٰ مجنوں ہوں گے۔ سسی پنوں ہوں گے ہیر رانجھا ہوں گے۔ ایک فطری چیز ہے جو اپنا مدمقابل تلاش کرتی ہے۔ اس کی مختلف اقسام ہیں کہیں ہمیں اولاد سے محبت ہے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں اولاد سے محبت ہوتی ہے، اکثریت اولاد سے بزنس یا بیوپار کرتی ہے۔ انہیں توقع ہوتی ہے کہ انہیں پڑھائیں گے لکھائیں گے تو ہمیں پیسہ ملے گا جب وہ چھ پیسہ کما کر نہیں لاتا محبتیں کافور ہو جاتی

ہیں دوستوں سے محبت ہوتی ہے جب ان سے وابستہ توقع ٹوٹ جاتی ہے دوستی ختم ہو جاتی ہے سب بزنس ہے، ہاں کہیں کہیں محبت ہے جہاں لوگ نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر خالص محبت کرتے ہیں یہ دوستوں میں بھی ہے والدین اور اولاد میں بھی اور میل فی میل میں بھی ہے۔

سوال : تصوف کا اصل مطلب کیا ہے ؟ کیا تصوف سے زندگی آسان بنائی جا سکتی ہے ؟

جواب : تصوف کے بہت سے مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ میری رائے میں یہ ترجمہ ہے تزکیہ کا۔ قرآن نے عربی میں یہ لفظ تزکیہ کے طور پر استعمال کیا ہے قرآن کا سب سے پہلے جو ترجمہ ہوا ہے وہ فارسی میں ہوا ہے۔ ایران نے بڑے بڑے نامور محدثین اور قرآن پاک کے مفسرین پیدا کئے ہیں، ایران میں ترجمے اور تفسیریں لکھی گئیں توانہوں نے تزکیئے کو تصوف لکھا تزکیئے سے مراد ہے خاص دل کی باطن کی صفائی اور تصوف سے بھی مراد صفائے باطن ہے، صفائے قلب ہے۔ قلب کی صفائی سے مراد یہ ہے کہ قلب ایسا آئینہ بن جائے جس میں برکات نبوت یا عادات نبیؐ اس میں منعکس ہوں۔ اوراس کے گرد وہ روشنی کے ہالے وہ نور کے دائرے پھیلیں۔

زندگی کی آسانی کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ آپ دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا سبب نہ ہوں بلکہ دوسروں کو آسانیاں دے سکیں۔ اگر کوئی شخص دوسروں کی آسانیوں کا اہتمام نہیں کر سکتا تو وہ اپنے لئے زندگی میں کبھی آسانیاں پا نہیں سکتا۔ یہ اصول ہے فطرت کا۔ تو تصوف سے مراد یہ ہے کہ طریقے یا سلیقے سے ذکر اذکار کر کے محنت کر کے توجہ حاصل کر کے، وہ کیفیت ڈویلپ کی جائے وہ کیفیت حاصل کی جائے کہ اس میں کوئی معمولی سی لیکن اخلاق کریمانہ کا عکس اس میں نظر آئے ؟ اخلاق کریمانہ کا عکس حسین کرے گا تو وہ ہر ایک کی اپنی

حیثیت کے مطابق۔ لیکن کوئی نہ کوئی حسن جمال محمدیؐ کا اس میں آئے اور پھر وہ روشنی کا ہالہ بنے اور اپنے اردگرد کے ماحول کو برکات نبویؐ سے منور کرے، پھر وہ روشنی دوسروں کو سکون دے گی دوسروں کو دم لینے کی جگہ دے گی دوسروں میں جینے کا حوصلہ پیدا کرے گی دوسروں کے دکھ بٹانے کا طریقہ عطا کرے گی اور جب دوسروں کو آسانیاں ملیں گی تو اس شخص کی زندگی آسانیوں سے بھر جائے گی اگر کوئی دوسروں کو آسانیاں نہیں دے سکتا تو اپنے لئے پا نہیں سکتا۔

سوال :۔ اس سوال کا تعلق حضرت سلطان باہوؒ کے شعر سے ہے

"ایمان سلامت ہر کوئی منگے عشق سلامت کوئی ہو" عشق کی سلامتی مانگنے والے کیا ایمان سے دور ہو جاتے ہیں؟

جواب :۔ میرے خیال میں اس کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ حضرت سلطان باہو بہت بڑے عاشق تھے، اس حد تک کہ ان کا ہر بال سراپا عشق بن گیا تھا۔ ان کی کیفیات اگر عالم برزخ میں بھی دیکھی جائیں تو ان کا وجود گویا آج بھی سراپا عشق ہے، ان کی کہانی بڑی عجیب و غریب ہے جو میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا بہت سے لوگوں کے نفع نقصان اس سے وابستہ ہیں۔ اس بات کو رہنے دیں، ان کا عالم یہ ہے کہ انہیں برزخ میں بھی میں نے آج تک بیٹھے ہوئے یا آرام کے حال میں نہیں دیکھا۔ اسی طلب کو لے کر کھڑے ہیں اس کی (اللہ تعالیٰ) بارگاہ میں۔ ایمان کی سلامتی کی جو بات انہوں نے کی ہے ۔وہ یہ ہے کہ اس حد تک جو بندہ رہتا ہے اس کی اخروی نجات ہو جائے اور بس، یہ ایمان سلامت ہے اتنا یقین اتنا ایمان ہو اتنے اعمال ہوں کہ حشر میں کامیاب ہو جائے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ محشر میں کامیاب ہو جانا۔ لیکن دو عالم سے اٹھ کر اسی کو پانا اسی (اللہ تعالیٰ) کی خواہش کرنا اسی کی طلب میں سرگرداں ہو جانا۔ اور دنیا و آخرت سے بالاتر ہو جانا۔ یہ عشق کی سلامتی کی بات ہے جس کی وہ بات کرتے ہیں، یہ

ان کا حال ہے جو وہ کہہ رہے ہیں یہ ان کی کیفیت ان پر وارد ہے وہ اس میں آج بھی مبتلا ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں اور ایسے حوصلے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے کہا تھا کہ دنیا کے طلب گار کتے ہیں۔ آخرت کے طلب گار مونث ہیں یعنی زنانے ہیں اور مرد وہ ہے جو اللہ کا طالب ہو۔

سوال :۔ کیا ذکر سے اندر کی دنیا میں تبدیلی آسکتی ہے ؟

جواب :۔ یقیناً بہت بڑی تبدیلی آسکتی ہے آتی ہے۔ ہم نے ہزاروں لوگوں کو تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ بیٹھے تہجد پڑھتے ہیں ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو کلبوں سے میخانوں سے جوا خانوں سے یورپ کی روشنیوں سے امریکہ کے پچز سے آئے ہیں۔

سوال :۔ فی زمانہ اہل اللہ کی ضرورت ہے یا اہل خرد کی ؟

جواب :۔ جو اہل اللہ نہیں ہے اہل خرد نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا پاگلوں کی دنیا ہے آپ نے نہیں دیکھا کہ یہ قیام امن کے لئے ایٹم بم بناتے ہیں۔ دنیا کا فلسفہ آپ نے دیکھا۔ یہ امن کے قیام کے لئے تباہی کے سامان پیدا کرتے ہیں۔ قتل و غارت کرتے ہیں کہ امن قائم کرنا ہے۔ ظلم کرتے ہیں کہ یہ عدل ہو رہا ہے یہ دیوانوں کی دنیا ہے۔ اہل خرد میں صرف اہل اللہ کو سمجھتا ہوں اور یاد رکھیں اللہ اللہ کرنے سے ذکر کرنے سے استعداد ہے جو فطری ہے عقل کی بھی شعور کی بھی فکر کی بھی اس کی صلاحیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں قوت کار اس قدر بڑھ جاتی ہے اور آدمی اتنا کام کر لیتا ہے کہ جتنا ۵۰ آدمی مل کے بھی نہیں کر سکتے۔ کام میں برکت آجاتی ہے۔ اوقات میں برکت آجاتی ہے۔ جو کام آدمی ہفتے میں نہیں کر تا وہ دو گھنٹے میں کر لیتا ہے اس کی بے پناہ برکات ہیں اور بے شمار خوبصورت تبدیلیاں آتی ہیں۔

سوال :۔ یہ آپ سے متعلق سوال ہے آپ بہت سے شعبہ ہائے زندگی میں کام کر

رہے ہیں ؟ اگر آپ سے کہا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں تو آپ کا انتخاب کیا ہوگا ؟

جواب :۔ میں نے ایک دفعہ گننا چاہا کسی نے مجھے احساس دلایا اور اس نے مجھ پر طنز کیا کہ تم خود نمائی کا شکار ہو۔ لوگوں پر خود کو مسلط کرنا چاہتے ہو۔ کیا وجہ ہے کہ ہر شعبے میں تم نے دخل اندازی کر رکھی ہے۔ تم صحافت میں بھی ہو تم المرشد بھی چلاتے ہو۔ تم خطیب بھی ہو تم جمعے بھی پڑھاتے ہو تم پیر بھی ہو تم اللہ اللہ بھی کراتے ہو۔ تم نے الفلاح فاؤنڈیشن بنا رکھی ہے الاخوان بنا رکھی ہے سلسلہ نقشبندیہ بھی چلاتے ہو۔ بینک بنا رکھا ہے۔ تم سکول چلا رہے ہو تم کیا مصیبت ہو۔ تو اس وقت جو میں نے جواب دیا۔ کالم نگار ہارون الرشید اس محفل میں موجود تھے۔ انہوں نے اس کا ذکر اپنے کالم میں کیا ہے۔ یہ واقعہ انہوں نے اپنے کالم میں لکھا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو وہ کالم مل جائے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ مختلف جہتیں نہیں ہیں۔ میری اصل جہت طلب الٰہی ہے۔ عشق الٰہی ہے۔ یہ باقی جتنی چیزیں ہیں اس طرف سے مجھ پہ آجاتی ہیں۔ یہ بھی کر لوں وہ بھی کر لوں میں نہیں سوچتا کہ میں کیا کر رہا ہوں اس لئے کہ جو کہہ رہا ہے وہ کرنے کی طاقت بھی دے دیتا ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں کہیں کوئی شعبہ ہے جس میں انسانیت کی خدمت، کافر و مومن کی تمیز کے بغیر، کوئی شعبہ ہے جس میں معاشی اصلاحات کا کام ہے، کوئی شعبہ ہے جو تعلیمی اصلاحات کا ہے، کوئی رفاہ عامہ کا ہے، کوئی شعبہ سیاست کا ہے۔ کوئی ذکر اذکار کا ہے۔ تو یہ سارے شعبے اس ایک راستے کے زاد راہ ہیں جس پر میں جا رہا ہوں۔ اب کوئی مسافر جو جا رہا ہے۔ اسے راستے میں اخروٹ ملتے ہیں لے لیتا ہے۔ پانی کی چھاگل ملتی ہے اٹھا لیتا ہے روٹیاں ملتی ہیں لے لیتا ہے یہ اس کا زاد راہ ہے بوجھ نہیں ہے۔ تو میں دراصل ایک ہی سمت جا رہا ہوں یہ سارا میرا زاد راہ ہے۔ جو آپ کو منتشر نظر آتا ہے۔

سوال :۔ آپ کا نظریہ حیات کیا ہے ؟

جواب :۔ میرا نظریہ حیات یہ ہے کہ اس فانی زمین پر اتنے گہرے نقش چھوڑے جائیں کہ جب تک یہ رہے ہمارے نقش باقی رہیں۔ محبت کے نقش۔ بھلائی کے نقش۔ احسان کے نقش۔ فرعونیت اور ظلم و تشدد کے نہیں۔

سوال :۔ اب یہ سوال آپ کی شاعری سے متعلق ہے آپ خوبصورت شاعری کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری کی تفہیم کیا ہے ؟

جواب :۔ میں شاعر نہیں ہوں۔ لیکن میں شعر کہتا ہوں۔ مجھے شعروں کے قواعد و ضوابط نہیں آتے۔ مجھے شعروں کے اوزان کا نہیں پتا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا میں نے اس بارے میں کچھ نہیں پڑھا۔ مجھے پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ میرے پاس وقت ہی نہیں ہے، اس لئے میں جو شعر کہتا ہوں' یہ شاعری نہیں ہے یہ میرا حال ہوتا ہے۔ کیفیات ہوتی ہیں واردات ہوتی ہے میں ٹیبل پہ بیٹھا ہوں میں کھانا کھا رہا ہوں، میں ایک مصرعہ کہتا ہوں پھر دوسرا کہتا ہوں پھر تیسرا چوتھا اس طرح غزل بن جاتی ہے، ٹیبل پہ بیٹھا ہوں دفتر میں بیٹھا ہوں لوگ بیٹھے ہیں میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ گنگناتا جاتا ہوں لکھتا جاتا ہوں۔ غزل بن جاتی ہے، گاڑی میں سفر کر رہا ہوں اس وقت فارغ ہوں' کسی کیفیت میں جب چلا جاتا ہوں۔ میں جس حال کا ہدہ ہوں وہ مجھ پر وارد ہو جاتی ہے کسی سے بات کر لیتا ہوں کسی کو دیکھ لیتا ہوں کسی کو چھو لیتا ہوں۔ کچھ پا لیتا ہوں کچھ دے دیتا ہوں۔ عجیب سا قصہ ہے میرا' پھر وہ باتیں جو میری کسی سے ہوتی ہیں کوئی مجھ سے کرتا ہے پھر وہ غزلوں میں شعروں میں نظموں میں ڈھل جاتی ہیں۔ جب کوئی میرے پاس نہیں ہوتا کوئی نہ کوئی میرے پاس ہوتا ہے۔ جو ہوتا ہے اس سے جو بات ہوتی ہے وہ غزل بن جاتی ہے۔ شعر بن جاتا ہے کہانی بن جاتی ہے، کہیں درد و الم میں ڈھل جاتی ہے تو کبھی لڑائی میں

آجاتی ہے تو کبھی ایثار میں آجاتی ہے۔ کبھی الفت و محبت میں آجاتی ہے تو یہ اس طرح چلتا رہتا ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں کہ مجھے شاعری کے لئے قواعد پڑھنا پڑھیں کچھ سوچنا پڑے کچھ سمجھنا پڑے، کچھ محنت کرنا پڑے، نہیں ایسا کچھ بھی نہیں اور مجھے شاعر ہونے کا کوئی دعویٰ بھی نہیں ہے۔

سوال :۔ کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کو رک کر سوچنے پر مجبور کیا ہو؟

جواب :۔ ایک واقعہ ہوتا تو بتا دیتا میری زندگی واقعات کا ایک تسلسل ہے اور ہر واقعہ ایک زینہ ہے۔ ایک سیڑھی ہے، میں جہاں کھڑا ہوں میں وہاں سے وہ سیڑھیاں گرا نہیں سکتا۔ ۶۵ سال پر پھیلا ایک ایک قدم ایک یادگار ہے اور مجھے ساری یادیں بڑی عزیز ہیں یہ میری سیڑھیاں ہیں ان میں سے میں کسی کو توڑ اور کھو نہیں سکتا۔ میں نے زندگی سے سیکھا ہے زندگی کو لباس کی طرح اپنے اوپر وارد کیا ہے۔ پہنا ہے۔ میں نے زندگی کا کوئی لمحہ خالی نہیں جانے دیا۔ اچھا برا کہیں نفیس کہیں کھردرا کہیں گرم کہیں سرد، موسموں کے اعتبار سے لباس بدلتے رہے۔ ملکوں کے اعتبار سے لباس بدلتے رہے۔ میں نے جاپان سے امریکہ کے مغربی ساحلوں تک اور چین سے افریقہ تک دنیا کو پھر کے دیکھا ہے۔ ہر دیار میں ہر موسم میں رہ کے دیکھا ہے۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملا ہوں مسلسل ایک تسلسل ہے۔ ان سیڑھیوں کا۔ ہر سیڑھی اپنی جگہ اہم ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا۔ کہ کون سی سیڑھی زیادہ اہم ہے اور کون سی کم اہم ہے۔

سوال :۔ راہ سلوک میں مرشد کا ہونا ضروری ہے؟

جواب :۔ راہ سلوک یہ ہے کہ اس کی اصل ہے قلب اطہر رسول اللہؐ۔ انوار و برکات صحابہؓ نے حضورؐ سے لئے، صحابہؓ سے تابعین نے، تابعین سے تبع تابعین نے اس کے بعد یہ انسٹی ٹیوشن بن گیا۔ تو یہ جو پیری مریدی کا ہمارے ہاں تصور ہے۔ اس کی

حضرت ملک اکرم اعوان دفتر میں



گہری سوچ کا ایک انداز

اساس یہ ہے کہ شیخ یا پیر وہ ہوتا تھا۔ جوان برکات کا حامل ہوتا تھا۔ مرید وہ ہوتا تھا جو اس سے وہ برکات لینے جاتا تھا۔ اب تو یہ ہمارے ہاں اس ہندو علم کا شکار ہو گئے، وہ رہبانیت اور پوپ کا فلسفہ آ گیا یا عربی کا فلسفہ آ گیا کہ یہ ہماری مشکلیں دور کرے گا، اور یہ کہ اولاد اس سے لیں گے، یہ سب فضول ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ کیفیات قلبی اس کے پاس ہوں اور وہ آگے تقسیم کرے۔ حضرت سلطان باہوؒ سے کسی نے سوال پوچھا تھا کہ قرآن کا پڑھنا نماز کا پڑھنا عبادت کا کرنا کافی نہیں ہے۔ شیخ کی کیا ضرورت ہے انہوں نے فرمایا کہ جس طرح اولاد کے لئے شادی کی ضرورت ہے، اسی طرح راہ سلوک کے لئے شیخ کی ضرورت ہے۔ دنیا کا ایک نظام ہے یہ ایک تسلسل ہے جس طرح حدیث کی سند ہے اس طرح تصوف کے شجرے ہیں کہ حضورؐ سے کس نے حاصل کیا اس سے کس نے اس سے کس نے اس طرح آگے تک سلسلہ چلتا ہے اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔

سوال:۔ ہمارے ہاں معاشرتی قدروں کے بگاڑ کی وجہ کیا ہے؟

جواب:۔ دنیا کا ایک نظام ہے اور دنیا کا نظام یہ ہے کہ سورج روشنی دیتا ہے۔ مختلف چیزیں ہیں، فضا ہے ہوا ہے اور اس میں بے شمار ذرات ہیں خاک کے، بے شمار گیسیں ہیں بے شمار چیزیں ہیں۔ اور ہر چیز اس روشنی کو آگے منعکس کرتی چلی جاتی ہے۔ یعنی تقسیم در تقسیم کا ایک سلسلہ ہے کہ جو موصول ہو رہا ہے اسے آگے پہنچاؤ دل دھڑکتا ہے خون دیتا ہے اب خون، خون کی بڑی نالی میں آتا ہے اور پھر چھوٹی نالی میں آتا ہے اس سے اگلی چھوٹی نالیوں میں جاتا ہے اس طرح جلد کے ایک ایک مسام تک آتا ہے۔ اب کہیں سے آپ اسے روک لیں آگے تقسیم نہ ہونے دیں وہاں ناسور بن جائے گا۔ اگلا حصہ گل سڑ جائے گا اور پچھلا بھی سوج جائے گا آرام اسے بھی نہیں آئے گا۔ جب ہم انسانی ضروریات انسانی اخلاقیات انسانی عظمتوں اور انسانی حقوق کو

روکتے ہیں، تو کسی شخص کی ہوس بڑھ جاتی ہے کہ مجھ تک تو آیا ہے آگے نہ جانے پائے۔ وہاں سے معاشی 'اخلاقی 'اقدار کا بھی وبال شروع ہو جاتا ہے۔ جو آگے ہے اس کی چیز رک جاتی ہے۔ وہ گلنے سڑنے لگتا ہے۔ جس نے روکی ہوتی ہے سوزش اسے بھی ہونے لگتی ہے متورم ہونے لگتا ہے خراب ہونے لگتا ہے، اے کاش اس فلسفے کو ہم سمجھ سکیں۔ سمجھا سکیں اور یہ جو نعمتیں ہیں جو چیزیں ہیں ہم اپنے لئے جو چاہئے استعمال کریں جہاں دوسروں کا حق آجاتا ہے اسے آگے پہنچائیں، روکیں نہیں رکاوٹ نہ بنیں۔ اپنے لئے بڑے بڑے ذخیرے اور دوسروں کے لئے کچھ بھی نہ بچے یہ بڑی زیادتی ہے۔ یہی سبب ہے اس ساری خرابی کا۔

سوال :۔ آپ معاشرے میں کس قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

جواب :۔ میں نے چار نکاتی پروگرام دیا ہے۔ صرف چار باتیں میری تمنا ہیں۔ سب سے پہلے معاشی انصاف 'اور مومن و کافر' نیک و بد کی تمیز سے بالاتر ہو کر حیثیت انسان ہر ایک کو اس کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ذرائع مہیا کئے جائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ وزیر اعظم کے لئے تین سو کروڑ کا گھر بنائیں۔ اور دوسرا آدمی تین سو کی جھونپڑی نہ بنا سکے۔ یہ زیادتی ہے ایک اپنے لئے جائز وسائل سے روزی پیدا کرے اچھی نعمتیں بنائے 'لیکن جو دوسروں کے حقوق ہیں ان پر محل تعمیر نہ کرے 'بلکہ ایسا معاشی نظام ہو 'جو حیثیت انسان 'اللہ کی مخلوق ہوتے ہوئے ہر ایک تک معاشی وسائل پہنچائے۔ اس کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ جاننے کی ضرورت ہے ایسا تعلیمی نظام ہو 'جس کا ایک نصاب ہو ایک Status ہو اور ہر ایک کے لئے ہو۔ جس میں ٹیلنٹ ہو چے میں چاہے وہ گداگر کا بچہ ہے وہ گڈریئے کا بچہ ہے کسان کا ہے 'امیر کا ہے غریب کا ہے جس میں ٹیلنٹ ہے وہ ترقی کرے۔ پھر اس سارے توازن کو قائم رکھنے کے لئے عدل کی ضرورت ہے۔ کہ جو جس کے حقوق میں دخل

اندازی کرے' وہاں انصاف ہو اور انصاف میرے نزدیک یہ ہے کہ جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے اصول بتایا ہے اس کے مطابق انصاف ہو' تین باتیں۔ اب اس کو دیکھنے کے لئے ایک انسٹی ٹیوشن ایک ادارہ ہو کہ ہر چیز اپنی جگہ صحیح کام کر رہی ہے۔ اسے حکومت کہتے ہیں۔ حکومت سازی کا وہ طریق اپنایا جائے۔ جو موزوں ہے بہترین ہے اور جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے پسند فرمایا ہے۔ اور وہ وہی جمہوریت ہے حقیقی جمہوریت وہ ہے' جو محمدؐ رسول اللہ اور اسلام نے دی۔ جب لوگ حضرت عمرؓ کا دامن گلی میں پکڑ لیتے تھے، تب امریکہ وائلڈ تھا اور یورپ کے لوگ غاروں میں رہتے تھے، اور کسریٰ اور قیصر فرعون بنے ہوئے تھے اور کہیں عدل نہیں تھا۔ کوئی دامن نہیں پکڑ سکتا تھا سلطان کا۔ یہ چار معمولی سی باتیں ہیں۔ کاش کوئی کر گزرے۔

سوال :۔ شکر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب :۔ شکر یہ ہے کہ جب بندے کو یہ ادراک ہو جائے کہ وہ تو شکر کرنے سے بھی قاصر ہے اور یہ بڑی محنت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

سوال :۔ وہ کونسا رنگ ہے جسے اللہ کا رنگ کہتے ہیں؟

جواب :۔ اللہ کریم ہے۔ اللہ ستار العیوب ہے۔ اللہ غفور ہے۔ اللہ جبار ہے اللہ قہار بھی ہے۔ اگر انسان دوسروں کے لئے کرم کا باعث بن جائے۔ اگر انسان دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ احساس ہو اسے۔ دوسروں کو خوشیاں دینا چاہے اور جہاں ظلم ہو' وہاں اللہ کے جبر و قہر کی تصویر بن جائے۔ جب تک ظلم رک نہ جائے۔ افراد سے نہ لڑے۔ بیمار سے نہ لڑے۔ بیماری سے لڑے' ظلم سے لڑے۔ ظلم کو روک دے۔ اگر یہ صورتحال بن جائے۔ اللہ نے کہا۔

"یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے خوبصورت رنگ کون سا ہو سکتا ہے"۔ وہ اوصاف باری' ان کی جھلک' انسان کی اپنی حیثیت کے مطابق آجائے۔ دیکھیں

سورج روشنیوں کا منبع ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا شیشے کا ہے۔ منعکس تو کرتا ہے۔ سورج کو نہیں اک چھوٹی سی کرن کو تو کرتا ہے۔ بندہ ایسے ہی آئینہ بن جائے۔ جمال باری کا۔

سوال :۔ وابستگی کی دنیا کیسی دنیا ہے 'اس دنیا کے لوگوں کی پہچان کیا ہے ؟

جواب :۔ یہ لوگ اپنی سج دھج سے۔ اپنے کردار سے اپنی باتوں سے پہچانے جانے ہیں۔ ان سے بات کہیں سے چھیڑو ناں یہ ختم وہاں جا کر کرتے ہیں۔ دنیا کے کسی گوشے سے انہیں چلاؤ۔ انہیں آپ دوسری طرف چلاتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس طرف رہتی ہے۔ جہاں وابستگی ہوتی ہے۔ یہ عجیب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ پر سکون اور ایک مرکز پر جمے ہوئے ٹھہرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ بڑے قیمتی لوگ ہوتے ہیں۔

عبدالحمید عدم نے خوب کہا ہے

یہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں

آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

بہت مزے کے لوگ ہوتے ہیں ایک پورا جہان ہوتا ہے ایک بندے کے اندر موسموں کا تغیر و تبدل بجلی بارش پانی برستا ہے پھر بہار آتی ہے پھول کھلتے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں یہ۔ ایک وقت میں بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں۔ دوسرے وقت میں بیٹھے نغمہ گا رہے ہیں۔ تیسرے وقت میں بیٹھے ناراض ہو رہے ہیں چوتھے وقت میں بیٹھے منا رہے ہیں۔ عجیب سا ایک جہان ہوتا ہے ایک آدمی کے اندر ایک دنیا اور اس کا ہر رنگ موجود ہوتا ہے ایک فرد کے اندر۔ بڑے قیمتی لوگ ہوتے ہیں۔

اماں جی

والدہ حضرت ملک محمد اکرم اعوان صاحب

س :۔ آپ کی شادی کب ہوئی اور اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

ج :۔ میری شادی ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور اس وقت میری عمر پندرہ برس تھی۔

س :۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟

ج :۔ میرے والد فوج میں کپتان تھے۔ میں انڈیا رڑکی میں پیدا ہوئی۔ والد صاحب دوران ملازمت آگرہ' دہلی' متھرا' بندرابن' الہ آباد' سہارن پور' لدھیانہ' انبالہ اور رڑکی رہے۔ اس طرح مجھے ان تمام جگہوں کو دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ اس وقت فوج کے افسروں کی بڑی شان ہوتی تھی۔ میرے اباجی' میرے بیٹے سے بھی زیادہ قد آور اور جوان تھے۔ بہت رعب والی شخصیت تھی ان کی۔ انہیں بہت سی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی' فارسی' پشتو' اردو' عربی اور چینی زبان وہ بڑی روانی سے بولتے تھے۔ میرے سسر ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اور زمیندارہ کرتے تھے

بہت نیک اور پرہیز گار تھے اور اپنے علاقے کے مانے ہوئے طبیب تھے۔ وہ بہت اچھی طبیعت کے مالک تھے اور ہمارے ان کے ماحول کا بہت فرق تھا۔ اسی لئے جب میرے والد صاحب نے میرا یہاں رشتہ کرنا چاہا تو والدہ نے بہت مخالفت کی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہاں شادی ہو۔ جب یہ بات چل رہی تھی تو میری پھوپھی ہمارے گھر آئیں۔ اور انہوں نے والدہ سے کہا۔ تم کیوں جھگڑتی ہو۔ یہ شادی ہونے دو۔ اس ماحول میں تمہاری آسائشوں کی عادی بیٹی نے رہنا تو ہے نہیں' اسی لئے جب یہ واپس آجائے گی تو میں اپنے بھائی کو مبارک باد دینے جاؤں گی کہ بیٹی واپس آگئی۔ میں نے اتفاق سے پھوپھی کی بات سن لی' جو وہ دراصل بھائی کو طعنے کے طور پر کہنا چاہتی تھیں۔ بس میں نے اس بات کو دل میں رکھ لیا۔ اب جو بھی ہو گزارہ کرنا ہے۔ باپ کو طعنہ نہیں دلوانا۔ بس اس بات پر میں نے زندگی کا بڑی ہمت اور حوصلے سے سامنا کیا اور ہر نشیب و فراز سے گزر گئی۔

س :۔ جب شادی ہوئی تو حضرت جی کے والد صاحب کیا کرتے تھے ؟

ج :۔ وہ اس وقت کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ہمارے گھر بھی جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ میں اگرچہ بالکل ہی فرق ماحول سے آئی تھی' مگر وہاں آکر میں نے بڑی آسانی سے ایڈجسٹ کر لیا۔ اس لئے کہ میرے والد صاحب کی ٹریننگ ہی کچھ ایسی تھی۔ انہوں نے بہت نازو نعم سے مجھے پالا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ عملی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں بھی پورا شعور دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں شہری ماحول اور سہولتوں بھری زندگی کے بعد ایک بالکل ہی پسماندہ اور مشکل ماحول میں آئی تو اپنی تربیت کی وجہ سے مجھے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ کچھ اس زمانے کی قدروں میں پیار اور رکھ رکھاؤ بھی اتنا ہوتا تھا کہ انسان مادی طور پر مشکل حالات میں رہ کر بھی ذہنی طور پریشان نہیں ہوتا تھا۔

س :۔ آپ کے کتنے بچے ہیں ؟

ج :۔ میرے پانچ بچے تھے۔ سب سے بڑے اکرم بیٹا ہیں۔ان کے بعد چار بیٹے ہوئے۔ تین اللہ کو پیارے ہو گئے اور دو اللہ سلامت رکھے۔ میرے پاس ہیں۔

س :۔ جو بچے فوت ہوئے ان کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی ؟

ج :۔ میرا ایک بچہ ایک سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ دوسرا بچہ تین سال کا تھا تو اللہ نے لے لیا۔ مگر میرا تیسرا بیٹا' عین جوانی میں 'اکیس برس کا تھا تو ہم سے بچھڑ گیا۔ عجیب حادثہ تھا وہ۔ خوش و خرم گھر میں بیٹھے تھے۔ وہ اپنے ریوالور کو چیک کر رہا تھا۔ گولی میگزین میں پھنس گئی۔ نکالنے لگا تو گولی چل گئی اور سیدھی اس کی آنکھ میں لگی۔ اور آناً فاناً میری آنکھوں کے سامنے میرا بچہ دم توڑ گیا۔ یہ ۷۱ء کی بات ہے۔ وہ صدمہ ایسا ہے کہ جو بھلائے نہیں بھولتا۔

س :۔ حضرت جی کے بچپن کے بارے میں بتائیں ؟

ج :۔ گھر میں چونکہ یہ پہلے بچے تھے' اس لئے بہت لاڈلے تھے۔ یہ دسمبر میں پیدا ہوئے تھے سخت سردی کے دن تھے' مگر الحمد للہ میں نے انہیں ہمیشہ باوضو دودھ پلایا۔ کیونکہ میرے سسر کہا کرتے تھے' کہ اگر ماں باوضو ہو کر دودھ پلائے تو بچے بہت صالح ہوتے ہیں۔

پانچ سال تک ہم ڈیرے (ڈھوک ٹلیالہ) پر رہے۔ پھر میں نے ماموں جی سے کہا۔ ہم گاؤں جانا چاہتے ہیں تاکہ بچے کو اسکول داخل کروا سکیں۔ انہوں نے کہا۔ بیٹا انہیں گھر میں ہی پڑھا لیتے ہیں۔ میں نے کہا۔ گھر میں کہاں پڑھائی ہوتی ہے۔ ہم انہیں اسکول میں پڑھائیں گے' تاکہ یہ باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ میں چونکہ ایک مختلف ماحول سے آئی تھی اور اس زمانے میں' میرے والد صاحب نے مجھے تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ کیا ہوا تھا' لہذا میں اپنے بچے کا وقت ضائع کرنے کے

حق میں نہ تھی۔ ماموں جی نے میری بات مان لی۔ اور ہم لوگ ڈھوک سے گاؤں شفٹ ہو گئے۔ میں نے انہیں اسکول داخل کروادیا۔ جب یہ پانچ برس کے ہوئے تو ان کے والد فوج میں چلے گئے۔

س :۔ یہ کب کی بات ہے؟

ج :۔ یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ عراق چلے گئے اور دو سال کے بعد لوٹے۔

س :۔ حضرت جی اپنے بچپن میں کیسے تھے کچھ ان کی تعلیم کے متعلق بتائیے؟

ج :۔ بہت ذہین تھے۔ شرارتی بھی تھے۔ مگر ان کی شرارت میں بھی ذہانت نمایاں ہوتی تھی۔ سیتھی اسکول سے پرائمری کے بعد۔ انہوں نے نور پور سے مڈل کیا اور پھر بوچھال گورنمنٹ اسکول سے انہوں نے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک میں انہوں نے بہت اچھے نمبر لئے۔ اس وقت یہاں کوئی کالج نہیں تھا۔ البتہ چکوال میں' اسی سال ایک کالج نیا نیا کھلا تھا۔ انہوں نے وہاں داخلہ لے لیا' اور جب ایف اے میں تھے تو میرے اباجی قتل ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد پریشانی کی ایسی لہر چلی کہ ہم بہت عرصہ اس سے نکل نہ سکے۔ انہی دنوں بیٹے نے کالج چھوڑا۔ اور گھر آگئے۔ ان دنوں ان کے والد صاحب نوکری پر تھے۔ ماموں ملازمت کرتے تھے۔ گھر میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اس مشکل وقت میں حالات کو سنبھالتا۔ یہ گو کم عمر تھے' مگر ان میں کچھ ایسی قدرتی صلاحیتیں تھیں کہ سب نے انہیں بڑے کی حیثیت سے مان لیا۔ پھر مخالفوں نے انہیں جھوٹے قتل کے مقدمے میں پھنسادیا۔ وہ دن بڑی آزمائش کے تھے۔ میں چکوال ٹیچنگ کا کورس کر رہی تھی۔ اور بیٹا جیل میں تھا۔ مجھے یاد ہے سردیوں کی راتیں تھیں۔ اور میں ساری ساری رات کمبل اوڑھ کر باہر کھڑی ہو کر سورہ مزمل پڑھتی تھی اور ان کے لئے دعا کرتی تھیں۔ خدا نے مجھ بے نوا کی سن

ل۔ اور یہ بہت جلد بری ہو گئے۔

س :۔ اس کے بعد انہوں نے تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا؟

ج :۔ جی نہیں۔ انہوں نے باقاعدہ کسی درسگاہ میں داخلہ نہیں لیا۔ مگر اپنے طور پر یہ مختلف علوم پر کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔

س :۔ کوئی ایسی یاد جو حضرت جی کے حوالے سے آپ بتانا چاہیں؟

ج :۔ بہت پرانی بات ہے۔ پارٹیشن سے بہت پہلے کی۔ ہمارے گاؤں میں ایک ذات تھی، جنہیں راجا تیلی کہا کرتے تھے۔ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ جب کسی کے گھر بچہ پیدا ہوتا تھا' تو وہ' وہاں پہنچ جاتے تھے۔ گھر والوں سے بچے کی مبارک کا ایک روپیہ وصول کرتے تھے (ایک روپیہ مقرر ہوتا تھا) پھر اس کے بعد ان کی ہتھیلی کو تیل سے بھر دیا جاتا تھا۔ وہ تمام تیل' وہیں کھڑے کھڑے سر اور چہرے پر مل لیا کرتے تھے اور پھر بچے کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ ان دنوں ہمارے گاؤں میں اسے ایک رسم کے طور پر لیا جاتا تھا۔ مگر میں چونکہ ان چیزوں کو نہیں مانتی تھی' میری ایک اپنی سوچ تھی' میں اس رسم کو عہد جہالت کی رسموں کی باقیات سمجھتی تھی' اسی لئے' جب اکرم بیٹا پیدا ہوئے' تو میں نے راجا تیلی والی رسم کو ادا نہیں کیا۔ ان کی پیدائش کے پندرہ بیس روز کے بعد' میں ایک دن انہیں اٹھا کر گلی سے گزر رہی تھی' تو آگے سے راجا تیلی آگیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا' بی بی یہ آپ کا بچہ ہے۔ میں نے کہا' ہاں یہ میرا بچہ ہے۔ بی بی اسکے لیکھ دیکھوں۔ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے رکھائی سے جواب دیا اور آگے جانے لگی۔ تو اس نے مجھے روک لیا۔ بی بی' ذرا رکو' مجھے تمہارا بچہ بختوں والا لگ رہا ہے' ذرا دیکھنے تو دو۔ اس نے بچہ مجھ سے لے لیا' اور کہنے لگا۔ میں دیکھ رہا ہوں' یہ عام بچہ نہیں ہے۔ اس کا ستارہ بہت عروج پر رہے گا۔ مگر زندگی میں بہت مشکل بھی دیکھے گا۔ بہت جدوجہد کرنی پڑے گی اسے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا

اسے دنیا مانے گی۔

اس وقت تو میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی' اس لئے کہ مجھے پتہ تھا۔ پیسے بٹورنے کے لئے وہ اچھی اچھی باتیں کر کے لوگوں کو خوش کرتا ہے۔ مگر اب سوچتی ہوں' ہے تو سب خدا کی قدرت۔ اسکی رضا کے بغیر کچھ بھی ہونا ممکن نہیں۔ مگر راجا تیلی نے بھی جو کچھ کہا تھا' وہ بھی جھوٹ نہیں لگتا۔ شاید خدا کی ذات نے اسے بھی کوئی علم دے رکھا تھا۔

س :۔ حضرت جی کیسے بیٹے ہیں ؟

ج :۔ بہت اچھے بیٹے ہیں۔ فرمانبردار تو وہ ہیں ہی' مگر ہم ماں بیٹے میں روایتی ادب آداب والا تعلق نہیں ہے۔ ہم میں دوستی ہے۔ بہت اچھی دوستی' میری چونکہ بیٹی نہیں ہے' اور اولاد میں سب سے بڑے یہی ہیں۔ توانہوں نے مجھے کبھی بیٹی کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ تمام کاموں میں' میرے ہمراہ رہے' ہم نے دکھ سکھ ہمیشہ آپس میں بانٹا ہے۔ وہ میرے بیٹے ہی نہیں میرے ہمراز بھی ہیں۔

س :۔ انہیں اس مقام پر دیکھ کر آپ کو کیسا لگتا ہے ؟

ج :۔ ایک ماں اپنے بچے کی کامیابیوں کے لئے جو خواب دیکھ سکتی ہے۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ دنیاوی لحاظ سے تو جو ہے سو ہے ؟ مگر روحانی طور پر اللہ نے انہیں جس منصب سے نوازا ہے۔ اسکا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے' کیونکہ میں سمجھتی ہوں' دنیا میں عروج حاصل ہونا کوئی بڑا کمال نہیں ہے یہاں بڑے بڑے صاحب کمال آئے اور چلے گئے۔ مگر خدا کے راستے میں' اس کے مقرب بندوں میں شامل ہونا' اور خلق خدا کا دکھ بانٹنا' ان کے لئے باعث ہدایت ہونا' اصل شکر ہے۔ یقین کریں میرا تو رواں رواں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے مجھ ناچیز کو اتنا نوازا۔

بڑی بی بی جی

س :۔ اجتماع کب شروع ہوا؟

ج :۔اجتماع ہمارے ڈیرے سے شروع ہوا ڈھوک ٹلیالہ سے۔

س :۔اسوقت کتنے لوگ اجتماع میں شریک ہوتے تھے ؟

ج :۔اس وقت چالیس پچاس کے قریب لوگ ہوتے تھے پھر ہم ڈلوال چلے گئے وہاں اجتماع ہوتا رہا اس کے بعد منارہ اجتماع چلا گیا۔ اسکے بعد نور پور اجتماع ہوتا تھا ایک اسکول میں اجتماع کا انتظام ہوتا تھا۔ حضرت جی اسوقت اسکول میں پڑھاتے تھے وہاں تقریباً دو سال اجتماع رہا۔

س :۔بڑے حضرت جی بھی آتے تھے ؟

ج :۔جی وہ بھی آتے تھے اس وقت ہم ڈھوک پر تمبو لگا کر لوگوں کو ٹھہرانے کا انتظام

کرتے تھے۔

س :۔اس وقت حضرت جی ذکر کیا کرتے تھے ؟

ج :۔جی ہاں۔وہاں ڈھوک والے گھر میں ایک چھوٹی سی کچی کوٹھڑی ہوتی تھی جس کے فرش پر گھاس پھیلا ہوتا تھا، حضرت جی بہت شدت سے چار پانچ گھنٹے مسلسل ذکر کیا کرتے تھے دوران ذکر کہنیاں زمین پر ٹیک دیتے تھے اور جب اٹھتے تھے تو ان کی کہنیوں سے خون بہہ رہا ہوتا تھا۔

س :۔کیا صبح و شام ذکر کیا کرتے تھے ؟

ج :۔ صبح و شام تو ضروری تھا مگر رات کو زیادہ تر کیا کرتے تھے اور جب تھکتے تو چھوڑتے تھے۔اللہ نے انہیں استقامت بھی اتنا دیا ہے کہ عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

س :۔کیا شادی سے پہلے بھی نماز پڑھتے تھے یا شادی کے بعد شروع کی ؟

ج :۔نماز توانہوں نے شادی سے پہلے ہی شروع کر دی تھی اس وقت ان کی چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی تھی۔

س :۔سنا ہے آپ سے حضرت جی نے پسند کی شادی کی تھی اور بہت جھگڑے بھی ہوئے تھے ؟

ج :۔آپ نے ٹھیک سنا ہے!ہم چونکہ آپس میں فرسٹ کزن بھی تھے اور میری منگنی بچپن میں ہی حضرت جی سے ہو چکی تھی۔مگر بعد میں گھر والے اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ ان کی لڑائیاں جھگڑے چل رہے تھے اور دوسرا یہ ان دنوں کوئی کام بھی نہیں کرتے تھے۔ہمارے ہاں چونکہ زیادہ تر لوگ فوج میں ہیں۔تو میرے لئے اپنے ہی ایک رشتہ دار کا پرپوزل آیا جو آرمی میں تھے۔وہ میری پھوپھی کے بیٹے تھے۔انہوں نے کہا میں نے اس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔تو اسطرح گھر

والوں کی مرضی تھی کہ یہاں سے رشتہ ختم کر کے دوسری جگہ کر دیا جائے۔ مگر جب اس بات کا حضرت جی کو علم ہوا تو انہوں نے شور مچا دیا پھر بہت ہنگامہ ہوا اور بالآخر حضرت جی کے دادا جی جو کہ میرے نانا تھے انہوں نے ہماری شادی کرا دی۔

س :۔ آپ کی کیا مرضی تھی؟

ج :۔ ہنستے ہوئے۔ میری کیا مرضی ہوتی۔ بیٹیوں کی کیا مرضی ہوتی ہے۔ جہاں ماں باپ کہیں۔

س :۔ سنا ہے بات کے بڑے پکے تھے؟

ج :۔ جی بات کے بڑے پکے تھے۔ دوستیوں میں بڑے سچے ہیں۔ دوستوں کے مسائل کو اپنا مسئلہ سمجھ کر۔ ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ جہاں طاقت کی ضرورت ہوتی تھی' وہاں ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور جہاں مالی امداد کی ضرورت ہوتی وہاں بھی سب سے آگے آگے رہتے تھے۔ اپنے علاقے میں یہ سنگت کے بہت پکے مشہور تھے۔

س :۔ شادی کے بعد حضرت جی میں کوئی تبدیلی آئی؟

ج :۔ جی شادی سے پہلے بہت تگڑے اور سخت ہوتے تھے۔ مگر شادی کے بعد ان میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ مزاجاً یہ کچھ بدلنے لگے۔ بعد میں یہ سلسلے میں بھی آگئے' شاید یہ ہی وجہ تھی کہ ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ آنے لگا۔

س :۔ بڑے حضرتؒ جی کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج :۔ بڑے حضرتؒ جی' بہت مہربان تھے۔ مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ جب ہمارے پاس ڈھوک میں آکر ٹھہرا کرتے تھے' تو میں ان کا کھانا اپنے ہاتھ سے بناتی تھی۔ ان کے کپڑے خود دھو کر باہر بھجوایا کرتی تھی۔ مجھ سے بہت خوش تھے۔ اور بعد میں حضرت جی سے کہا کرتے تھے کہ شادی تو آپ نے کر لی ہے مگر آپ نے انہیں خوش رکھنا ہے۔

س :۔ حضرت جی کی دوسری شادی کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

ج :۔ کول مائننگ کے کام کے سلسلے میں 'یہ اکثر منارہ جایا کرتے تھے۔ ان کا دفتر وہیں تھا۔ چھوٹی بی بی کے بھائی کے ساتھ ان کا بزنس تھا۔ اور وہ چونکہ سلسلے کے ساتھی بھی تھے 'تو ان کے گھر بھی آنا جانا تھا۔ مگر ایک بات میں واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ حضرت جی کا اس وقت شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا 'ہم اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔ یہ تو خبر نہیں کیا ہوا۔ بس قسمت کہہ لیں' چند ایک ایسی باتیں ہوئیں کہ ضد میں آکر انہوں نے شادی کر لی۔

س :۔ شادی کا سن کر آپ کو کیسا لگا ؟

ج :۔ مجھے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ انہوں نے منارے شادی کر لی ہے۔ پہلے تو یقین ہی نہیں آیا' ذہن کو ایک دم سے اتنا دھچکہ لگا کہ بعد میں بہت دیر لگی مجھے سنبھلنے میں۔ مگر ایک بات ہے کہ انہوں نے کبھی کسی معاملے میں ہم میں فرق نہیں رکھا۔ مساوی سلوک رہا ہے ان کا دونوں گھروں' سے۔ حقوق و فرائض کے علاوہ ان کے رویے میں بھی ایسی کوئی تبدیلی میں نے نہیں دیکھی۔ جس پر مجھے گمان ہوتا کہ دوسری شادی کی وجہ سے ہے۔ ہاں بس ایک دکھ تو ہے اور رہے گا' اور وہ حقیقت بھی ہے۔ کہ وہ تقسیم ہو گئے۔ اور اتنا اچھا خاوند تقسیم ہو جائے تو کون عورت ہے جو اسے محسوس نہیں کرے گی۔

س :۔ کبھی آپ کی چھوٹی بی بی جی سے لڑائی بھی ہوئی ؟

ج :۔ بالکل نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا' اور جب آپ کسی کو تسلیم کر لیں تو پھر جھگڑا کس بات کا۔

س :۔ حضرت جی کی کونسی عادت آپ کو زیادہ اچھی لگتی ہے ؟

ج :۔ یہ بہت خیال رکھنے والے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں کا خیال رکھتے

ہیں۔ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بتائے بغیر سمجھ جاتے ہیں۔اب حالانکہ ان کی زندگی بہت مصروف ہے۔سلسلہ' جماعت اور دوسری بے شمار مصروفیات 'مگر ان کے باوجود ہر ایک کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ہر ایک کی سنتے ہیں سب ان سے خوش ہیں۔

انٹرویو۔ چھوٹی بی بی سے

س :۔ آپ حضرت جی کو شادی سے پہلے بھی جانتی تھیں ؟

ج :۔ حضرت جی کا میرے گھر والوں سے پرانا ملنا ملانا تھا۔ میرے نانا' ماموں اور چچا کیساتھ ان کی بڑی اچھی جان پہچان تھی۔ خوشی غمی پہ سب اکٹھے ہوتے تھے۔ میں اپنے والد کی تیسری بیوی سے اولاد ہوں۔ پہلی دو بیویوں سے ان کے اولاد نہیں تھی۔ ہم دو بہن بھائی ہیں۔ میرے بھائی حضرت جی کے ایک سال بعد جماعت میں آئے۔ وہیں حضرت جی سے ملاقات ہوئی اور ساتھی کی حیثیت سے دوستی کا آغاز ہوا۔ میں اس وقت پانچویں میں پڑھتی تھی۔ میرے والد کا علاقے کے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔

س :۔ حضرت جی کی پہلی شادی کے بارے میں بتائیں ؟

ج :۔ ان کی پہلی شادی غالباً ۱۹۶۰ء میں ہوئی اس وقت یہ جماعت میں آچکے تھے۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ ان کے ایک سال بعد میرے بھائی بھی جماعت

میں شامل ہو گئے پھر ان کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوا۔
س :۔ کیا گھر کے اندر آتے تھے ؟
ج :۔ گھر کے اندر نہیں وہ گھر کے اوپر والے حصے میں سیڑھیوں کے پاس چوبارہ تھا وہیں آتے تھے۔
س :۔ آپ کی شادی پہلی شادی کے بعد کب ہوئی ؟
ج :۔ اس وقت ان کے تین بچے تھے جب شادی ہوئی۔
س :۔ یہ کیسے ہوئی ؟
ج :۔ یہ آپ کو بتاؤں نا۔ یہ لوح محفوظ پر لکھا تھا اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا میرے ابا جی اپنے علاقے کے مشہور آدمی تھے میں بچوں سے کہتی ہوں جس طرح آپ کے والد کا نام ہے۔ اسی طرح آپ کے نانا بھی بہت اچھے آدمی تھے اپنے علاقے کے۔ میرے رشتے کا جھگڑا چلتا رہا امی جان اپنے رشتہ داروں میں چاہتی تھیں ابا جان اپنے رشتہ داروں میں چاہتے تھے۔ اسی کھینچا تانی میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ابا جان فوت ہو گئے۔ تو بڑے حضرت جی نے (مولانا اللہ یار خانؒ) امی جان سے کہا ان کا جہاں بھی مقدر ہو گا فوری فیصلہ ہو گا۔ یعنی پھر شادی جلدی ہو جائے گی دیر نہیں لگے گی۔ میری عمر تیس برس کی تھی جب شادی ہوئی۔
س :۔ حضرت جی کا گاؤں تو سیتھی ہے پھر منارہ میں آپ کی رہائش کس طرح ہوئی ؟
ج :۔ ویسے میں سمجھتی ہوں بڑے حضرت جی کو اس فیصلے کا پتہ تھا وہ صاحب حال جو تھے۔ انہوں نے خود یہ رشتہ کرایا تھا۔ اور اس گھر کی بنیادوں میں اپنے ہاتھ سے دو اینٹیں لگائی تھیں۔ اسی وجہ سے تو ہم یہ جگہ چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اس شادی نے ہونا ہے اور ہو کر رہے گی۔ جھگڑے بھی ہوں گے شور بھی مچے گا مگر ہو کر رہے گی۔ بلکہ اس ضمن میں مجھے یاد ہے کہ میرے

رشتہ داروں میں سے کسی نے میرا رشتہ مانگا میری امی نے حسب روایت انکار کر دیا تو حضرت جی (بی بی جی حضرت جی کو حضرت جی ہی کہتی ہیں شیخ کے حوالے سے) کی میری امی سے بحث ہو گئی۔ کہ آخر آپ کیوں بیٹی کا رشتہ نہیں کرتیں۔ کیوں اسے بٹھا کر رکھا ہوا ہے۔

س :۔ یعنی اس وقت تک آپ سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا؟

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ شادی کے بعد آپ نے حضرت جی کو کیسا پایا؟

ج :۔ الحمد للہ۔ وہ بہت اچھے ہیں انہوں نے دونوں فیملیز کو بہت خوبصورتی سے رکھا ہے میں چونکہ بعد میں آئی تھی وہ پہلے سے تھیں مگر ہمیں انہوں نے ایک دن بھی ایک جگہ پر اکٹھا نہیں رکھا، ان کا گھر الگ تھا اور میرا گھر الگ۔ ان کے حقوق کے معاملے میں، میں نے کبھی مداخلت نہیں کی اور میرے حقوق کے معاملے میں وہ کبھی نہیں بولیں۔ تو اس طرح وقت بہت اچھا گزرا اور میں سمجھتی ہوں اس میں حضرت جی کی فراست اور معاملہ فہمی کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے ساری عمر تمام معاملات اتنی خوش اسلوبی سے نبھائے ہیں کہ کسی کو کسی کی حق تلفی کا احساس تک نہیں ہوا۔ سب اپنی اپنی جگہ خوش اور مطمئن ہیں۔

س :۔ سنا ہے پہلے اجتماع آپ کے گھر ہوتا تھا اس کے بارے میں بتائیں؟۔

ج :۔ جی پہلے بہت عرصہ اجتماع ادھر منارہ میں ہوتا تھا۔ پندرہ بیس ساتھی ایک وقت میں ہوتے تھے بڑے حضرت جی کا کھانا میں خود اپنے ہاتھ سے بناتی تھی۔ اسکے بعد جماعت پھیلنا شروع ہوئی تو اب دیکھیں تعداد ہزاروں سے بھی نکل کر لاکھوں میں پہنچ گئی ہے۔

س :۔ آپ کام سے تنگ نہیں آتی تھیں؟

ج :۔ جی بالکل نہیں۔ میں بڑی خوشی سے سب کام کرتی تھی اور بڑے حضرت جی فرمایا کرتے تھے کہ منارہ کے کھانے میں شفاء ہے۔

س :۔ سنا ہے حضرت جیؒ آپ کے پاس قیام فرمایا کرتے تھے ان کے بارے میں بتائیں؟

ج :۔ بڑے حضرتؒ جی ہمارے پاس اجتماع کے علاوہ بھی قیام فرماتے تھے۔ بعد میں وہ کمزور ہو گئے اور اکثر بیمار رہنے لگے تو گھر کے اندر ہی زیادہ تر رہتے تھے۔ یہیں انگریز آتے تھے جو ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے تھے آپؒ چونکہ ان کے ساتھ ان کی زبان میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ تو یہ کام ہمارے حضرت جی کیا کرتے تھے اور باہر کے دورے یعنی تبلیغ کے سلسلے میں بھی حضرت جی ہی باہر جایا کرتے تھے۔

س :۔ حضرت جی کے بارے میں بتائیں انہیں غصہ آتا ہے کہ نہیں؟

ج :۔ (مسکرا کر) اول تو آتا ہی نہیں اگر آئے تو گھر کے گیٹ تک جاتے جاتے ختم ہو جاتا ہے۔

س :۔ کھانا کس طرح کا پسند ہے؟

ج :۔ ہر طرح کا کھانا شوق سے کھاتے ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ تازہ ہونا چاہئے باسی سالن نہیں کھاتے۔ یعنی دونوں وقت تازہ سالن ہونا چاہئے اور اب تو بہت سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ زیادہ تر سبزیاں اور دالیں گوشت چھوڑ دیا ہے کبھی کبھی مرغی کا گوشت وہ بھی Boneless ہو تو کھا لیتے ہیں۔

س :۔ آپ کو حضرت جی کی سب سے اچھی عادت کونسی لگتی ہے؟

ج :۔ صبر کی عادت۔ کچھ بھی ہو جائے برداشت کئے جاتے ہیں۔ میں نے ان جتنا صابر انسان آج تک نہیں دیکھا۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کے سامنے چاہے سونے کے ڈھیر لگا دو ساری دنیا کا اسباب رکھ دو وہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔ اس

معاملے میں میری عادت بھی ان سے ملتی جلتی ہے ہم میں اتنا توکل اتنی قناعت ہے کہ طبیعت کبھی طرف مائل ہی نہیں ہوتی۔ قلب اتنا مطمئن ہے کہ کسی طرف نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔

س :۔ بڑے حضرت جی کی وفات کے بارے میں بتائیں ؟

ج :۔ ہمارے گھر اس وقت فون نہیں تھا ساتھ والے گھر سے جب فون آیا کہ بڑے حضرت جی کا وصال ہو گیا ہے۔ تو اس وقت سے ایک گھنٹہ پہلے حضرت جی خاموشی سے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے اور صاف پتہ چلتا تھا کہ وجودی طور پر تو وہ یہاں ہیں مگر روحانی طور پر کہیں اور ہیں یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔

جب شیخ راولپنڈی فوت ہوئے اور ہمیں اطلاع ملی تو میں نے حضرت جی کو بہت دفعہ بلایا انہیں آوازیں دیں 'بتایا کہ حضرت جی کا انتقال ہو گیا ہے چوں نے بھی انہیں آوازیں دیں مگر وہ بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ بعد میں بتاتے ہیں کہ مجھے آپ کی آوازیں بہت دور سے آ رہی تھیں۔

پھر ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئیں بمشکل ان کے منہ سے نکلا کہ خبر سن کر میں نہ زمین پر تھی اور نہ آسمان پر' عجیب حالت تھی میری۔ ان کا اور میرا تو باپ بیٹی والا رشتہ تھا۔ بلکہ وہی تو تھے جو میرے سرپرست تھے جب بھی بیمار ہوتے تھے، ہمارے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ میں دو دو ملازموں کی موجودگی میں بھی ان کے کمرے کی صفائی خود کرتی تھی۔ بستر جھاڑتی تھی 'کمرہ ٹھیک کرتی تھی اور جو کوڑا نکلتا تھا اسے صحن میں لگے کیلے کے درخت کے پاس کچی زمین میں ڈال دیتی تھی۔ کہ اس پر کسی کا پاؤں نہ پڑے اور بے ادبی نہ ہو۔ وصال سے کچھ عرصہ پہلے ان کے جسم سے سکن اترنا شروع ہو گئی تھی انوارات کی وجہ سے ایک دفعہ بستر جھاڑتے ہوئے میں نے چارپائی کے پاس فرش پر دیکھا تو کچھ سفید بال اور سکن کے

چھلکے پڑے تھے۔ پھر تو جیسے انسان پلکوں سے چنتا ہے میں نے ایک ایک بال چنا چھلکے اکٹھے کیے' اور انہیں باندھ کر اپنے زیور والے ڈبے میں محفوظ کر لئے۔ جب بڑے حضرت جی نے وفات پائی تو پورے چھ مہینے میں بے قراری کے عالم میں چکڑالہ چکر لگاتی رہی میری حالت کے پیش نظر حضرت جی مجھے لے کر جاتے رہے مجھے صبر ہی نہیں آتا تھا۔

س :۔ آپ کے پاس زیادہ ٹھہرا کرتے تھے ؟

ج :۔ جی بہت زیادہ! اگر کوئی ان سے پوچھتا تھا کہ آپ کو کونسی چیز عزیز ہے تو پہلے نمبر پر وہ حضرت جی کا نام لیتے تھے اور دوسرے نمبر پر میرا' بہت پیار تھا انہیں ہم سے۔

س :۔ آپ کے بچے ذکر کرتے ہیں ؟

ج :۔ جی ماشاء اللہ چاروں بچے ذکر کرتے ہیں اور مجھے اس چیز کی دلی خوشی ہوتی ہے میں ان سے اکثر کہا کرتی ہوں کہ تمہارے پاس ایک سمندر ہے اس سے جتنی چاہو پیاس بجھاؤ تم لوگ خوش نصیب ہو کہ تمہیں وقت مل رہا ہے فیض حاصل کرنے کا۔

س :۔ آپ حضرت جی کو حضرت جی کہتی ہیں جب کہ وہ آپ کے شوہر ہیں اسکی وجہ ؟

ج :۔ مجھ سے کئی لوگ یہی سوال کرتے ہیں۔ کہ آپ اپنے میاں جی کو حضرت جی کیوں کہتی ہیں۔ تو میں انہیں ہمیشہ یہی جواب دیتی ہوں کہ میاں تو وہ میرے ہیں اور وہ بہت آئیڈیل میاں ہیں' مگر اسکے علاوہ وہ میرے شیخ بھی تو ہیں میں انہیں اس حوالے سے حضرت جی کہتی ہوں۔

س :۔ کیا آپ کو پتہ تھا کہ جماعت کی قیادت حضرت جی کو ملے گی ؟

ج :۔ جی کافی حد تک ہم لوگ جانتے تھے دراصل دو اور ساتھی بھی تھے جنہیں یہ

گمان تھا مگر بڑے حضرت جی یہ فرمایا کرتے تھے 'ان میں ایک تو ذات کے جولاہے تھے اور دوسرے سنار تھے بڑے حضرت جی فرمایا کرتے تھے یہ بوجھ اعوان ہی اٹھا سکتے ہیں بڑے حضرت جی بھی اعوان تھے۔

س :۔ آؤٹنگ کے لئے جاتے ہیں آپ لوگ ؟

ج :۔ جب بھی حضرت جی کے پاس وقت ہوتا ہے تو ہمیں پھرانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ اس علاقے میں بے پناہ قدرتی حسن ہے آپ جہاں جائیں ایک نئی قسم کی خوبصورتی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہم لوگ اکثر شام کو پکنک کے لئے باہر جنگل اور پہاڑوں میں جاتے ہیں۔ حضرت جی کو فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے۔ بچوں کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ وہیں ہم لوگ ہائیکنگ کرتے ہیں دور تک پہاڑوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

س :۔ بچیوں کی آزادی کے قائل ہیں یا نہیں ؟

ج :۔ بالکل قائل ہیں۔ انہوں نے بچیوں کو شکار کھیلنے سے لے کر کار ڈرائیو کرنے تک خود سکھایا ہے اور انہیں خوشی ہوتی ہے کہ ان کی بیٹیاں خود اعتماد ہیں اور روائتی سوچ سے دور ہیں۔

س :۔ آپ ذکر کرتی ہیں ؟

ج :۔ جی۔ الحمد للہ۔ میں اس وقت سے ذکر کرتی ہیں جب سے میرے بھائی جماعت میں آئے تھے۔ میں اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ میرے والد صاحب کی عمر اس وقت زیادہ تھی۔ اکثر بیمار رہتے تھے۔ میں رات کو ان کی ٹانگیں دبانے کے لئے کمرے میں جاتی تو لالٹین اٹھا کر باہر رکھ دیتی۔ اور انہیں دبانے کے دوران ذکر کرتی رہتی یہ روٹین اب تک اسی طرح جاری ہے۔ اب ہمارے بچوں میں بڑی بیٹی آسیہ اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔ بہت بچپن سے اس نے تہجد اور ذکر شروع کر دیا تھا مجھے یاد نہیں اس نے کبھی اس معمول میں ناغہ کیا ہو۔

بہو سے باتیں

س :۔ آپ نے حضرت جی کو بطور سسر کیسا پایا؟

ج :۔ چار سال ہو گئے ہیں میری شادی کو میں نے انہیں ہر لحاظ سے آئیڈیل اور پرفیکٹ انسان پایا۔ میں نے اب تک ان کا کوئی پہلو ایسا نہیں دیکھا جس میں کچھ کمی ہو۔ ہر لحاظ سے مکمل۔ اماں جی نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ As a husband آئیڈیل انسان ہیں میں کہتی ہوں۔ وہ بحیثیت سسر آئیڈیل انسان ہیں۔

س :۔ ان کی کونسی عادت اچھی لگتی ہے؟

ج :۔ ان کی یہ بات سب سے اچھی لگتی ہے کہ وہ دوسروں کی چھوٹی سے چھوٹی Feeling کو سمجھتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو Celebrate کرتے ہیں۔ ان احساسات کو سمجھنا جن تک عام آدمی پہنچ ہی نہیں سکتا اور پھر اس صورت میں کہ جب آدمی اتنی ذمہ داریوں میں گھرا ہوا اتنے بکھیڑے ہوں اور سب کو اتنا ٹائم دینا

بہت مشکل ہے۔

س :۔ ساس سسر کا Relation Ship کیسا ہے ؟

ج :۔ وہ بہت کیئر کرتے ہیں جہاں تک میں نے دیکھا ہے۔ اماں جی کے ساتھ ان کا آئیڈیل' Relation Ship ہے۔

س :۔ آپ جب سے بیاہ کر آئی ہیں۔ ان کی رہائش دار العرفان میں ہوئی ہے وہ کم کم ہی یہاں آتے ہیں ؟

ج :۔ جی یہ تو ہے مگر وہ جتنا وقت بھی آتے ہیں۔ وہ اتنا بھر پور ہوتا ہے کہ کسی کی کا احساس نہیں ہوتا یہاں وہ مکمل طور پر ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔

اور ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ دل میں چھپی ہوئی باتیں بھی جان لیتے ہیں یعنی وہ باتیں جو صرف ایک عورت ہی عورت کی سمجھ سکتی ہے انہیں اس کا ادراک بھی ہو جاتا ہے۔

انٹرویو

ملک بشیر اکرم اعوان

ا۔ حضرت جی کو حیثیت والد آپ نے کیسا پایا؟

جواب۔ سب بہن بھائیوں میں میرا نمبر پہلا ہے چنانچہ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے وہ غالباً 1966,67 کا زمانہ تھا کچھ خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے ہم لوگ گاؤں سے باہر ڈیرہ پر رہائش پذیر تھے، اس زمانے کی جو سب سے پہلی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جو بڑے حضرت جیؒ کے حوالے سے ہے کہ سلسلہ عالیہ کے سالانہ اجتماع کا آغاز غالباً وہیں سے ہوا تھا، وہ منظر ابھی بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ حضرت جیؒ (حضرت مولانا 'اللہ یار خانؒ) گھوڑے پر سوار ہیں اور پندرہ بیس افراد ان کے ساتھ ہیں جو پیدل چل رہے ہیں ان حضرات میں سے انکل خدا بخش راجہ یوسف صاحب اور حافظ عبدالرزاق صاحب' مجھے یاد ہیں اور اب بھی کبھی کبھی ان حضرات سے اس زمانے کی باتیں کر کے بڑا مزہ آتا ہے۔

۲۔ بچپن کا کوئی ایسا واقعہ جو حضرت جی کے حوالے سے ذہن میں محفوظ ہو؟

جواب :ان کو حیثیت والد بچپن سے بہت شفیق اور انتہائی دوستانہ ماحول میں دیکھا ہے اور یہ بے تکلفی ان کے مزاج کا حصہ ہے ،بچوں کے ساتھ سختی یا پابندی تو ان کی طبیعت میں بالکل بھی نہیں ہے۔ بچپن میں ہم لوگ اپنے چچا جان سے ڈرا کرتے تھے، مجھے بالکل یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی ان سے ڈانٹ کھائی ہے بلکہ مجھے یاد ہے میری دادی جان کا تعلق درس وتدریس کے شعبہ سے رہا ہے اور میں نے پرائمری تک ان سے پڑھا ہے دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت میرا مزاج بچپن سے ذرا سنجیدہ تھا تو ابو کو ان سے عموماً یہ شکایت ہوتی تھی کہ آپ نے میرے بیٹے کو بزرگ بنادیا ہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو خاندانی حالات وواقعات اور علاقائی مجبوریوں کی وجہ سے سیکیورٹی پرابلم کو ہمیشہ والد محترم کی زندگی کا حصہ دیکھا اس وقت ہمارے علاقے میں بجلی نہیں تھی اسکے باوجود وہ سخت گرمی میں بھی ہمیشہ کمرہ بند کر کے سوتے تھے اور انہوں نے کبھی گرمی کی شکایت نہیں کی۔

غالباً 1968ء کا واقعہ ہے سردی کا موسم تھا رات کے وقت ہم لوگ سو رہے تھے کہ خاندانی دشمنی کی وجہ سے کچھ لوگوں نے گھر پر حملہ کر دیا ابو کی آنکھ کھل گئی کافی فائرنگ ہوئی مقابلہ ہوا وہ لوگ بھاگ گئے ،ایک آدمی کے جوتے وہاں رہ گئے جس سے اندازہ ہوا کہ کون لوگ تھے ،لیکن مجھے یہ واقعہ ایک اور حوالہ سے یاد رہ گیا جب فائرنگ ہوئی تو پڑوس میں میاں بیوی تھے وہ ابھی بھی زندہ ہیں اور کافی عمر رسیدہ ہیں، اس خاتون نے کمرے کو اندر سے تالا لگایا اور چابی اندھیرے میں کہیں ادھر ادھر پھینک دی اب بابا اس کو کہے دروازہ کھولو ،چابی مل نہیں رہی تھی وہ کیسے کھولتی وہ میاں بیوی ساری رات لڑتے رہے اور صبح ان کو دروازہ توڑ کر باہر نکالا۔

۳۔والد اور والدہ کے باہمی تعلق کو آپ نے کیسا پایا؟

جواب : اپنے والدین کا باہمی تعلق جو میں نے دیکھا ہے اس میں کسی بدمزگی یا تکرار

کا بھی تصور نہیں ہے لڑائی جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے والد محترم کی دوسری شادی کے باوجود آج تک اپنی والدہ کی زبان سے کوئی شکایت نہیں سنی، اگر کوئی مسئلہ نہ بھی ہو تو بھی ہمارے معاشرے میں خصوصاً برصغیر میں شاید ہندوانہ اثرات کی وجہ سے دوسرے مسلمان ممالک کی نسبت یہ چیز عموماً مسائل کھڑے کر دیتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ والد محترم کی شخصیت کا اثر ہے کہ الحمد للہ نہ صرف ہمارے والدین بلکہ بہن بھائیوں میں بھی سرے سے اس کا کوئی تصور نہیں۔

۴۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ روحانی اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے، حضرت جی آپ کو وہ توجہ نہیں دے سکے، جو ایک عام باپ اپنے بچوں کو دیتا ہے؟

جواب: یہ ضرور ہے کہ والد محترم کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی شخصیت اتنی ہمہ جہت ہے کہ وہ جتنا بھی وقت فیملی کو دیتے ہیں اور جو دوستانہ ماحول ان کی موجودگی سے بنتا ہے وہ وقت کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا وہ اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اپنی تمام مصروفیات کے باوجود کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے ہمارے بچے ہم سے زیادہ ان کے گرویدہ ہیں۔

۵۔ آپ کو حضرت جی کی شخصیت کا کونسا پہلو زیادہ متاثر کرتا ہے؟

جواب: ان کا انتہائی پر اعتماد اور باعمل ہونا (Practical) ہونا۔

۶۔ ان کی روحانیت کے حوالے سے کوئی ایسا واقعہ، جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟

جواب: دس بارہ سال پہلے کی بات ہے گلبرگ لاہور میں ہم تاج رحیم صاحب کے گھر ناشتے پر گئے، گلوکار اخلاق احمد جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ ان کے پڑوسی تھے۔ وہ وہاں آ گئے بیماری سے ان کا برا حال تھا وہ ان دنوں انگلینڈ سے مایوس ہو کر واپس لوٹے تھے انہوں نے وہ تعویذ والا پانی پینا شروع کیا اور تین چار مہینے کے اندر وہ نارمل ہو گئے اس کا اعتراف انہوں نے خود انٹرویو میں بھی کیا۔

۷۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی جو تصویر حضرت جی نے آپ کو دکھائی وہ صحیح ہے یا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟

جواب: میرے خیال میں اس دور میں دین اور دنیا دونوں کے حوالے سے جو توازن والد محترم کی شخصیت میں نظر آتا ہے وہ انھی کا خاصہ ہے اور یہ بہت مشکل کام ہے۔

۹۔ حضرت جی کی روحانی تعلیمات کو آپ کتنا Follow کرتے ہیں؟

جواب: جہاں تک آئیڈیالوجی کا تعلق ہے تو سو فیصد اور عملی طور پر میں اپنی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ جتنا ہم کر سکتے ہیں، مواقع اور تعلق کی وجہ سے اتنا شاید نہیں کر سکے اللہ ہمت اور توفیق دے، لیکن ان کی شخصیت کا یہ اثر ضرور ہے کہ زندگی میں تصنع نہیں ہے جو ہے سامنے ہے۔

۱۰۔ ایک بڑے آدمی کا بیٹا ہونا آپ کو کیسا لگتا ہے؟

جواب: ظاہر ہے بہت اچھا لگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کوئی خاص مخلوق نہیں سمجھا' یہ شاید والد محترم کے مزاج کا اثر ہے کیونکہ وہ خود بالکل نارمل لائف گزارتے ہیں اور پروٹوکول کے قطعاً قائل نہیں ہیں۔

۱۱۔ سیاست روحانیت، ادب اور کاروبار میں سے آپ کو ان کی کونسی صفت زیادہ اچھی لگتی ہے؟

جواب: روحانیت، کیونکہ ان کے باقی تمام شعبہ ہائے زندگی پر سب سے زیادہ اثر اسی چیز کا ہے۔

۱۲۔ بطور شاعر اور ادیب آپ کو حضرت جی کیسے لگتے ہیں؟

جواب: ادب سے مجھے ویسے بھی دلچسپی ہے اور کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا ہوں ابو کی جتنی تحریریں ہیں شاعری ہو یا نثر ان میں ایک روانی اور تسلسل ہے اور روحانیت کے اثرات اس کو عام شاعری اور ادب سے منفرد چیز بنا دیتے ہیں۔

(چھوٹی بی بی جی کے بھائی)

حاجی خدا بخش صاحب

سوال۔ آپ سلسلہ میں کب آئے؟

جواب۔ یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے اعلحضرتؒ، سلسلہ میں کسی کو بڑی مشکل سے شامل کرتے تھے۔ میرے لئے حضرت جی مدظلہ نے چھ مہینے تک سفارش کی تھی تب کہیں جاکے حضرت جیؒ مانے تھے؟

سوال۔ کیا آپ جانتے تھے کہ مولانا اللہ یار خانؒ صاحب کے بعد مولانا محمد اکرم اعوان صاحب ہی سلسلے کے شیخ بنیں گے؟

جواب۔ میں کیا یہ بات تو سب جانتے تھے

سوال۔ کس طرح سے؟

جواب۔ وہ یوں کہ جماعت میں کوئی دوسرا شخص ان کے پائے کا نہیں تھا نہ زہد و تقویٰ میں اور نہ ہی منازل میں یہ پرہیز گاری' مراقبات' مجاہدات اور مالی قربانیوں

میں سب سے آگے تھے۔ جماعت پہ سب سے زیادہ وقت اور پیسہ انھوں نے ہی خرچ کیا ہے۔ مجاہدات میں ان کا یہ عالم تھا کہ یہ ہم سب سے دو گھنٹہ پہلے اٹھ کر لطائف کرنے شروع کر دیتے تھے ہم دو گھنٹے بعد جا کر کہیں ان کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ یہ چھ چھ گھنٹے تک لگاتار ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ اعلٰحضرتؒ نے زندگی ایام میں ہر ملنے والے سے یہ کہا کہ "جاتے ہوئے اکرم سے ملتے جاؤ" وہ انہیں بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کا مقام ان کے خلیفہ والا تھا۔

سوال۔ حضرت جی آپ کے رشتہ دار بھی ہیں اور شیخ بھی تو آپ کو یہ کیسا لگتا ہے؟

جواب۔ وہ میرے شیخ پہلے ہیں اور رشتہ دار بعد میں۔ میں ان کا ادب اسی طرح کرتا ہوں جس طرح ایک مرید کو کرنا چاہیے۔ اس لئے بھی کہ میں ان کے مقام کو جانتا ہوں ان کے مرتبے سے واقف ہوں لہذا مجھے ان کے رشتہ دار ہونے سے زیادہ ان کا مرید ہونے پہ فخر ہے۔

سوال۔ حضرت جی کے بارے میں (حیثیت شیخ) آپ کو کوئی ایسا واقعہ یاد ہے جو آپ ہمیں سنانا چاہیں۔

جواب۔ یوں تو بے شمار واقعات ہیں لیکن دو واقعات ایسے ہیں جن کی مثال تاریخ تصوف میں نہیں ملتی۔

ایک واقعہ اعلیٰ حضرتؒ کے زمانے کا ہے ہم لوگ ایک مسجد میں حضرت جی کے ساتھ ذکر کر رہے تھے۔ جونہی ہم نے ذکر شروع کیا تو اترنے والے انوارت سارے گاؤں کو دکھائی دیئے اور پورا گاؤں دوڑا آگیا کہ شاید مسجد کو آگ لگ گئی ہے۔ وہ لوگ جب بھاگے بھاگے آئے تو آگے ہم لوگ ذکر کر رہے تھے۔ یعنی انکشافات ان لوگوں کو بھی ہو گئے جو خود ذاکر نہیں تھے۔

دوسرا واقعہ ۱۹۹۴ء کا ہے۔ میں دل کے مرض میں مبتلا تھا۔ مجھے پنڈی لے جایا

گیا اور میری حالت کے پیش نظر مجھے ہسپتال داخل کر دیا گیا اور آکسیجن وغیرہ لگ گئی۔

ہاں تو جب مجھے آکسیجن وغیرہ لگ گئی تو بریگیڈئر صاحب نے منارہ فون پہ بتا دیا کہ حالت ٹھیک نہیں۔ اتنا سننا تھا کہ میری ہمشیرہ گھبرا کر رونے لگی کہ میں ان کا اکلوتا بھائی ہوں۔ حضرت رات کے کھانے کے لئے گھر آئے تو آگے کہرام مچا ہوا تھا۔ انہوں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور واپس دارالعرفان چلے گئے۔ رات انہوں نے میرا مرض سلب کر کے دارالعرفان میں ایک بندریا تھی۔ اس پہ پھینک دیا اور صبح اٹھے تو ڈاکٹر عظمت سے کہا جا کر بندریا دیکھ کر آؤ۔ وہ گئے اور واپس آکر بتایا کہ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے۔ حضرت نے فرمایا دوبارہ دیکھ کر آؤ۔ ڈاکٹر صاحب نے جا کر دیکھا تو وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے چھڑی سے ہلایا تو وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ وہ مر چکی تھی۔

یہ واقعہ اس لحاظ سے انوکھا ہے کہ "صوفیا کرام" سلبِ امراض کا عمل مریض کو سامنے بٹھا کر کرتے تھے جبکہ میں سو میل کے فاصلے پہ تھا اور حضرت جی دارالعرفان میں تشریف فرما تھے۔ ایسی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس کے بعد اگلے روز ہی میری حالت سنبھل گئی اور میں ٹھیک ٹھاک گھر واپس آگیا۔

ا

چاچا نذیر

خادم حضرت محمد اکرم اعوان

س :۔ آپ کو یہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے ملازمت کرتے ؟

ج :۔ میں گیارہ برس سے یہاں کام کر رہا ہوں۔

س :۔ کیا ڈیوٹی ہے آپ کی یہاں ؟

ج :۔ جی میرے ذمے اندر کے کام ہیں۔ اس کے علاوہ لنگر کا کھانا پکاتا ہوں۔ ٹینکی میں پانی پورا کرتا ہوں۔

س :۔ اگر چھٹی پر جائیں تو پیچھے لنگر کا کیا انتظام ہوتا ہے ؟

ج :۔ جی میرے بعد دوسرا خانساماں خان محمد ہے۔ وہ کام کرتا ہے۔

س :۔ آپ کو یہاں رہنا کیسا لگتا ہے ؟

ج :۔ جی میں ذات کا درزی ہوں۔ یہی میرا پیشہ بھی تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں کپڑے سیتا تھا۔ یہاں آیا تھا' حضرت جی سے ملنے' پھر ایسا لطف آیا کہ گھر جانے کو جی ہی نہیں چاہا۔ میرا بڑا لڑکا ٹیلر ماسٹر ہے۔ دوسرا بھی یہی کام کرتا ہے وہ کہتے ہیں گھر آ

جائیں۔ مگر میرا دل ہی نہیں مانتا گھر جانے کو۔

س :۔ یہاں سے جانا کیوں اچھا نہیں لگتا؟

ج :۔ بس جی۔ یہاں رہ کر دل کو خوشی ہوتی ہے۔ بڑا سکون ملتا ہے یہاں۔ یہاں سے نکلوں تو بے سکون ہو جاتا ہوں۔

س :۔ حضرت جی کی طبیعت کیسی لگی آپ کو؟

ج :۔ جی ان کی طبیعت کا تو پوچھیں ہی ناں۔ بہت اچھی طبیعت ہے ان کی۔ جب بھی بات کریں 'ہنس کر کرتے ہیں۔ کیا حال ہے نذیر خان' اس طرح بلاتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے غصے سے مجھے بلایا ہوں۔ یا مجھ پر ناراض ہوئے ہوں۔

س :۔ کبھی گھر سے دوری کا احساس ہوتا ہے؟

ج :۔ جی بالکل نہیں۔ بلکہ یہ کہوں تو زیادہ صحیح ہے کہ گھر یاد ہی نہیں آتا۔ ورنہ یہاں آنے سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ میں دو دن بھی گھر سے باہر نہیں گزار سکتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ چھٹی پر بھی جانے کو دل نہیں چاہتا۔

س :۔ اجتماع کے دنوں میں مہمانداری زیادہ ہونے کی وجہ سے پریشان تو نہیں ہوتے؟

ج :۔ ہم لوگ دارالعرفان کے کچن میں' عام روٹین میں' دو بندے کام کرتے ہیں۔ مگر جن دنوں مہمانداری زیادہ ہوتی ہے تو حضرت جی اور لانگری بلوا لیتے ہیں۔ ان دنوں میں ہم پانچ بندے ہوتے ہیں کام کرنے والے۔ اس لئے مل کر کر لیتے ہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

س :۔ کیا آپ ذکر کرتے ہیں؟

ج :۔ جی پابندی سے تو نہیں' مگر جب بھی وقت ملتا ہے ضرور کرتا ہوں۔ ویسے نماز کی اللہ کے فضل سے پوری پابندی ہے۔

س :۔ کبھی آپ سے کھانا خراب بھی ہوا؟ اگر ہوا تو حضرت جی نے کیا کہا؟

ج :۔ جی ایک دفعہ مجھ سے کھانا خراب ہو گیا تھا۔ کرنل صاحب نے لکڑی سے لے کر مرچ مصالحے تک کا بل 819 روپے بنایا تھا۔ حضرت جی کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا: کرنل صاحب سے کہ اس دفعہ کی جانے دیں' اگلی دفعہ ہوا تو دیکھا جائے گا۔ اسی طرح ایک دفعہ کرنل صاحب نے میری تنخواہ اور چھٹیاں کاٹ لیں' میں نے حضرت جی سے کہا۔ میری والدہ فوت ہو گئی تھیں' اس لئے چار چھٹیاں فالتو لی تھیں۔ حضرت جی نے پندرہ سو روپیہ مجھے دیا اور فرمایا' کرنل صاحب کو تنخواہ کاٹنے دو' وہ تمہارا ساست سو روپیہ کاٹ رہے ہیں تم مجھ سے پندرہ سو لے لو۔ اس کے علاوہ والدہ کی وفات پر مجھے خرچے کے لئے تین ہزار روپیہ دیا' اسکے علاوہ بھی باقی ضرورتوں کا اسی طرح خیال رکھتے ہیں۔ یعنی انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ خود بخود جان لیتے ہیں۔

ہارون الرشید سے باتیں

بطور ایک اخبار نویس کے کوئی بہت اچھا تاثر نہیں تھا' جو ابتدا میں' میرا بنا' سوائے اس کے ،کہ جماعت اسلامی والوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا' یہ وہی بات کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں۔ پورے اسلام کی بات کرتے ہیں۔ لیکن جرنلسٹوں کا رویہ تھوڑا سا شک بھرا ہوتا ہے۔ جو نیا لیڈر merge ہو رہا ہو' تو پیشے کے اعتبار سے وہ اسے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اب بات جو ان کے بارے میں کہی جاتی تھی یہ وہ آدمی ہے جو ڈاکے ڈالتا رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ہو تا تھا کہ تائب ہو گیا' اچھی بات ہے۔ مگر یہ نہیں گمان ہو تا تھا کہ کوئی اتنا بڑا آدمی ہے۔ میرے بھائی جو ہیں وہ ان سے ملے۔ اور میرے جو چھوٹے بھائی نیویارک میں رہتے ہیں۔ وہ انکی اب ایک طرح سے وہاں نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ وہ ذرا Different آدمی ہیں۔ میرے ایک بھائی ہیں یاسین صاحب' سینئر طارق چوہدری سے بڑے۔ وہ بہت ذکر کرنے والے آدمی ہیں۔ اور بہت ان کا تعلق رہا۔ عالم اسلام اور مسلمان لیڈروں سے' وہ لندن میں رہتے ہیں۔ مولانا مودودی ان کے ہاں ٹھہرتے تھے اور دوسرے لوگ بھی' ان کے

والد کا بھی بزرگوں سے تعلق رہا۔ انہوں نے ذکر کرنا شروع کیا مولانا اکرم اعوان کا' اور یہ کہا کہ وہ بڑے مرتبے کے آدمی ہیں۔ اور مجھے اس پر تعجب ہوتا تھا کہ میرے بھائی ہیں' پڑھے لکھے آدمی ہیں اور وہ جلدی کسی سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں' فیملی بیک گراؤنڈ کچھ ایسا ہے Experience بھی کافی رہا ہے۔ یہ جو میرے بھائی ہیں ان کی ضیاء الحق سے بڑی پرانی دوستی رہی۔ عام طور پر وہ کوئی جلدی اچھی رائے دینے والے نہیں تھے۔ محتاط آدمی تھے۔ بہت نیک آدمی وہاں لندن میں ہیں۔ بہت ذکر کرنے والے آدمی ہیں بہت زیادہ۔ انہوں نے ایک دفعہ بتایا کہ تیس بتیس سال سے وہ ہمیشہ وضو کے ساتھ رہتے ہیں۔ کاروباری آدمی ہیں۔ تو مجھے تعجب ہوتا تھا۔ میرا خیال تھا خوش گمانی ہے۔

یہیں ڈیفنس میں ایک دفعہ حضرت جی سے ملاقات ہوئی' یاسین صاحب کے گھر' جو بعد میں ڈیفنس زیڈ بلاک میں شفٹ ہو گئے تھے۔ تو حضرت صاحب نے فرمایا' میں تو نہیں جانتا ہوں' پتہ نہیں یہ بھی مجھے جانتے ہیں کہ نہیں۔

یہ دسمبر کا مہینہ تھا جی۔ 98ء کا۔ میں خاص طور پر انہیں ملنے کے لئے گیا اور میں اپنی پوری پریکٹیکل لائف میں کبھی کسی آدمی سے ملنے نہیں گیا۔ یہ ایک انکار ہے میری طبیعت کا' اسلئے کہ میں early جرنلزم میں آگیا۔ اور میں نے لوگوں کو بہت دیکھا ہے۔ میری رائے بہت خراب ہے۔ لیڈروں کے بارے میں' عمومی طور پر' اور میری یہ بالکل پختہ رائے ہے کہ ان میں جو بہتر لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی انسانی احساسات کے تاجر ہیں۔ ان کے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔ خیر میں گیا درس قرآن سننے کے لئے It was something very very un-usual قرآن کا اپنا اثر تو ہے ہی۔ لیکن جس طرح اسکو انہوں نے پیش کیا۔ اب میں اس کو بڑی اہمیت دیتا ہوں کہ قرآن کی اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی

شوکت اور وجاہت ہے' اس کی ایک پُراسراریت ہے' اور اس کو عام طریقے سے بیان نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے پہلا آدمی دیکھا' جس نے قرآن کو اس طرح بیان کیا' جس طرح بیان کرنا چاہئے۔ اور اللہ کا ذکر اس طرح سے کیا' جس طرح سے اللہ کا ذکر کرنا چاہئے۔ اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مجھ پر' حالانکہ سردی تھی' باہر کھلی جگہ پر بیٹھے رہے اب میں نے ایک چیز قریب سے دیکھی ہے۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ صوفی کتنا بڑا آدمی ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے کہا' جی اگر کسی کا والد بیمار ہو' اور وہ اس کی خدمت پر مامور ہو اس کا مرشد اسے طلب کرے تو اسے کیا کرنا چاہئے تو انہوں نے کہا۔ اس کا مرشد اسے طلب نہیں کرے گا۔ وہ وہاں بیٹھا اس کی تربیت کر سکتا ہے۔ میرے لئے ایک تعجب خیز جواب تھا یہ' بالکل نئی دنیا کا' جیسے انکشاف ہو رہا ہو۔ ایک آدمی نے حضرت میاں محمدؒ صاحب کا ایک شعر پڑھا۔

خاصاں دی گل عاماں اگے نئیں مناسب کرنی

مٹھی کھیر پکا محمد کتیاں اگے دھرنی

مجھے بڑا ناگوار گزرا۔ یہ کیا مصرع ہے۔ میاں محمدؒ بہت بڑے شاعر تھے۔ مگر بڑے شاعروں کے کمزور مصرعے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اسکی جو تشریح انہوں نے کی قرآن کے حوالے سے کی اور بڑی عجیب بات اس میں یہ کہی کہ لوگوں سے ان کی عقل کی سطح پر بات کی جائے۔ قولو للناس علیٰ قدر عقولیهم میں نے کہا یہ تو کوئی زیادہ گہرا آدمی ہے۔ پھر وہاں ایک آدمی نے بدتمیزی کی۔ اس نے کہا' آپ کوئی پیر ہیں۔ یا روحانی پیشوا یا لیڈر ہیں' یا خود نمائی کے مریض ہیں۔ میں جدہ میں آپ سے ملا' آپ نے ملاقات کا وقت دیا اور میں گیا تو آپ ملے نہیں۔ پتہ چلا آپ مریدوں کے ساتھ ہیں۔ تو انہوں نے کہا' میں کیا ہوں' یہ تو لوگ ہی فیصلہ کر سکتے ہیں' اور میں ایک بیسویں صدی کا آدمی ہوں' ہو سکتا ہے' میرے اندر خود نمائی بھی پائی جاتی

ہو۔ آپ آئے ہوں ممکن ہے' مجھے اطلاع نہ دی گئی ہو' یا کوئی ایسی مجبوری ہو' جب وہ جانے لگے تو اس آدمی سے وہ خاص طور پر ملے اور کہا کہ کوئی لڑنے بھڑنے والا بھی تو ہونا چاہئے۔ میرے دل پہ ایک اثر ہوا؟ لیکن میں نے اپنے بھائی سے یہ کہا۔ کچھ دن کے بعد کہ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جب کسی آدمی میں کسی خوبی کا ظہور دیکھو تو دوسری خوبی کے ظاہر ہونے کا انتظار کرو۔ اس بات سے مجھے کوئی انکار نہیں ہے کہ مجھے یہ آدمی اچھا لگا۔ لیکن ابھی دیکھتے ہیں' کچھ جائزہ لیتے ہیں۔ بڑا ہم نے لوگوں پر زندگی میں اعتماد کیا۔ جنرل حمید گل کو لائے' پالیٹکس میں' عمران خان کو لائے' اور کئی تجربات ہوئے' اگرچہ اب بھی میری ان کے بارے میں رائے بری نہیں ہے' لیکن وہ ناقص ہی رہا تجربہ کوئی اچھا نہیں۔ اور لوگوں کو بھی قریب سے دیکھا۔ مگر پھر وہ ایک کیفیت طاری ہوتی گئی۔ اس لیے کہ صوفی جو ہے وہ آپ کے اندر داخل ہو جائے تو نکلتا نہیں ہے۔ میں نے ان سے انٹرویو کیا۔ مگر انٹرویو میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ یا تو گفتگو میں سوال ٹھیک طرح سے نہیں کر سکا' یا وہ اس کیفیت میں نہیں تھے۔ میں نے کہا جو بات آپ کہتے ہیں اگر وہ صحیح ہو تو اس پر کتاب لکھنی چاہئے۔ انہوں نے کہا اس کا وقت نہیں آیا۔

پھر میں نے ایک کالم میں لکھا کہ ایک کیفیت محسوس کی۔ کہ یہ آدمی سوال کا جواب دیتا ہے۔ جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ ان سوالوں کے جواب نہیں دیتے' مگر یہ سوال کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کس طرح گزارنی چاہئے اور دوسری دنیا کیا ہے۔ لیکن میں اس آدمی کو Discribe نہیں کر سکتا' اس لئے کہ نور کا دریا بہہ رہا ہو تو آدمی گم ہو جاتا ہے' اسے دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے۔ تو پھر میں نے جانا شروع کیا ان کے پاس' انہوں نے بڑا تپاک ظاہر کیا۔ پھر جب میں منارہ گیا تو وہ ایک بڑا تحیر خیز تجربہ تھا۔ رات کو وہاں ایک صاحب ملے' جو کسی زمانے

میں بالکل ملحد ہوتے تھے۔Non-believerانھوں نے کچھ چیزیں مجھے بتائیں۔ اس میں ایک چیز یہ تھی کہ 83ء میں مولانا اللہ یار خان' جو حضرت صاحب کے مرشد تھے۔ انھوں نے ایک دن فوجی افسروں کو کہا کہ روس جو ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ تباہ ہو جائے گا۔ میرے لئے یہ تعجب کی بات تھی میں نے افغانستان کی جنگ کو بہت قریب سے Watch کیا' دسمبر 79ء سے 89ء تک میں برابر اس پر لکھ رہا ہوں۔ اس کی رپورٹنگ میں نے کی ہے' اس کے تجزیئے لکھے ہیں' تمام افغان لیڈروں سے میرے مراسم رہے ہیں۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ 86ء سے پہلے یہ کسی کو گماں ہی نہیں تھا' کوئی شخص یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ روس جا سکتا ہے اور ٹوٹ جائے گا۔ اسکی بڑی گرفت تھی اور کوئی ایسے حالات نہیں تھے' جب تک سنگر نہیں آگیا' جو 86ء جون میں آیا ہے۔ اس وقت تک اس کی کوئی پاسبلٹی نہیں تھی۔ 83ء میں ایک آدمی کیسے کہہ سکتا ہے' پھر انھوں نے یہی نہیں کہا۔ انھوں نے کہا کیسٹ لاؤ' اسپر ریکارڈ کرایا کہ روس ٹوٹ جائے گا' اور روسی بھیک مانگا کریں گے۔ یہ بھیک مانگنا علامتی نہیں ہے' روسی افسر بھیک مانگتے دیکھے گئے ہیں۔ اور ملک بھی بھیک پر چل رہا ہے۔ پھر انھوں نے کہا' انڈیا ٹوٹ جائے گا' میری موت کے پچاس سال کے اندر اندر' یہ بھی ریکارڈ کرایا۔ میرے لئے یہ بڑا تعجب خیز تھا۔ پھر میں نے لوگوں کو وہاں گارڈ سے لے کر سکول ٹیچر تک' پرنسپل اور جو عام پٹرول پمپ پر کام کرنے والے ہیں' مختلف لوگ ہیں اچھے لوگ ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے' پالیٹکس میں یا دینی جماعتوں میں کج بحثی ضرور کرتے ہیں' غیر ضروری حث مباحثہ اور اپنے لیڈروں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اور بہت غیر ضروری چیزیں مبالغہ کرنا۔ مگر میں نے دیکھا یہ لوگ جھوٹ نہیں بولتے' مبالغہ نہیں کرتے' تو کچھ Communication شروع ہوئی' ان سے پالیٹکس اور ہسٹری وغیرہ پر بات

ہوتی رہی۔ اور جب بات ہوئی تو کئی دفعہ ایسا ہوا میں دس بجے حضرت جی کے پاس گیا تو باتوں میں رات کا ایک بج گیا۔ وہ خصوصی مہربانی کرتے رہے اور میرے لئے وقت نکالتے رہے۔ یا تو مجھے اپنے پاس بلا لیتے یا پھر جہاں میں ٹھہرا ہوتا وہاں آجاتے۔ میرا حافظہ بہت اچھا نہیں ہے۔ تفصیلات یاد نہیں رہتیں، مگر مولانا روم، مظہر جان جاناں کے بارے اور تصوف پر ان کی گفتگو کا معیار اتنا اعلیٰ ہے کہ مجھے زندگی میں اس کا مشاہدہ نہیں ہوا۔ نہ کسی کتاب میں، نہ کسی بڑے مثلاً مولانا مودودی، جن سے میں ملتا رہا ہوں اور بھی لوگوں سے ملتا رہا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے تامل تھا اس لئے کہ میں اپنے مزاج کو سمجھتا ہوں کہ میں ڈسپلن وغیرہ فالو نہیں کر سکتا۔ بعض چیزوں میں میری اب بھی ایک Observation ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان جو ہے وہ انسان ہی ہے۔ اللہ کے پیغمبر کے سوا سب انسان ہیں۔ لیکن بعض باتوں کا بہت اثر ہوا۔ ایک رات کو میں جاوید چودھری کو اپنے ساتھ لے کر گیا۔ رات کو ہم سوا ایک بجے اٹھے اور پھر میں نے دیکھا وہ ساڑھے تین بجے تہجد کیلئے بھی اٹھ گئے۔ میں نے ان کے مشاغل دیکھے 'شکار کرنا' بیل پالنا اور گھوڑے پالنا۔ لوگوں سے ملنا' اور ان کی سطح پر Communicate کرنا۔ ان سب چیزوں کے بعد ایک Perfect نارمل آدمی کی زندگی گزارنا۔ میرے لئے سب سے حیران کن تھا۔ اس لئے کہ کسی لیڈر کو میں نے نارمل زندگی گزارتے نہیں دیکھا۔ میں نے ایرانی لیڈروں افغان لیڈروں کو بھی دیکھا ہے۔ پاکستانیوں کو بھی دیکھا ہے۔ ہسٹری پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر میں نے کوئی شخص ایسا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا، جو اس درجے پر فائز ہو کہ اسی 'نوے ہزار' آدمی جس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہوں۔ (موت پر بیعت) جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ صبح سے شام تک لوگ فدائین کی طرح جس کے پاس آتے ہوں اور وہ hundred percent نارمل زندگی گزارے۔ میرے لئے یہ Miracle

تھا۔ پھر کچھ اور چیزیں میں نے دیکھیں' مثلاً یہ کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی جب ان کے پاس آتا ہے میں کسی کا نام لئے بغیر یہ کہتا ہوں کہ وہ Atlips ہو جاتا ہے۔ اور یہ غیر معمولی روحانی قوت کے سوا نہیں ہو سکتا۔ اور لوگوں کے قلب پر اثر ہوتا ہے ایک سب سے زیادہ مینشن کرنے والی چیز شاید یہ ہے کہ میں نے محسوس کرنا شروع کیا' ایک زمانے میں کہ جب میں یہاں آتا ہوں تو ایک خاص رغبت دین کیلئے پاتا ہوں کہ اس سے پہلے کبھی اس طرح نہیں ہوئی کتاب پڑھتے ہوئے کبھی ہوئی ہو' کسی آدمی کی صحبت میں تو ہلکی سی سطح پر ہوئی اس سطح پر نہیں ہوئی کہ آدمی کو اپنی غلطیوں 'کوتاہیوں کا احساس ہو' جذبے کی شدت پیدا ہو کہ کوئی بھلا کام کرنا چاہئے۔ لوگوں پر غصہ نہ آئے۔ مجھے سوائے عمرہ کے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا کہ آدمی کے دل میں غبار بھرنے لگے اور نفرت کم ہونے لگے۔ ایک دفعہ میں نے یہ دیکھا' چکوال تک پہنچے اور وہاں سے میں نے محسوس کیا کہ دل کی حالت بدل رہی ہے۔ اور اس کو مانیٹر کرنا چاہئے۔ گھر جیسے جیسے قریب آتا ہے حالت بالکل اور ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات میں آپ کو بالکل ایمانداری سے بتا رہا ہوں میں زندگی میں کبھی کسی سے ملنے نہیں گیا۔ میرا تجربہ ہے کہ بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آدمی ذہین تو ہو سکتا ہے مگر اخلاقی اعتبار سے یا Otherwise کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے جیسے لوگ ہوتے ہیں کچھ چیزوں میں اچھے ہو سکتے ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا کہ اثر ہوتا ہے۔ پنڈی گیا تو دیکھا ایک دفعہ میری یہ کیفیت ہوئی' جب میں مری روڈ پر گیا تو میں نے چاہا کہ منارہ واپس چلا جاؤں۔ حیرت کی بات ہے اس طرح کسی سے ملنے کو کبھی دل نہیں چاہا' حالانکہ اور بھی نیک لوگ تھے' ان میں اچھے لوگ بھی تھے۔ میرے ایک خالہ زاد بھائی ہیں سینیٹر طارق چوہدری' بہت ٹیڑھے آدمی ہیں۔ انہوں نے زندگی میں کسی کی نہیں مانی۔ ضیاء الحق نے انہیں سینیٹر بنایا' مگر

انہوں نے اسکی ایک بات نہ مانی۔ غلام اسحاق خاں ان کا سرپرست تھا' انہوں نے وزارت دینی چاہی' انہوں نے انکار کر دیا۔ نواز شریف کو وزیر اعلیٰ بنانے میں ان کا Contribution تھا' مگر نواز شریف کی کوئی بات انہوں نے نہیں مانی' مگر بھی ان کی یہی حالت تھی۔ Otherwise بڑے مضبوط مارل سپرٹ کے آدمی ہیں۔ صاف ستھرے آدمی ہیں۔ بات کسی کی نہیں سنتے۔ میں نے دیکھا کہ وہ مولانا اکرم اعوان کے قریب گئے تو انہوں نے تہجد پڑھنی شروع کر دی۔ پہلے وہ میری طرح بے قاعدہ نماز پڑھتے تھے' پھر نماز کی باقاعدگی ہو گئی روزے بھی رکھنے شروع کر دیئے۔ یہ ایک indication تھی۔ مجھے انہوں نے کہا' یہ شخص اتنی صاف ستھری زندگی گزارتا ہے اور یہ جو دنیا پر جھوٹ نہیں بولتا' یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بارے میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔ This was the time per-haps میں نے محسوس کیا کہ ان سے باقاعدہ تعلق ہونا چاہئے۔ کیونکہ میرا بھائی (سینیٹر طارق چودھری) بہت کم رائے دیتا ہے اور جلدی رائے نہیں دیتا اور عام طور پر اسکی رائے مستحکم ہوتی ہے۔ پھر چھوٹے بھائی نے چھ صقارہ اکیڈمی میں داخل کروایا' تجربہ بہت اچھا رہا' پھر دوسرے بچوں کو بھی وہاں داخل کروایا۔ میرے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ بڑا آزاد آدمی ہے اور اپنی بڑی ذاتی رائے دیا کرتا ہے۔ پھر میں نے بیعت کر لی۔ مگر اسکو اس طرح سے پریکٹس نہیں کیا جس طرح دوسرے کرتے ہیں۔ مگر ان سے ایک تعلق استوار ہو گیا اور پہلی دفعہ میں نے تصوف کو پڑھنا شروع کیا۔ ورنہ ہمارا تو تعلق اہلحدیث سے ہے اور ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ پیر جو ہوتے ہیں ٹوٹلی فراڈ ہوتے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بھی اپنی زندگی کے بارے میں بیشمار باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا' بات یہ ہے ہارون الرشید' اسی سڑک پر میں ڈاکو کے طور پہ رہتا تھا۔ یہیں میں نے بسیں لوٹیں۔ مجھے اس بارے میں تھوڑا پتہ تو تھا مگر

ایک حجاب رکھتا تھا' احترام اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں نے پوچھا باقاعدہ کام کرتے تھے۔ کہنے لگے باقاعدہ ہی کرتے تھے کس لئے کہنے لگے اپنی چودھراہٹ کے لئے کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔ صرف یہ کیا کہ گھر پیسے لے کر نہیں گئے' وہیں بانٹ دیتے تھے' کس لئے میں نے حیرت سے پوچھا۔ اُس یار رزق حرام کھانے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی' شاید اسی لئے اللہ نے بچالیا۔ پھر انہوں نے حضرت اللہ یار خانؒ کے بارے میں بتایا کہ کیسے ان سے تعلق قائم ہوا۔ انہوں نے بتایا' ان کا عالم تو یہ تھا کہ کوئی شخص ان سے گفتگو نہیں کر سکتا تھا' آپس میں مشورہ کیا جاتا تھا کہ کون ان سے بات کرے اور کیسے کرے۔ بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ کم لوگوں کو بیعت کرتے تھے اسلئے کہ تربیت کی ذمہ داری ہے۔ مگر حضرت جی نے تو Concept ہی بدل دیا ہے اس کا۔ اسلئے کہ زمانے کا تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس لیے بھی بدل دیا کہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے لئے جس قوت اور فیصلے کی ضرورت ہے وہ ایسے ہی ہیں۔ وہ طبعاً لیڈر بھی ہیں محض صوفی نہیں ہیں۔ اللہ نے بڑا Confidence دیا ہے انہیں۔

پھر میں نے دیکھا ان کے ساتھ شکار پر میں جاتا۔ عصر کے وقت جاتے تھے اور کوئی آٹھ دس کلو میٹر جانا اور واپس آنا' عصر پڑھ کے تو پھر عشاء تک اور وہ جو میں نے کہا ایک نارمل آدمی کی زندگی' اچھا مذاق بھی اور شاعری اور لطیفے بازی بھی لیکن بڑی شائستہ حدود کے اندر اور یہ جو عظیم لوگوں کا وصف ہے' جو لوگوں کی حالت بدلتے ہیں کہ وہ لوگوں میں گھل مل کر رہتے ہیں' مگر اس کے باوجود کوئی ان سے بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کرتا۔ اور میں نے ان کے اندر جو چیز دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بندوں سے مرعوب نہیں ہوتے اور جی سیدھی بات ہے' جس کا اللہ سے تعلق ہوگا اسکو بندوں کی مرعوبیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اور بندہ ہے ہی وہی جو

مرد آزاد ہے۔ میرا اپنا تھیسز یہ ہے زندگی کا ساڑھے تیس سال کے Experi-ence کا کہ میں نے برصغیر کی سیاسی تاریخیں پڑھی ہیں اور لیڈروں کو دیکھا ہے اور جو پولیٹیکل ہسٹری پڑھی ہے۔ جس سے مجھے Interest رہا ہے۔ دراصل برصغیر کا معاشرہ ایک غلام معاشرہ ہے۔ اس کے اندر خوئے غلامی بہت ہے۔ ہر آدمی میں کہیں نہ کہیں خوئے غلامی ہے۔ ہر آدمی میں کہیں نہ کہیں کمتری ہے۔ بڑوں سے ڈرتا ہے اور کمزوروں پر زیادتی کرتا ہے۔ یہ اس معاشرے کی روح کے اندر ہے جب تک غلامی اس معاشرے کے اندر سے نہیں نکلتی یہ کبھی صحت مند معاشرہ نہیں بن سکتا۔ اور یہ چیز میں نے جرنلسٹوں میں بھی دیکھی۔ پولیٹیکل ورکرز میں بھی' اور فوجیوں میں بھی دیکھی ہے۔ مگر یہ میں نے ایک آدمی دیکھا ہے جو آزاد آدمی ہے۔ جس کے اندر مجھے خوف نظر نہیں آتا۔ اور مرعوبیت نہیں کسی چیز سے۔ ظاہر ہے عقل کل تو دنیا کا کوئی آدمی نہیں ہو سکتا۔ وہ کوئی انگریزی یا فرانسیسی کا استاد بھی نہیں یا کوئی ساری ہسٹری تو انہوں نے نہیں پڑھ رکھی ہے' اور بھی کئی چیزوں میں کمی ہو سکتی ہے وہ جو آدمی کو ہونا چاہئے ایک مرد آزاد کو' تو وہ ہیں۔ ایک میں نے ان کے معاملہ میں یہ بھی دیکھا ہے کہ ان کے اندر Bitterness نہیں ہے۔ یہ میرے لئے اخبار نویس کے نقطہ نظر سے تعجب خیز تھا۔ وہ اپنے مخالفین کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں کدورت اور رنج نہیں ہوتا۔ تنقید تو کرتے ہیں مگر اس میں بغض و عناد نہیں ہے خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ وسعت ہے۔ مطالعہ بڑا وسیع ہے اور ایک فکرمندی ہے لوگوں کی اصلاح کرنے کی اور کشش تو ایسی ہے میں نے دیکھا' جہاں کہیں وہ گئے۔ لوگ ان کی طرف کھنچے لگتے ہیں۔

ایک صاحب ہیں جنہوں نے Forty Seven کا Agitation لانچ کیا تھا۔ M.S.f کے پلیٹ فارم سے، نسیم انور بیگ۔ وہ الگ تھلگ رہنے والے ہیں۔ لوگ

ان کے پاس جاتے ہیں۔ مجید نظامی صاحب بھی جاتے ہیں۔ حمید گل بھی جاتے ہیں۔ ایس ایم ظفر بھی جاتے ہیں۔ اور ہم بھی ان کے پاس جاتے تھے۔ وہ بزرگ آدمی ہیں ان معنوں میں کہ شریف آدمی ہیں۔ بڑی تواضع اور انکسار ہے طبیعت میں۔ شام کو محفل ہوتی تھی۔ فارن آفس سے لوگ بہت آتے تھے کہ وہ یونیسکو میں رہے تیس سال' تو فارن آفس کے لوگ انہیں باپ کا درجہ دیتے ہیں۔ قائداعظم کے ساتھ کچھ عرصہ کام کیا' اب تو کافی بوڑھے ہیں لیکن صحت اچھی ہے۔ تب وہ مجھ سے کہتے تھے حضرت جی سے کہیں' میرے لئے دُعا کریں' میری مرحومہ بیوی کے لئے دُعا کریں۔ تو حضرت کہتے تھے' ٹھیک ہے' مگر کبھی زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ میں نے انہیں ایک دفعہ بتایا کہ نسیم انور بیگ صاحب کہتے ہیں کہ گھر میں جو یہ گلاب کی جھاڑیاں ہیں' ان میں ہر جھاڑی پر سینکڑوں مرتبہ درود پاک پڑھا گیا' کیونکہ ان کی مرحومہ بیوی ان کی تراش خراش کرتے وقت ان پر درود پڑھتی رہتی تھیں۔ جب میں جانے لگا تو انہوں نے کہا' مجھے اس گھر کا پتہ بتائیں۔ میں نے کہا میں آپ کو لے جاؤں گا' تو کہنے لگے تمہارا کیا بھروسہ کبھی ملتے ہیں تو کبھی نہیں ملتے' کبھی ٹیلی فون خراب ہوتا ہے کبھی ٹھیک خیر میں نے پتہ بتایا اور وہ وہاں گئے اور پھر اکثر جاتے رہے میں نے دیکھا کہ اس آدمی کے رشتے اور محبت کی بنیاد ہی الگ ہے۔ یعنی یہ صرف اس وجہ سے اس گھر گئے اور جاتے رہے کہ وہاں کثرت سے درود پاک پڑھا جاتا رہا تھا۔ وہاں سے واپس آکر انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا' جس دن پہلی دفعہ تشریف لے گئے وہاں افتخار عارف فارن آفس کے لوگ' اکرم ذکی اور ہمایوں قاضی جو افغانستان میں سفیر تھے موجود تھے اور بھی اس طرح کے لوگ تھے، مجھے بہت لوگوں نے ٹیلی فون کیا بعد میں کہ رات کو نیند نہیں آئی۔ ہم اس بارے میں سوچتے رہے۔ نسیم انور بیگ جو قائداعظم کے سوا کسی کی تعریف ہی نہیں کرتے' انہوں نے کہا ایسی Presencc

تو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کی...... اچھا ایک اور بات عرض کروں۔ میں نے جب بھی ان سے کسی مرحوم آدمی مرحوم صوفی بزرگ کے بارے میں پوچھا' انھوں نے قطعی جواب دیا' یعنی پیر صاحب گولڑہ شریف حضرت سلطان باہو' بلھے شاہ جیسے بزرگوں کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ اچھا مجھے ایک شخص کے بارے میں Curiosity تھی، حسین بن منصور حلاج کے بارے میں، کہ اس میں متضاد رائے پائی جاتی ہے۔ وہ سرمستی اور قربانی کا سمبل بھی ہے اور بغاوت کا بھی۔ اقبال کے ہاں بھی اس کے بارے میں دو رائے پائی جاتی ہیں میرا اپنا ذاتی تاثر خراب تھا' اگرچہ اس کی کوئی تحقیق تو میں نے نہیں کی' میں نے حضرت سے پوچھا وہ کیا ہے کہنے لگے، وہ کچھ بھی نہیں مجذوب ہے' البتہ بات یہ ہے کہ جتنی منزلیں وہ طے کر چکا تھا وہ تو کر ہی چکا تھا وہ اس کا بوجھ نہیں سہار سکا' مجھے ایسے لگا بالکل کہ جیسے آپ کے سامنے سے کوئی پردہ ہٹ گیا ہو اور آپ کو صاف صاف نظر آنے لگے۔ اتنی Clearity میں نے کہیں نہیں دیکھی' خیر یہ واقعہ ہوا' میں اسی دن افتخار عارف کو ملنے کے لئے گیا' تو اس نے مجھے دیوان دیا' منصور حلاج کا' انھوں نے کہا یہ میں نے تمہارے لئے رکھا تھا' میں نے کہا یہ کوئی عجیب Incident ہے' کوئی اتفاق ہو سکتا ہے۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو میں تو مبہوت ہو گیا جی۔ اس لئے کہ حمد کی شاعری تو ہم نے پڑھی ہے کچھ نہ کچھ' اس پر غور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر ایسی حمدیہ شاعری اس سے پہلے نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس میں سوائے ذات باری تعالیٰ سے محبت کے اور کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اور خیال اتنی رفعت پر ہے اور اتنی ندرت ہے اس کے اندر اور اتنی تنوع اتنی گہرائی ہے الفاظ کی، اور اتنا اپنے ماحول سے جدا کہ آدمی ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ الفاظ کا دروبست ایسا ہے کہ جو ابوالکلام کی بعض تحریروں میں اور اقبال کے لفظوں اور مصرعوں میں محسوس ہوتا ہے، پرانے عرب خطیبوں میں محسوس ہوتا

ہے کسی آدمی نے بہت تحقیق کی ہے۔ تمیں پنتیس برس خیر میں نے پڑھا، میں ایک دفعہ پھر مغالطے میں پڑ گیا ہو سکتا ہے حضرت جی کی رائے درست نہ ہو۔ میں نے ایک صاحب کے گھر سے آتے ہوئے ان سے کہا 'منصور حلاج تو کمال کا آدمی تھا۔ ذات باری سے میں نے ایسی محبت کہیں محسوس نہیں کی' اور وہ تاریخ کا منفرد آدمی ہے' کسی دوسرے شاعر نے یہ کام نہیں کیا تو انہوں نے مجھ سے کہا' یہ بات صحیح نہیں ہے اور حضرت سلطان باہو' سلطان العارفین جو ہیں ان کا کلام یہی ہے تو Suddenly میں نے realize کیا کہ میرا دھیان اس طرف تو گیا ہی نہیں۔ کبھی پڑھا تو تھا، باقاعدہ نہیں پڑھا مگر جتنا کچھ پڑھا تھا تو یہ خیال آنا چاہئے تھا۔ اتنی کلیرٹی آف تھاٹ ہے، پھر انہوں نے ایک کیفیت میں کہا کہ جب کبھی عالم بر زخ پر نگاہ پڑی ہے تو سلطان باہو کو ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ پایا ہے۔ انہیں کھڑے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ تو انہوں نے Casually کہہ دیا لیکن ایسا Casually نہیں کیفیت تھی' لیکن میرے تو یہ بات سن کر رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن مجھے اس کا یقین ہو چکا تھا کہ یہ جھوٹ بولنے والا آدمی نہیں ہے۔ خیر سچی بات تو یہ ہے کہ میں دم خود ہی رہ گیا، رفتہ رفتہ پھر یہ ادراک ہوا اور میں اس پر سم اپ کرتا ہوں کہ جو ایک ذکر کا ایلیمنٹ تھا اسلام کے اندر' اور جو کہ قرآن میں ہے کہ اٹھتے بیٹھتے لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ ہم لوگ قرآن پڑھتے تھے میں نے تجوید قرآن پڑھا تھا' لیکن عجیب بات ہے کہ کبھی اس پر نظر ہی نہیں ٹھہری تھی۔ اب یہ جو تہجد اور ذکر کا اہتمام ہے' اس کا نتیجہ یہ رہتا ہے کہ جو آلودگی Otherwise پیدا ہوتی ہے ماحول سے' اس سے وہ لوگوں کو بچاتے ہیں۔ خود بھی ظاہر ہے بچتے ہیں اور میں آپ کو ایک بات کی گواہی دیتا ہوں' بالکل اللہ کو گواہ کر کے کہ ان سے ملاقات سے پہلے میری اپنی زندگی میں، میں نے کبھی اطمینان محسوس نہیں کیا تھا۔ میں ایک نامطمئن آدمی تھا اور وہ جو ایک

خاص اصطلاح لوگ استعمال کرتے ہیںAngry young manکی مجھ پر پوری اترتی تھی۔

میں کوئی تو ہم پرست نہیں ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں مبالغہ بہت کیا جاتا ہے۔ جو نیک لوگ ہیں وہ زیادہ مبالغہ کرتے ہیں۔ کوئی آدمی پیغمبر تو ہو نہیں سکتا۔ نہ کوئی صحابہ کے مرتبہ پر پہنچ سکتا ہے۔ نہ میں انہیں جنید بغدادی سمجھتا ہوں۔ نہ حضرت علی ہجویری سمجھتا ہوں۔ مگر میں ان کو اس راستے پر ضرور سمجھتا ہوں۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ دوسرے کی بات سنتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی بات سنتے ہیں۔ زندگی کا مقصد اعلیٰ ترین ہے۔ وہ جو ایک عظیم ترین مقصد آدمی کا ہو سکتا ہے وہ انکا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کے اندر غیر معمولی کشش ہے اور محبت ان کی ایسی ہے کہ جو آدمی ان کے پاس بیٹھے گا وہ نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے' وہ ایسے لوگوں کو متوجہ کر سکتے ہیں جن کو کوئی نہیں کرتا' میں نے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا ہے وہ ایک ایسے آدمی کو جس نے کبھی شہر بھی نہ دیکھا ہو' اور ایسے کو جو امریکن یونیورسٹی کا پروفیسر ہو کیسوئی کیٹ کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک کام تھا تو میں نے کہا دعا کریں' پھر جب میں جانے لگا تو میں نے کہا دُعا کا وعدہ ہے آپ کا، تو انہوں نے مجھ سے کہا دُعا تو ہو چکی' مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ابھی تو ہم بیٹھے گفتگو کرتے رہے گپ کرتے رہے دعا کہاں ہو گئی۔ تو انہوں نے کہا ہارون الرشید دُعا الفاظ کا نام نہیں ہے دُعا اس آرزو کا نام ہے جو آدمی کے دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہے۔ اب میں خود ایک لکھنے والا ہوں میں نے تو الفاظ میں ایسا ربط کبھی نہیں دیکھا۔ یعنی دُعا وہ آرزو ہے جو آدمی کے دل کی گہرائیوں سے اٹھے!

سیاست میں بعض چیزوں سے مجھے اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ بعض اوقات ایسے لوگوں سے حسن ظن کرتے ہیں جو اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ یہ ان کی کرامت ہی ہے ان

حضرت مولانا اللہ یار خانؒ

حضرت ملک اکرم اعوان والد اکرم اعوان و عبدالرتیب اعوان

سے ان کو کام نہیں ہوتا' کوئی غرض نہیں ہوتی' ان سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا' میں نے انہیں بہت خوددار پایا ہے۔ سنا ہے ہر صوفی میں رسول اللہ کی ذات کے کسی نہ کسی وصف کا غلبہ ہوتا ہے خصوصاً رحم اور ترک کا۔ لیکن میں نے ان میں نسبتاً بہت زیادہ ہیلنس دیکھا ہے، لیڈروں سے تو ان کا تقابل ہی نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے اس سے بھی اختلاف ہے کہ انہیں سٹوڈیو میں نہیں جانا چاہئے تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ صرف نیک نیتی سے وہاں گئے۔ اس میں مجھے رتی برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ ہر صوفی زندگی میں کبھی نہ کبھی مذمت invite کرتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ایسا کیا جتنا میں نے پڑھا ہے تصوف کبھی نہ کبھی ضرور in-vite کرتا ہے۔ بہت سے بزرگوں کے واقعات ہیں یعنی ایک مشہور بزرگ تھے وہ حج کرنے کے لئے گئے۔ تو اہل مکہ ان کے استقبال کے لئے آگئے' انہوں نے رمضان کا مہینہ تھا' روٹی نکال کر کھانا شروع کر دی۔ رمضان میں آپ روٹی کھا رہے ہیں مریدوں نے کہا غالباً حضرت ابراہیم بن ادھم کا واقعہ ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے۔ کسی نے کہا سب کے سامنے کھانا ضروری تھا کیا، تو انہوں نے فرمایا نفس میں تکبر پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی بات ہے۔ جس کا ظاہر ہے وہ اظہار نہیں کریں گے۔ اور جو غزوہ ہند کا پہلو ہے اس کے بارے میں عرض کرتا چلوں۔ کہ اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے میرے دل میں یہ خیال غالب ہے اور میں اس بات پر یقین کرتا ہوں' اپنی عمر بھر کے غور و فکر کے نتیجے میں کہ اللہ انسانوں پر خیال کے ذریعے حکمرانی کرتا ہے۔ قائداعظم اکسٹھ برس کے بوڑھے آدمی تھے۔ بیمار تھے پاکستان بننے کا منطقی طور پر کوئی تصور ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہونا چاہئے تھا اور یہ Obsession ہو جائے تو یہ خارجی عمل ہے داخلی عمل نہیں ہے۔ میں نے ہزاروں لوگوں کو اس خیال میں مبتلا ہوتے دیکھا ہے اور یہ ایک ہوا ہے جو چلنا

شروع ہوئی ہے، کچھ عرصہ پہلے غزوہ ہند کوئی چیز نہیں تھی میرے دل پر اس خیال نے بڑی گرفت قائم کی' میں لوگوں سے ملا لوگ مجھے ملتے چلے گئے پھر میں نے اس پر لکھا' اس ملاقات سے پہلے جب میں ان سے ملا تو میں اس بات پر حیران ہی رہ گیا کہ یہ تو بالکل وہ بات کر رہے ہیں جو ہم متذبذب ہو کر، کر رہے ہیں۔ یہ واضح دلائل کے ساتھ کر رہے ہیں۔ ہمارے ذہن میں تو گمان ہی تھا۔ میں نے ان کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اتنی ورزش کرتے ہیں کہ اگر کبھی غزوہ ہند شروع ہو جائے تو وہ تیار ہوں۔ میں سمجھتا ہوں ان کا یقین محکم ہے۔ اگر ان کا پیغام پھیلتا جائے' اور بہت واقعات ہیں' میں اس وقت بتانا مناسب نہیں سمجھتا' کچھ چیزیں میں لکھ دوں گا۔ مجھے یقین ہے یہاں ایک بڑا معرکہ برپا ہونے والا ہے۔ وہ لوگ جو امریکہ کے کارندے ہیں' ویسٹ سے بہت زیادہ مرعوب ہیں' خودی جن کے اندر نہیں ہے' پوری غلامی ہے' ان کے خلاف ایک دوسرا گروہ ہے اور کوئی لیڈر تو ایسا پیدا ہوگا' جو تعصبات سے بالاتر ہو گا' اور بڑا لیڈر تو وہی ہے' زمانے کا رخ تو وہی بدل سکتا ہے' جو تعصبات سے بالاتر ہو اور جس پر پوری قوم متحد ہو سکے' کوئی آدمی اٹھے گا اور یہی لوگ ہوں گے یا ان کے لوگوں کے دستے اور جو لوگ ان کے دست و بازو ہوں گے' اس لئے ان کا ساتھ دینا' ان کو پروموٹ کرنا' ان کے ساتھ کھڑے ہونا' ان کی وکالت کرنا یہ سب باعث برکت ہے' میں ان کے ساتھ بیٹھ کر ذکر نہیں کر سکتا' یہ ایک الگ بحث ہے کہ کیوں نہیں کر سکتا۔ میری خامیاں ہیں' بعض کوتاہیاں' لیکن میں دلی طور پر سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ سوائے انسانوں کی بھلائی کے کوئی چیز نہیں چاہتے۔ میں نے ان کے اندر دنیا کا لالچ نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں ہر معاملے میں بڑا خود دار پایا ہے۔ بہت ہی صاف ستھرے اور پاکیزہ' ان سے بہتر اخلاقی گروہ میں نے نہیں دیکھا' میں دوسروں کے پاس بھی جاتا ہوں اور بعض صوفی ایسے ہیں ان میں پاکیزگی ہے مگر علم نہیں ہے اور

بعض ایسے ہیں کہ ان کے گرد دنیادار لوگ ہیں۔ وہ اچھے ہیں مگر دنیادار لوگ ان کی پناہ لیتے ہیں' میں نے ان میں امت مسلمہ کا درد پایا ہے اور سارے بنی نوع انسانوں کا درد دیکھا ہے' یہ رسول اللہ کا ورثہ ہے۔ میں ان سے باقاعدہ تو دسمبر 1997ء میں ملا' یہ جو واقعہ ہے' جو درس ان کا سنا اور اسنے مجھے مجبور کر دیا' اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ میں نے اپنے دل سے لکھا کہ نور کا ایک دریا ہے جو آدمی کو گم کر تا ہے اور اس کے میں نے مشاہدات کئے اور پھر دیکھا، میں نے اس کے باوجود کہ انسان ہیں' انسانوں میں خامیاں ہو سکتی ہیں وہ تو صحابہ میں بھی تھیں اور صحابہ میں بھی تو عمر فاروق ؓ ایک ہی تھے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی ایک تھے اور لوگوں میں کچھ کوتاہیاں اور خامیاں تو ہوتی ہیں مگر یہ سچے لوگ ہیں اور میں نے دعا بہت کی' خانہ کعبہ میں بھی دعا کی' مدینہ منورہ میں بھی دعا کی' بہت نمازوں میں دعا کی کہ یا اللہ اس آدمی سے جوڑ دے۔ خیر ہے تو اس آدمی سے جوڑ دے' اور میں سمجھتا ہوں یہ جو دل ان کی طرف مائل رہا ہے تو اس میں دعا کا بھی شاید دخل ہو۔

اور ایک اچھی بات آپ کو بتاؤں' حضرت جی کو بتایئے گا' میں آٹھ گھنٹے سوتا تھا اور بڑی کوشش کی یہ کم ہو جائے' ایک دن کی نیند اگر کم کر تا تھا تو کام میں دقت ہوتی تھی' مگر اب ایسا ہوتا ہے کہ میں فجر تک کام کر تا ہوں اس کے بعد نماز پڑھ کر سوتا ہوں اور نو بجے اٹھ جاتا ہوں اور کام کر تا ہوں' دوپہر کو اگر موقع ملے' تو آدھ گھنٹہ سو لیتا ہوں اور نہ ملے تو کوئی پرواہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے فضل سے تازگی محسوس ہوتی ہے' ورنہ پہلے میں اگر نیند پوری کئے بغیر اٹھ جاتا تھا تو میرے گھر والے میرے قریب نہیں آتے تھے' ڈرتے تھے کہ یہ آئے گا اور لڑے گا' یقین کریں اللہ نے خاص رحم کیا ہے۔

اجلے رنگ

پسندیدہ کتاب۔ قرآن کریم
پسندیدہ شاعر۔ فیض احمد فیض' دینی اعتبار سے اقبال
پسندیدہ پھول۔ چنبیلی' رات کی رانی
پسندیدہ کھیل۔ نشانہ بازی
پسندیدہ موسم۔ سارے موسم انجوائے کرتا ہوں۔ مزاج انتہا پسندانہ ہے۔ سردیوں میں سخت سردی اور گرمیوں میں شدید گرمی پسند ہے۔
پسندیدہ خوشبو۔ زعفران
پسندیدہ ڈش۔ کباب
پسندیدہ پھل۔ گرمیوں میں آم' سردیوں میں مالٹا (لیکن شوگر کے باعث یہ پسند پرہیز میں بدل گئی ہے)
پسندیدہ لباس۔ شلوار قمیض' واسکٹ اور سر پر پگڑی امریکہ' یورپ' مڈل ایسٹ اور دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے اس پسندیدہ لباس کو

پہنے رکھا۔

اپنی ناپسندیدہ عادت	چھوٹی چھوٹی بات کو محسوس کرتا ہوں۔ Hurt ہوتا ہوں لیکن اظہار نہیں کرتا یہ میری کمزوری ہے۔
غصہ کس بات پر آتا ہے۔	دوغلی بات اور منافقانہ روش برداشت نہیں ہوتی۔
کس بات پر خوش ہوتے ہیں۔	محبت کی باتوں سے' محبت آمیز سلوک سے
کوئی ذاتی خواہش جو تاحال تشنہ تکمیل ہو۔	تصوف نے اسقدر دیا ہے کہ مانگنے کو کچھ بچا ہی نہیں ہے۔
گھریلو امور میں کس حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔	گھریلو امور بچوں نے سنبھال لئے ہیں۔ خانگی امور کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔
روزمرہ معمول۔	ساڑھے تین بجے بیداری' تہجد' ذکر اذکار اور فجر کی نماز کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ استراحت۔

۱۔ ناشتہ کے بعد دوپہر تک دفتر میں ملاقاتیں' اخبارات کا مطالعہ اور روزانہ کی میل دیکھنا۔

۲۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا اور نماز ظہر کے بعد قیلولہ

۳۔ نماز عصر کے بعد کھیتوں میں سیر یا شوٹنگ

۵۔ نماز مغرب کے بعد ذکر اذکار

۶۔ بعد نماز عشاء کھانا۔

۷۔ اس کے بعد بارہ بجے تک مطالعہ' اندرون ملک اور بیرون ملک کی ٹیلی فون کالز سننا۔

بحوالہ روزنامہ

پاکستان۔ سنڈے میگزین۔

حضرت مولانا محمد اکرام اعوان

حافظ عبدالرزاق صاحب

ے رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

حکمائے قدیم میں سے ارسطو کا یہ کہنا ہے کہ

Man is a Social Animal

حکماء کا ایک اور گروہ آدمی کی تعریف یہ کرتا ہے کہ "آدمی حیوان ناطق ہے" دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ آدمی کو حیوان سمجھتے ہیں۔ آدمی کی زندگی کے مختلف ادوار پر غور کیا جائے تو دونوں کی بات کی تصدیق ہوتی ہے وہ یوں کہ آدمی کا بچپن ہر طرح حیوان کے، مشابہ ہے اور وہ بھی مطلق حیوان کے، کچھ مدت کے بعد وہ حیوان ناطق بن جاتا ہے۔ پھر لڑکپن آتا ہے تو ارسطو کی تعریف اسکی زندگی پر صادق آتی ہے۔ پھر جب تعلیم میں کچھ دور آگے چلتا ہے تو آدمیت کے آداب سیکھتا ہے۔ اب اس کی حیوانیت میں آدمیت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے دو راہیں ہو جاتی ہیں کچھ وہ ہوتے ہیں جنکی شخصیت میں آدمیت کا عنصر غالب آجاتا ہے اور ان

کی اکثر حرکات سے آدمیت کا نشان ملتا ہے۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کی آدمیت دب جاتی ہے اور حیوانیت غالب رہتی ہے اور یہ لوگ بوڑھے ہونے بلکہ مرنے تک آدمی نما حیوان ہی رہتے ہیں۔

وہ آدمی جن کی شخصیت میں آدمیت کا عنصر غالب ہوتا ہے ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جن کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو مخلوق میں برتری حاصل ہے اس سے ذرا مختلف ہوتا ہے جن کی عقل کہتی ہے کہ کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دوسرے آدمیوں پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں اپنے اصل مضمون کی طرف آتا ہوں مجھے یہ بتانا ہے کہ میں نے حضرت مولانا محمد اکرام اعوان کو کیسا پایا سو میں اپنے تاثرات پیش کرتا ہوں۔

مجھے 1960 میں ایک ایسے انسان سے ملنے کا اتفاق ہوا جو صرف انسان ہی نہیں تھا بلکہ انسان سازی کا ایک چلتا پھرتا کارخانہ تھا۔ میری مراد استاذی المکرم حضرت مولانا اللہ یار خاں رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ 1960 میں انسان بننے کی آرزو لے کر حضرتؒ کے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں شامل ہوا اور سب سے پہلے جن قابل ذکر حضرات سے شناسائی ہوئی ان میں سے ایک حضرت مولانا محمد اکرم اعوان ہیں۔ آپ مجھ سے دو سال پہلے یعنی 1958ء میں حضرتؒ سے وابستہ ہوئے۔ اس ملاقات تک آپ زندگی کے وہ مراحل طے کر چکے تھے۔ جو اس عمر تک آدمی کر لیتا ہے۔ یعنی بچپن لڑکپن۔ تعلیم اور جوانی کی بہار، میں نے محسوس کیا کہ ان میں تعلیم اور اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت کرتے ہوئے دو وصف موجود ہیں۔ اول احساس برتری اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علاقہ ونہار کے اعوان ہیں۔ اعوان ہونا اس علاقہ میں برتری کی دلیل سمجھی جاتی ہے اور یہ سمجھنا کسی حد تک درست بھی ہے۔ کیونکہ

اعوان نسب کے اعتبار سے حضرت علیؓ کی اولاد ہیں۔ آپ کے والد ماجد پندرھویں پشت میں قطب شاہ صاحب سے ملتے ہیں اس لئے ان کو قطب شاہی اعوان کہتے ہیں اور چالیسویں پشت میں حضرت علیؓ سے جا ملتے ہیں۔ لہٰذا ان میں برتری کا احساس ہونا ایک فطری بات ہے۔

اعوان اس علاقے میں ملک کہلاتے ہیں اور ملک کے معنی ہیں بادشاہ۔ یہ لفظ ان کے احساس برتری کا واضح ثبوت ہے تو میری ملاقات جب ان سے ہوئی تو یہ ملک محمد اکرم "دنماریا" تھے۔ دوسری بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ آپ صرف آدمی ہونے پر قانع نہ تھے بلکہ انسان بننا چاہتے تھے لفظ انسان کا مادہ "انس" ہے تو جب آدمی میں انس پیدا ہونے لگے تو وہ انسان بننا شروع ہو جاتا ہے مگر انس کس کے ساتھ؟ تو یہ انس پیدا ہوتا ہے سب سے پہلے اپنے خالق کے ساتھ اور غیر شعوری طور پر ہوتا ہے کہ وہ کتنا مہربان ہے جس نے جسمانی ذہنی عقلی صلاحیتیں عطا فرمائیں وہ بھی بن مانگے اور مفت۔ پھر انس پیدا ہوتا ہے۔ خالق کے اس شاہکار سے جسے چشم تصور کے سامنے دیکھ کر انسان کہہ اٹھتا ہے۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کر دی

سراپا جان جاں ہمراز کردی

اور دل کی گہرائیوں سے یہ آواز گونجنے لگتی ہے کہ

لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اور انس کی خاصیت یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ترقی کرتا ہے اور بڑھتے بڑھتے محبت بن جاتا ہے۔ اور محبت چاہتی ہے محبوب کو تو ہاتف آواز دیتا ہے۔

والذين امنوا اشد حبا لله

مجھے یوں محسوس ہوا کہ اسی کی آرزو لے کر اسی کی تلاش میں آپ نے اس

انسان ساز شخصیت کا دامن تھاما ہے۔ یہاں اس حکیم مطلق کی حکمت کا ایک کرشمہ اور دیکھنے میں آیا وہ یہ کہ فطرت' ماحول اور قانون توارث کے ماتحت جس شخص میں احساس برتری موجود ہو اسکے دل میں اتنی بڑی خواہش انگڑائیاں لینے لگے تو اسے اگر کوئی ایسا مربی یا استاد مل جائے جو سوسائٹی میں نسلی اعتبار سے گھٹیا شمار ہو تو اسکی خواہش کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں۔ تو حکیم مطلق نے اعوان کو مرشد جو دیا تو وہ بھی اعوان اور وہ بھی وہاں کا اعوان جو ڈانگ مار مشہور ہیں۔

خیر یہ بات یونہی برسبیل تذکرہ آگئی۔ اپنے موضوع کی طرف چلتے ہیں 'انسان سازی کا قرآنی نام تزکیہ ہے اور فرائض نبوت میں سے تلاوت آیات کے بعد پہلا کام بھی تزکیہ تو ہے۔ اس فن کے ماہرین نے تزکیہ کا ذریعہ ذکر الٰہی کو قرار دیا ہے۔ اور اہل فن تزکیہ کے لیے یہی ذریعہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ میں مولانا کے کلاس فیلو کی حیثیت سے تزکیہ کے لئے ان کے ساتھ ذکر الٰہی کرنے لگا۔ ہم جب اجتماعی ذکر کرتے تھے تو لطائف ستہ مع سلطان الاذکار کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگاتے تھے۔ اور تنہائی میں ملک اکرم صاحب ایک لطیفہ ایک گھنٹہ کرتے تھے اور اس زور سے جیسے زمین کانپ رہی ہے۔ یعنی اب ملک اکرم صوفی اکرم تھے مگر نہ انہیں کوئی صوفی کہتا تھا نہ کہلواتے تھے، سوائے قاضی ثناء اللہ صاحب کے جو انہیں نجی محفلوں میں صوفی اکرم کہہ دیا کرتے تھے۔ گو ہم کلاس فیلو تھے مگر کلاس میں مانیٹر کی شان الگ ہوتی ہے۔ پھر یہ تفاوت اکثر اس اصول کے تحت ہوتا ہے جو اللہ کریم نے فرمایا ہے۔ لیس للانسان الا ما سعی "یعنی انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے"۔ پھر فرمایا۔ و ان سعیه سوف یرٰی "کہ اسکی کوشش کا جائزہ لیا جاتا ہے پھر ثم یجزاه الجزاء الاوفیٰ۔ پھر اس کو مزدوری پوری دی جاتی ہے۔ تو ان کی اس کوشش سے فوری طور پر مزدوری یہ ملی کہ انہیں مانیٹر بنا دیا

گیا۔اس کے لئے ایک واقعہ سنئے۔

ہمارے شیخ المکرمؒ جوانی کے زمانے میں یہاں چکوال کے قریب ایک گاؤں،نام موہڑہ کورچشم میں پڑھتے تھے۔اب جو شیخ سلسلہ کی حیثیت سے چکوال آتے تو ایک رات اس گاؤں میں گزارتے وہیں ذکر کی محفل جمتی تھی۔طالب علمی کے زمانے میں حضرتؒ کا ایک دوست تھا۔غلام سرور نام تھا ایک دفعہ جو ہم وہاں گئے تو اس نے حضرتؒ سے دوستانہ شکایت کی کہ آپ یہاں آتے ہیں لوگوں کو کچھ سکھاتے ہیں مجھے پوچھتے ہی نہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا اچھا آج مغرب کی نماز کے بعد یہاں ہمارے ساتھ بیٹھ جانا۔چنانچہ ذکر شروع ہوا تو سرور موجود تھا۔اس کو طریقہ ذکر بتانے کے بعد حضرتؒ نے خوب زور سے ذکر کرایا۔جب ذکر ختم ہوا تو پوچھا سرور! بتا کچھ سمجھ آئی۔ کہنے لگا مولوی صاحب (یہ اسی نام سے حضرتؒ کو پکارتا تھا) عجیب منظر دیکھا ہے۔آپ کے سینے سے نہایت تیز روشنی نکلتی تھی جیسی ریل گاڑی کے انجن کی ہوتی ہے۔پھر وہ روشنی سیدھی اس کے سینے میں جاتی تھی۔جو لمبے سے قد کا ساتھی ہے۔پھر اسکے سینے سے چھوٹی چھوٹی شعاعیں نکل کے سارے ساتھیوں کے سینے میں پہنچتی تھیں۔ حضرتؒ مسکرا دیئے اور فرمایا سرور! تو نے ٹھیک دیکھا ہے ساتھیوں کا تو پتہ نہیں مجھے دو باتیں محسوس ہوئیں اول یہ کہ Step-down trans-former کی تھیوری ہے۔دوسرا میرے وجدان نے کہا کہ حضرتؒ کے بعد یہ رشد و ہدایت کی ذمہ داری ملک اکرم صاحب کو سونپی جائے گی۔

یہ غالباً1964ء کا واقعہ ہے یعنی قدرت نے انھیں اس وقت ہماری جماعت کا مانیٹر بنا دیا اور بعد میں ان سے استاد کا کام لیا۔

یہ سلسلہ ذکر الٰہی برسوں جاری رہا۔اب ساتھ ہی ملک اور بیرون ملک تزکیہ کے عمل کی ترویج واشاعت کے لئے ان کا جانا ہوتا۔ میں بھی "جمعہ جنج نال" اکثر ہوتا

تھا۔ اب آپ صوفی کے بعد مولانا اکرم بنتے جا رہے تھے۔ ہر جگہ ذکر کی محفل جمانا اور تزکیہ کے سلسلے میں بیان کرنا اور بیان ایسا شستہ جیسے کوئی اعلیٰ پائے کا ادیب کتاب الٰہی کے موتی بکھیر رہا ہے۔

آخر فروری 84ء میں تزکیہ کا آفتاب ماہتاب غروب ہوا اور مولانا اکرم صاحب اپنے شیخ کے جانشین کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد اکرم شیخ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ سجادہ نشین ہوئے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے اپنے شیخ مکرمؒ کی نیابت کا حق ادا کرنے میں کس مستعدی اور جاں بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر اس سے پہلے آپ کی زندگی کا ایک پہلو زیر بحث لانا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اب تک پیش نہیں کیا جاسکا۔

............کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہاں جی ہم جانتے ہیں عہد جوانی میں ان کی سوسائٹی علاقہ کے بدنام ترین لوگوں کے ساتھ رہی۔ جو برائی میں اپنی برتری منوانے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب آپ ملک اکرم ہوتے تھے اور میری ان سے ملاقات تک نہیں ہوئی تھی اس بات کی بنیاد صرف روایت ہے جس کا تعلق ماضی بعید سے ہے اب کون راویوں کی تلاش کرے اور پھر ان کے ثقہ یا ضعیف ہونے کے متعلق پڑتال کرتا پھرے۔ اسلئے عقلی طور پر اگر اس روایت سے نمٹا جاسکتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ایسا ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اس بات کی شہادت کہیں سے نہیں ملی کہ آپ نے کبھی ان لوگوں کی کسی مہم یا کارروائی میں عملاً حصہ لیا ہو۔ چلو اس کو بھی امکان کے دائرے میں لے آتے ہیں۔ مگر یہ سب ایک فطری عمل ہے جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے۔ اس فطری عمل کی نشاندہی نبی کریمؐ نے خود فرمائی ہے۔ آپ نے اپنے عظیم شاگردوں کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ " **كم فى الجاهلية**

خیار کم فی الاسلام"۔ "یعنی تم میں سے جن لوگوں کو جاہلیت کے دور میں سوسائٹی میں برتری حاصل تھی۔ اسلام لانے کے بعد انہیں اسلامی سوسائٹی میں بھی برتری حاصل ہے"۔ مگر وہ کیوں ؟ اس لئے ان میں فطری جوہر موجود تھا جو انسان کو عظیم بناتا ہے ماضی میں اس کا رخ جاہلیت کی طرف تھا اس لئے کہ وہاں عظمت حاصل ہوئی۔ اب اسی جوہر کا رخ للہیت کی طرف ہوا تو للہیت کے میدان میں برتری حاصل ہوگئی۔ اس کی ایک مثال ہمارے اپنے اس تزکیہ کے میدان میں بھی ملتی ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض اپنے دور کے ایک عظیم ولی اللہ گزرے ہیں۔ تزکیہ کے عمل سے پہلے آپ ایک مشہور ڈاکو تھے۔ دیکھ لیجئے جوہر موجود تھا جب اسکا رخ برائی کی طرف تھا تو آپ نے ڈاکو کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کیا اور جب اللہ کی طرف رخ ہوا تو ولی اللہ بن گئے۔

ایک من چلے شاعر نے کیا خوب نکتہ پیدا کیا ہے۔ کہتا ہے ۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
وہ سپاہ کی تیغ بازی یہ نگاہ کی تیغ بازی

حاصل یہ کہ اللہ کریم نے جو فطری جوہر ان میں رکھا ہے اسے جب صحیح رخ پر لگایا گیا۔ تو آپ ملک اکرم ونہاریا سے حضرت مولانا محمد اکرم اعوان بن گئے۔

اب آئیے حق نیابت کے موضوع پر۔ حضرت شیخ المکرم کو اللہ کریم نے مردم شناسی کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کی نگاہ انتخاب جس فرد پر پڑی اس میں غلطی کا نشان تک نہیں تھا۔ حضرتؒ کے جانشین کے چند کارہائے نمایاں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱)۔۔۔۔۔ آپ نے سب سے پہلے تزکیہ کے لئے ایک مرکز

تعمیر کیا جس کا نام دار العرفان ہے۔ حضرت شیخ کے زمانے میں اصولاً اسکی بنیاد رکھ دی گئی تھی مگر بعد میں وجود میں آیا وسیع مسجد عظیم لائبریری ساتھیوں کی رہائش کا انتظام وسیع کچن، وضو اور غسل کا انتظام اور ایک PCO یعنی ساری جدید ضرورتیں پوری کر دیں اور سالانہ اجتماع جو 40 دن تک پھیلتا ہے لازمی قرار دے دیا گیا اور مسجد کے ساتھ اپنا حجرہ جس کو جدید زبان میں دفتر کہتے ہیں اور جس میں دنیا بھر کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا انتظام موجود ہے۔

(۲)۔۔۔۔اپنے شیخ کا مشن یعنی تزکیہ کے کام کو پھیلانے کے لئے پرانی دنیا اور نئی دنیا میں آپ نے دورے کئے اور کرتے رہتے ہیں۔ ایشیا کے ممالک کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں جا کر مختلف مرکزی مقامات پر اللہ کا پیغام پہنچایا اور امریکہ جیسے ملک میں تزکیہ کی شمع روشن کی۔ میرا خیال ہے اسرائیل کے علاوہ شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ہو جہاں تزکیہ کے لئے ذکر کی محفلیں نہ جمتی ہوں۔

(۳)۔۔۔۔زبانی تبلیغ اور علاوہ تربیت کے علاوہ آپ نے تصنیف و تالیف کا کام بھی ان پندرہ برسوں میں کافی کیا ہے۔ مثلاً اسرار التنزیل کے نام سے تفسیر قرآن دس جلدوں میں مکمل کی۔ جو طبع ہو چکی ہے اس کے علاوہ کئی کتب لکھی ہیں جو تزکیہ ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۴)۔۔۔۔ان کے کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں یہ تو

آپ جانتے ہیں کہ شاعر "بنتے" نہیں شاعر ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہی حقیقی شاعر ہوتے ہیں اور وہ شعر کہتے نہیں بلکہ شعر ان کی زبان سے نکلتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ مشغلہ کیوں اختیار کیا گیا ہے تو اسکا جواب ترجمان حقیقت کی زبان سے سنیئے۔

نغمہ کجا و من کجا ساز و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار آورم ناقہ بے زمام را

یعنی جن طبائع میں شعر کا ذوق ہے انہیں اسی کے ذریعے اللہ کی طرف بلایا جارہا ہے۔ اور شعر کی تعریف حسرت موہانی سے سنیئے۔ کہتا ہے۔

شعر دراصل ہے وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

امید ہے کہ آپ کو حضرت کے شعری مجموعہ میں ایسے شعر ضرور ملیں گے۔

سیماب یہ کلام میں ہوتی نہ گرمیاں
تو نے کبھی کسی سے محبت ضرور کی

(۵)۔۔۔۔ شیخ المکرم کے اس دنیا سے سفر کر جانے کے بعد ملک میں ایک ڈرامائی تبدیلی آئی۔ ڈرامائی اس لئے کہ حقیقت میں تبدیلی کوئی نہیں آئی محض ڈرامار چایا گیا اور اس ڈراما میں اوپر سے نیچے تک سارا ملک شامل تھا۔ اس تبدیلی کا اجمال بیان یہ ہے۔

نصف صدی کی طویل مدت میں اس ملک کے کالے انگریز حکمران ان کے حواری اور پوری قوم ...... 'خود فریبی کی فنکارانہ مشق میں سرگرم عمل

رہے۔ قوم جس نے ایک وقت چیخ چیخ کر پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالہ الااللہ کے نعرے لگائے تھے پاکستان بننے کے بعد اس قوم کو موقع دیا گیا کہ اب لاالہ الااللہ کی بہار دیکھنے کے لئے مناسب حکمرانوں کا انتخاب کر لو۔ نصف صدی میں نہ جانے کتنے الیکشن ہوئے مگر ہر الیکشن میں اس جھوٹے نعرے لگانے والی قوم نے حکمران ایسے چنے جن میں صرف ایک وصف قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا رہا اور وہ یہ کہ مردم شماری کے کاغذات میں ان کے نام کے سامنے ''مسلمان'' کا لفظ غلطی سے لکھا جاتا رہا۔

اس کے علاوہ لاالہ الااللہ سے کوئی مناسبت ان میں نہ پائی گئی۔ چنانچہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک اس ملک میں لاالہ الااللہ کا دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ سیاست کا فرانہ۔ معیشت کافرانہ۔ قانون کافرانہ۔ تعلیم کافرانہ غرض ہر شعبۂ زندگی پر کفر کا پورا پورا تسلط موجود ہے۔

پچھلے چند برسوں سے نہ جانے یہ آواز کیسے اٹھی کہ ملک میں نفاذ شریعت ہو۔ نظام مصطفیٰ رائج ہو۔ اسلام نافذ ہو۔ یہ آواز کچھ اس طرح گونجی کہ حلقہ ہیرا منڈی اور حلقہ چارسدہ کے بغیر ملک کے چپہ چپہ کی زبان پر نفاذ شریعت کے الفاظ چڑھ گئے۔ حتیٰ کہ ہمارے کالے انگریز حکمرانوں نے بھی سر ملا کر نفاذ شریعت کا تہیہ کر لیا۔ اور ایک عدد نفاذ شریعت بل بھی ایوان زیریں میں پیش کر دیا۔ یعنی اے برگزیدہ مسلمانو! تم اگر اجازت دو تو اس ملک میں اللہ کا قانون نافذ کر دیا جائے۔ اس شریعت بل کی حقیقت ایک ماہر فن کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں۔

''موجودہ شریعت بل میں شریعت کے سوا سب کچھ ہے (جسٹس جاوید اقبال) نوائے وقت 92-10-19۔'' یہ ہے اداکاری کا کمال۔ خدا جانے کس طرح ان برگزیدہ مسلمانوں نے ہاں کر دی مگر یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے ہو جاتا۔ ایک مرحلہ ابھی باقی تھا وہ یہ کہ ایوان بالا۔ یعنی وہ مجلس جس میں

صرف برگزیدہ نہیں بلکہ کلاس ون پہنچے ہوئے مسلمان-Cream of the Na
tion جمع ہیں۔ اس سے بھی منظوری لینی ہے کہ مسلمانوں کے اس ملک میں اللہ کا
قانون نافذ کرنے کی اجازت دیں۔ مگران اونچے درجے کے مسلمانوں کا حدود اربعہ
سب کو معلوم ہے۔اس لئے اب تک اس بالائی ایوان میں یہ بل پیش کرنے کی ہمت
ہی نہیں ہوئی۔ گویا یہ ڈرامہ ابھی تک انجام کو نہیں پہنچااور کیفیت یہ ہے کہ

نہ انکاری کنم نہ ایں کاری کنم

اس ڈرامے میں ملک کی چند سیاسی جماعتیں بھی شامل ہو گئیں جن پر دینی
جماعت کی تہمت بھی لگی ہوئی ہے۔ اوران کے جلوس اور ریلیاں اور جلسے وقتے وقفے
سے ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر ہمارے مولانا کو بھی خیال آیا کہ کرنے
کا کام تو یہی ہے۔ ذکر الٰہی کا حاصل صرف اپنی ذات پر اللہ کا قانون نافذ کر لینا ہی نہیں
بلکہ ذکر الٰہی کا ثمرہ تو یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ ہو۔ چنانچہ آپ نے
الاخوان کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کی جس کا نعرہ ہے "رب کی دھرتی رب
کا نظام" آپ کے سامنے غالباً سلسلہ نقشبندیہ کی یہ خصوصیت بھی ہو کہ اکبر کے دین
الٰہی کے طوفان کے سامنے جو ہستی ہمالیہ بن کر کھڑی ہو گئی وہ نقشبندیہ سلسلہ کے
ایک بطل جلیل حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی ذات تھی۔ پھر شاید آپ
کے ذہن میں ترجمان حقیقت کا یہ شعر بھی ہو کہ

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یہ ٹھنڈی ہوا یہی ہے کہ رب کی دھرتی رب کا نظام ہو۔ آپ نے جماعت کی
تشکیل کے بعد پورے ملک میں دورے کئے چنانچہ لاکھوں مسلمانوں نے ان کے ہاتھ
پر موت کی بیعت کی۔ یعنی یہ عہد کیا کہ نفاذ شریعت کے لئے ہم اپنی جانوں کا نذرانہ

پیش کر کے رہیں گے۔ چنانچہ اب ذکر الٰہی کی محفلوں کے ساتھ نفاذ شریعت مہم بھی چل رہی ہے۔

مولانا نے اپنے شیخ کے مشن کو جاری ہی نہیں رکھا بلکہ اس میں انفرادیت سے ترقی کر کے اجتماعیت کی روح بھی پھونک دی۔

اللہ کریم نے ان میں جو تین وصف رکھے ہیں' انتظامی قابلیت۔ اخلاص۔ اور ایثار۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب یہ ڈرامہ حقیقت بن کے منظر عام پر آئے گا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا نے اپنے شیخ مکرمؒ کے مشن کی ترویج کے لئے ایک نیا Plan تیار کیا۔ انہوں نے غالباً اکبر الہ آبادی اور اقبال لاہوری کی نگاہ سے حالات کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی قوم کے بننے اور بگڑنے کا انحصار اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہے۔

جیسے اکبر نے کہا ہے ۔

بچے میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ ہے ڈبے کا اور تعلیم ہے سرکار کی

یا ایک مقام پر کہہ گیا ہے کہ ۔

ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

یا جیسے اقبال لاہوری کہہ گیا ہے کہ ۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ نسخہ
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تو مولانا نے یہ پلاننگ کی کہ اللہ کے بندوں کی پنیری تیار کی جائے چنانچہ آپ نے صقارہ اکیڈمی کے نام سے اپنے مرکز دارالعرفان میں دو سکول کھولے زنانہ اور مردانہ جن میں میٹرک تک تعلیم دی جاتی ہے اور بچوں کے رہنے کے لئے ہاسٹل بھی بنایا۔اب یہاں بچے اسکول ٹائم میں اسلامی روح پر مبنی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔اورباقی وقت ہوسٹل میں رہ کر اللہ کا بندہ بننے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔اس طریق کار سے امید افزاء نتائج حاصل ہوئے۔ تو لاہور میں بھی صقارہ اکیڈمی کے نام سے یہی تعلیمی سلسلہ جاری کیا۔

1990ء میں اس کو انٹر میڈیٹ کالج بنادیا گیا۔ماحول اور حالات نے بتایا کہ یہاں مردانہ کالج کی جگہ زنانہ کالج کی سخت ضرورت ہے۔چنانچہ اب وہ زنانہ کالج صقارہ اکیڈمی کے نام سے کام کر رہا ہے۔ تاکہ قوم کو ایسی مائیں میسر آجائیں جن کی گودوں میں پلنے والے بچے واقعی اللہ کے بندے ہوں۔

O..........O..........O

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرا شیخ بس ایک بندہ حق ہی تو ہے

مقبول احمد گھمن صاحب

وسط جولائی ۹۹ء کی ایک دلپذیر صبح معمولات کے لئے بیدار ہوا تو اہلیہ نے بتایا کہ رات سوا گیارہ بجے لاہور سے بشریٰ اعجاز نامی کسی خاتون کا ٹیلیفون آیا تھا۔ آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ میں نے بتایا کہ وہ سوگئے ہیں تو انہوں نے متحیر آواز میں فرمایا۔

"وہ دن چھپے ہی سو جاتے ہیں کیا؟ آپ انہیں اتنی جلدی سونے کیوں دیتی ہیں؟ ہمارے ہاں تو شام ابھی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ ہم نے تھوڑی دیر پہلے کھانا کھایا ہے۔ گھر آئے ہوئے مہمانوں سے گپ شپ کی ہے اب الوداع کہہ کر فون کیا ہے تو آپ فرمارہی ہیں کہ وہ سوگئے ہیں۔ اتنی جلدی سونے کی کیا تک ہے۔ چلو خیر! میں کل رات کو دوبارہ فون کروں گی۔ اللہ حافظ"

"انہوں نے صرف اتنی سی باز پرس کے بعد ازراہ التفات فون بند کر دیا تھا" اہلیہ

نے بات ختم کی تو بڑی بیٹی ڈاکٹر آسیہ نے گرہ لگائی کہ موصوفہ کبھی کبھار ٹی وی پر آتی ہیں اور شعر و سخن کے حوالے سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ بہر حال مجھے انکا یہ انداز تکلم بھلا لگا مگر میں مخمصے میں پڑ گیا۔ کہ اللہ جانے ان محترمہ کے نزدیک رات کے اوقات کا حدود اربعہ کیا ہوتا ہوگا جو سوا گیارہ بجے کو شام کا نام دے رہی ہیں۔ اس سارے پس منظر میں پہلا تاثر یہ تھا کہ آپ ایک بے باک 'مرنجان مرنج' وضعدار اور لطیف ذوق سے مزین خاتون ہیں جو شاید اسی تناظر میں کسی موضوع پر بات کریں گی۔

سارا دن ہجوم کار میں مصروف رہا۔ شام کو ذکر اللہ کی محفل سے فارغ ہوتے ہی دفتر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو پتہ چلا کہ بشریٰ اعجاز صاحبہ لائن پر طلب فرما رہی ہیں۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے جو بات چھیڑی وہ میرے لئے نہایت حیران کن اور غیر متوقع تھی۔ میری عاجزانہ بساط سے یہ سب کچھ کہیں وراء الورا تھا۔

آپ نے فرمایا کہ میں حضرت جی مد ظلہ 'کی حیات مبارکہ پر ایک کتاب لکھ رہی ہوں اس ضمن میں آپ کی تحریری معاونت و مشاورت درکار ہے۔ مجھے اپنے دفتر سمیت گرد و پیش کا ماحول گھومتا ہوا نظر آیا زمین اپنے محور سے ہٹی محسوس ہوئی کہ یہ خاتون نہایت معصومیت اور سادگی سے ایک ہی فقرے میں آناً فاناً کیا سے کیا کہہ گئی ہے۔ یقیناً یہ میری کم ہمتی، کم علمی اور کج فہمی کی بابت ابہام و تشکیک میں مبتلا نظر آتی ہیں ورنہ ضرور عفو و درگزر کا مظاہرہ فرماتیں۔

بھلا مجھ جیسا کمزور اور حقیر انسان اپنے شیخ مکرم و معظم کی نور الوہیت بکھیر نے والی ضیاؤں سے بھر پور نور فیضان مصطفویٰ سے قلوب کو گرمانے والی پر سرور روشنیوں پر محیط حیات مبارکہ کو احاطہ تحریر میں لانے کی جرات رندانہ یا کاوش خسروانہ کر سکتا ہے؟ یا پھر بہ امر مجبوری حرکت کر بھی بیٹھے تو کیا کما حقہ 'انصاف کر

سکتا ہے ؟اسکا جواب لاریب نفی میں ہے۔

میں نے بشریٰ اعجاز صاحبہ کی اس بے باکی اور اپنی بے بساطی پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ کچھ دن اس خوش فہمی میں گزر گئے کہ محترمہ اپنی جولانی طبع سے اب باز آگئی ہوں گی۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر ایک دن دوران اجتماع دار العرفان منارہ میں حضرت جی مدظلہ کے دفتر میں حاضر بیٹھا تھا کہ آپ اچانک مخاطب ہو کر فرمانے لگے "بشریٰ اعجاز نے آپ کو میرے بارے میں کچھ لکھنے کا کہا تھا؟" میں جواباً ہکلانے لگا گلا رندھانے لگا' دل کی دھڑکنوں کو سہلانے لگا' زبان کو بولنے کے قابل بنانے لگا' ماتھے پر پسینے کو چھپانے لگا اور بولنے کے لئے الفاظ بنانے لگا تو میری انتہائی عظیم المرتبت' قلوب کو لبھانے والی' معصومانہ تقدیس سے بھرپور اداؤں والی اور سب سے بڑھ کر نبی رحمت ﷺ کی ابدی حضوری گھنیری چھاؤں والی یہ ہستی حسب سابق دلربا انداز میں گویا ہوئی" "شاہ جی! لکھ چھوڑو اللہ ہمت دے گا"

بس اسی وجہ سے ہمت کر رہا ہوں کیونکہ اب یہ میرے شیخ مقدس کی صرف خواہش ہی نہیں رہی بلکہ ان کا حکم بھی شامل حال ہے اس کے علاوہ سب سے قیمتی تو انکی توجہ عالی اور مجھ ناچیز پر اعتماد اور تیقن ہے جو اس تحریر کا مضبوط ترین سبب بن رہا ہے۔

آج رات سونے کی تیاری کرنے لگا تو بیٹے نے بتایا کہ لاہور سے بشریٰ اعجاز صاحبہ کا ٹیلی فون ہے۔ مجھے قطعی باور ہونے لگا کہ یہ نئی نویلی صوفن آج مجھے ہرا کر دم لے گی۔ لہذا فون سننے سے پہلے بلا مبالغہ میں نے اعلان کر دیا کہ میرا کمرہ فوراً خالی کیا جائے' میز پر دو قلم اور چند سفید کاغذ رکھ دیئے جائیں۔ کڑک چائے پلائی جائے اور ساری رات بالملاحظہ سکوت اختیار کیا جائے۔ میں نے ماہتاب کے ارد گرد منڈلانے والی کہکشاؤں سے دعاؤں کی فرمائش کرتے ہوئے آج کی تاریخ میں رات

محترمہ بشریٰ اعجاز صاحبہ کی پر خلوص یاد دہانی کے طفیل اپنے محبوب از جان شیخ معظم و مکرم و محترم کے نام لکھ دی ہے اور ان کی حیات مبارکہ کے چند مختصر ترین پہلو احاطہ تحریر میں لانے کی جسارت کرنے چلا ہوں۔

اس تیاری کے بعد محترمہ کا فون سنا تو وہی ڈھاک کے تین پات۔ یعنی تفتیش آمیز استفسارات! آپ نے مضمون لکھ لیا؟ لاہور آئے تو ملاقات کیوں نہ کی؟ اب آیئے تو ضرور ملیئے اور ہاں مضمون ساتھ لانا نہ بھولئے گا تاکید ہے۔ یہ آخری فقرہ وہ تو نہایت روانی سے اور نتائج سے بے خبر کہہ گزریں مگر میں ہوں کہ اس لمحے سے اب تک کئی دفعہ ہاتھ کو قلم سے آزاد کرنے کی سعی لا حاصل کر بیٹھا ہوں۔ رات ہے کہ دھمے دھمے جا رہی ہے اور اس سب پر طرہ یہ کہ شیخ مکرم کی تاریخ ساز شخصیت کے پہلو دھیرے دھیرے دماغ کی سکرین سے ہوتے ہوئے قلب کے تار چھیڑتے ہوئے اور قلم کی نوک پر یلغار در یلغار کرتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ چلو' تاروں بھری رات ہے اور ہم ہیں صبح کچھ تو ہوا پڑا ہوگا۔ انشاء اللہ۔

اس سے پہلے بھی شیخ المکرم کی خواہش اور حکم کی جا آوری کے طور پر ایک تحریر لکھ چکا ہوں۔ جس میں یہ اٹل حقیقت ریکارڈ پر موجود ہے کہ "ہمارے درمیان سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے تمام انعامات و کرامات سے مزین ایک وجود پوری آن بان سے موجود ہے۔ جس کی للکار سے طاغوت لرزہ براندام ہے اور اہل حق اسکی قیادت میں کفر پر یلغار کرنے کے لئے صف بندی میں مصروف ہیں۔ میری مراد اپنے شیخ طریقت' مفسر قرآن' قاسم فیضان' غازی دوران' پاسبان سنت خیر الانام' امام قافلہ اسلام اور امیر تنظیم الاخوان حضرت مولانا محمد اکرم اعوان ہیں"

"میں اپنے اس عزیز از جان قائد کے اوصاف و خصائص کا احاطہ کرنے سے اپنے آپ کو اس لئے قاصر سمجھتا ہوں کہ آئندہ آنے والی نسل انسانی شاید اس کا صحیح

حق ادا کر سکے اور یہ امانت اس کے سپرد کرنا ہی مناسب ہے مگر مجھے یہ کہنے میں ذرہ باق نہیں کہ انشاءاللہ تعالیٰ ایک زمانہ ان کی صلاحیتوں کا معترف ہو گا۔ قرطاس ارض پر ان کے ثبت کردہ گہرے اسلامی نقوش امت محمدیہؐ کے لئے رہتی دنیا تک باعث طمانیت و فخر وانبساط ہوں گے"۔

لہذا مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا لکھوں، کہاں سے شروع کروں اور کہاں اختتام کروں اور یہ سب کچھ کیوں کر کروں۔ کیونکہ تصوف میں آپ جس کو شیخ مانتے ہیں پھر زمین کی پشت اور آسمان کی چھت تلے چلنے والے کسی شخص کو اس جیسا نہیں مانتے اگر مانتے ہیں تو آپ منافق، دھوکے باز، عیار اور مفادات کے اسیر ہیں۔ قانون تصوف کی رو سے قابل گردن زدنی ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر حوالہ دیا ہے کہ جب آپ شیخ کے اوصاف و خصائص کا احاطہ کرنے کی اہلیت ہی سے محروم ہوں تو پھر ان کی سیرت مبارکہ پر لکھنے کے کیا معنی؟

اگر بغرض محال یہ بارگراں اپنے مربی و محسن شیخ مقدس کی خصوصی توجہ مطہرہ کے طفیل اٹھانے کی سعی کر بھی لوں تو ان کی شخصیت کے کس پہلو سے بات شروع کروں۔ کیونکہ میں یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل محسوس نہیں کرتا کہ جب آپ شیخ کی شخصیت کے اوقیانوس میں غواصی شروع کرتے ہیں تو پھر ایک ایسے بحر بے کنار سے واسطہ پڑتا ہے جس کی وسعتوں کو ناپنا ناممکنات کے زمرے میں آتا ہے۔ اس حقیقت پر خود قرآن کریم نے مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ فرعون کے روبرو جب اسکی سلطنت کے آزمودہ کار جادوگر نبوت موسوی کے پاکیزہ اور تقدیس سے بھرپور انوارات کے طوفان بے محابہ میں مستغرق ہوئے تو خود اپنی ماہیت وانفرادیت کھو بیٹھے اور آئینہ قلب موسوی میں ذات باری کے جلووں کا نظارہ کرنے لگے۔ فرعونی دربار کی حدود

تیور کو جوتی کی نوک پر رکھا اور براہ راست رویت باری سے فیض یاب ہوئے انمی نایاب اور پاکیزہ کیفیات باطنی کی خوشہ چینیوں کا مظہر ہی تو قلب شیخ ہوتا ہے۔ پھر ایسی شخصیت کی حد بندیاں کن پیمانوں سے کی جائیں۔

چلو! اس موضوع پر ابتدا تو کرتے ہیں انشاء اللہ آنے والی نسلوں میں سلسلہ عالیہ کے چند خدام مزید کچھ ضوفشانی کا حق ادا کریں گے۔

مارچ ۱۹۷۶ء کا ذکر ہے میں توپخانہ سکول نوشہرہ میں کورس کر رہا تھا۔ ہماری کلاس کے ایک کیپٹن نے بڑی لجاجت سے اعلان کیا کہ آج شام ASC سکول کی مسجد میں ایک مہمان آرہے ہیں اور وہ قرآن کریم کے کسی موضوع پر بات کریں گے۔ تمام دوستوں سے شمولیت کی اپیل ہے۔ اس دلربا شام چند دوستوں کے ساتھ مجھے تیار ہو کر سینما دیکھنے جانا تھا مگر شومئی قسمت (حقیقتاً زندگی کی یہ سعد ترین گھڑی تھی) کہ کیپٹن صاحب نے مجھے دھر لیا اور زبردستی تانگے پر لاد کر مسجد میں لا بٹھایا۔

مغرب کی نماز باجماعت (بادل نخواستہ) پڑھی۔ نماز کے دوران بھاگنے کی سوجھی تو پیچھے کی صف میں فوجیوں کی ایک قطار ایستادہ نظر آئی۔ آگے بھی راستہ مفقود تھا۔ قہر درویش بر جان درویش، نماز کے بعد ایک شخص سفید چمکتا ہوا لباس زیب تن کئے ہوئے خوبصورت پگڑی میں ملبوس منبر پر متمکن نظر آیا۔ قرآن کریم کو عقیدت سے چوما، آنکھوں سے لگایا اور کھولا تو آیت پڑھی جس کی شرح جو غالباً مجھے یاد ہے کچھ اس طرح تھی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دوستی میں اس قدر گہرائی اختیار کرو کہ تمہاری ہر حرکت سے اس دوستی کے آثار نمایاں ہوتے چلے جائیں۔ یہ بات بظاہر تو روائتی وعظ پر مبنی لگی مگر جس بندے کی زبان سے ادا ہوئی وہ غیر روائتی شخصیت محسوس ہوئی۔ پرسوز، رقیق القلبی سے بھرپور ماحول اور اس پر مستزاد انداز بیان بڑا اچھوتا تھا۔ اس سارے وعظ کا ایک نکتہ مجھے بسمل کر گیا وہ یہ تھا "تم

فوجی لوگ ہو۔ میدان کارزار میں کام آنے کے لئے ہو۔ جب کبھی تمہارے جسم کے ٹکڑے ہونے لگیں تو دیکھنے والے کہہ اٹھیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے دوست کی جان سے الگ ہوا کوئی پرزہ پڑا ہوا ہے۔ صحابہ کبارؓ جب شہید ہوتے تھے تو انسانوں کے جھرمٹ میں ان کے اجسام مطہرہ کو ڈھونڈنے میں ذرہ برابر دقت یا دشواری نہیں ہوتی تھی۔ دور سے پہچانے جاتے تھے کہ کسی مقدس ترین ہستی کی دوستی کے طفیل جان جان آفرین کے سپرد کئے پڑے ہیں"۔

کچھ دیر وعظ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر اچانک اعلان ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے محفل ذکر ہوگی میں نے دل میں تہیہ کر لیا اگر تو اللہ کے ساتھ دوستی لگانے والی کوئی سبیل نظر آئی تو بیٹھوں گا ورنہ چل دوں گا۔ جو نہی واعظ نے ذکر شروع کروایا میں نے دل کی گہرائیوں سے یہ پیغام نشر ہوتا ہوا سنا کہ "اللہ کے ساتھ دوستی لگالو۔ وہ تمہارا دوست بن چکا ہے"

وہ دن اور آج کا دن' الحمد للہ ثم الحمد للہ۔۔۔۔۔۔دوستی۔۔۔۔۔

میں ربع صدی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو کوئی ذی شعور انسان اندازہ کرے کہ اس دن والے واعظ مکرم کے احسان عظیم کو اب کیا نام دوں۔ بس محبت سے لبریز جذبات اور عقیدت سے بھرپور تلاطم خیز طوفانوں کو سینے میں چھپائے پھر تا رہتا ہوں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ اپنے اس ابتدائی رہبر اور موجودہ شیخ کو میں کن الفاظ سے پکاروں۔ کیا اردو زبان کا کوئی لفظ اس معیار پر پورا اترتا ہے جو میں چاہتا ہوں حاشا وکلا۔ نہیں۔

اصل میں یہ جذبوں کی زبان ہے اور اسکی ترجمانی الفاظ نہیں کیا کرتے صرف جذبات سے بھرپور قلوب ہی ایک دوسرے کی گہرائی کو سمجھتے ہیں۔

زمانے کا دھارا اپنے مخصوص انداز میں خراماں خراماں بہتا ہی رہتا ہے اس میں

اپنے خاص خزانوں سے عطا فرما جو تیری شان کے لائق ہے۔انعام کا انتخاب میں تیری ذات مقدس پر چھوڑتا ہوں" جواب میں مجھے ارشاد ہوا کہ تیرے اس "مراد" کو میں تیری دعا کے طفیل ایک ایسا انعام عطا کرنے لگا ہوں جو اس کے بعد امت محمدیہ میں اسطرح پھر کسی کے حصے میں نہیں آئیگا۔ میں ہمہ تن گوش ہوا تو اسکے قلب کو تجلیات ربانی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔اللہ کریم نے اپنے ذاتی کلام یعنی فہم قرآن کے مقدس ترین انعام سے اس انداز میں نوازا کہ اب کبھی کبھار یہ قرآن کے نکات اس انداز میں اٹھاتا ہے کہ مجھے انگشت بدنداں کر دیتا ہے۔ آئندہ اس پائے کی قرآن فہمی اب کسی کے حصے میں نہیں آئے گی۔

میری کمزور فہم کے مطابق "اسرار التنزیل" اسی انعام کا تسلسل ہے جس نے آج کے مغرب زدہ زنگ آلود قلب و ذہن کے حامل افراد کو صیقل کر دیا ہے۔

اپنے موجودہ شیخ المکرم کی شخصیت کے بارے میں میرا ایک انوکھا تاثر ہے کہ سلسلہ عالیہ کی ترویج یا نفاذ اسلام کی تحریک کے لئے کسی لمحہ جس خصوصیت یا قابلیت کا تقاضا ہے۔وہ اسی لمحہ حضرت جی مدظلہ کو فوری القایا عطا کر دیا جاتا ہے۔اس کے لئے انہیں علیحدہ سے کوئی مجاہدہ یا مطالعہ نہیں کرنا پڑتا۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ رہا ہوں۔کیونکہ بعض اوقات کسی نہایت اہم اور مشکل مسئلہ پر کئی روز تک سوچ و بچار میں غرق رہنے کے بعد بھی جب کوئی سبیل سمجھ میں نہیں آتی تو لاچار معاملہ حضرت جی مدظلہ کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔بارہا میں نے اسی قسم کی پریشانی میں مبتلا دفتر میں قدم رکھا۔ حضرت سے نگاہیں چار ہوئیں۔ سلام کا تبادلہ ہوا اور قلب پر اس مسئلے کا حل نقش ہو گیا۔ازراہ تصدیق جب آپ سے وہ مسئلہ عرض کیا تو آپ نے وہی جواب فرمایا جو پہلے سے میں سمجھ چکا تھا۔

اب اس کیفیت کو میں الفاظ کا کونسا جامہ پہناؤں۔ کیا یہ متبرک لطافتیں قلوب

مزین اور سانسوں کی آہٹ سے لطیف تر پاکیزہ جذبوں سے بھرپور کوئی سربستہ راز آشکار کرنے چلے ہیں وہ ہدہد بھی اسی معیار کا حامل ہے جو آپ نے اپنی قلب و ذہن میں ان باتوں کے لئے مقرر کر رکھا ہے ؟

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ گڈریوں کے جھرمٹ میں آپ چمکتے ہوئے ہیروں کی تھیلی کھول بیٹھیں اور وہ انہیں کنکر سمجھ کر اپنے ریوڑ ہانکنے پر صرف کر دیں یا کہیں آپ اس انجام کو جا پہنچیں جو تاریخ تصوف میں منصور حلاج کو بھگتنا پڑا۔ یہ بھی خارج از امکان نہیں کہ آج کے پر فتن دور میں امام احمد بن حنبلؒ کی تاریخ آپ پر ہی نہ دہرا دی جائے۔

سلسلہ عالیہ کے ساتھ منسلک ہونے کے بعد بڑے حضرت جیؒ اور موجودہ شیخ المکرم کی رفاقت میں اکثر اوقات ہم رکاب ہونے کی سعادت نصیب ہونے لگی۔ غالباً اگست 1979ء کا ذکر ہے کہ بڑے حضرت جیؒ میرے غریب خانہ پر ملتان جلوہ افروز تھے۔ برسبیل تذکرہ ایک دن فرمانے لگے کہ پچھلی دفعہ جب عمرہ پر حاضری ہوئی اور حرم کعبہ میں طواف وداع کے بعد احباب گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے اور اپنے ظرف وبساط کے مطابق انعامات ربانی پا رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ "اکرم" ان سب سے الگ تھلگ اپنے پر ہجوم خیالات میں گھرا گم سم کھڑا ہے۔ میں نے از راہ شفقت قریب بلایا تو پھٹ پڑا۔ عرض کرنے لگا۔ "حضرت مجھے تو اس طرح بے ڈھب رونے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ لوگ آپ کی معیت سے فائدہ اٹھا کر انعامات سے سرفراز ہو ہی جائیں گے۔ مجھے بھی کوئی طریقہ یا سلیقہ ارشاد فرمائیں کہ کچھ تو حصہ پا سکوں" حضرت جیؒ نے فرمایا مجھے اس کا یہ معصومانہ مطالبہ بہت پسند آیا۔ میں نے صرف اسی کے لئے بیت اللہ کے غلاف کو پکڑ کر رب قدوس کے حضور دعا کی کہ "اے بار الٰہ، میرے اس مرید (نہیں۔ مراد) کو کوئی ایسا انعام

نشیب و فراز، تنگی اور کشادگی، آزمائش و کشائش شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ کبھی انسان اپنے آپ کو وقت کے تھپیڑوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور کبھی گردش ماہ و سال کو اپنے پیچھے لگانے کی سعی پیہم شروع کر دیتا ہے۔ کامل صوفیاء کرام اور مشائخ عظام کا انداز زندگی ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک روش پر چلتی ہوئی انسانیت کو ایسی کیف آگیں منزل حیات سے روشناس کراتے ہیں کہ پھر بندہ اپنی تمام توانائیاں معرفت حق کے لئے وقف کر دیتا ہے اور اس کار گاہ حیات میں بڑے عجیب اور خوبصورت رنگ بھرتا ہے۔ اپنی شخصیت کے ایسے تابناک پہلو سامنے لاتا ہے کہ اسکی دھنک میں گم ہونے کو جی کرتا ہے۔ الحمد للہ اس دن کے بعد تا حال میرے اندر کے انسان کی کیفیت کچھ اسی طرح ہی کی ہے۔ اس انداز حیات کو کہیں میرا کمال نہ سمجھ لیا جائے بلکہ ان ہستیوں کی نظر عنایت کا صدقہ ہے جن کے دامن کو تھام کر چل رہا ہوں۔

میں نے تصوف کے ابتدائی آٹھ سالوں میں جس طرح زندگی کا بھرپور لطف اٹھایا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اپنی آدھی صدی پر محیط حیات کا صرف یہی زمانہ عروج ہے تو شاید بے جانہ ہوگا۔ اسکی وجوہات دو جتی ہیں۔ اس دور کی زندگی کا ایک سرا اس ہستی کے ہاتھ میں تھا جو امام الاولیاء امت محمدیہ اور حامل مقام عبدیت کہلانے کا انفرادی استحقاق رکھتا ہے اور دوسرا سرا اب تک اس ہستی کے ہاتھ میں ہے اور انشاء اللہ سدا رہے گا جو امام صدیقین کا مبارک تاج سر پر سجائے ہوئے پوری شان اور آن بان سے ہم میں موجود ہے۔

میں اپنے اس مرلی و مزکی کے ساتھ رفاقتوں میں گزرے ماہ و سال کا کہاں تک ذکر کروں اور آخر کیوں کروں۔ بھلا یہ داستانیں کوئی الفاظ کے سپرد کرنے کے لئے جنم لیتی ہیں۔ پھر اس بات کی کیا تصدیق یا تشفی و تسلی ہے کہ آپ جس کے آگے حوروں سے نازک، مرغزاروں کی مہک میں گندھے ہوئے آبشاروں کی کھنک سے

سے قلوب کو مسخر نہیں کرتیں؟

ایک بات اور عرض کیے دوں کہ سلوک و معرفت کی پر پیچ وادی کے باسیوں میں جس کا چناؤ قیادت و سیادت کے لئے من جانب اللہ ہو جائے۔ وہ اپنے شیخ کی توجہ کا مرکز و محور بننا شروع ہو جاتا ہے میرا شروع دن ہی سے یہ غیر جانبدارانہ اور محسوس نظریہ رہا ہے کہ اگر سلسلہ عالیہ کے جم غفیر میں سے اس وقت حضرت جی مد ظلہ کو او جھل کر دیا جاتا تو بڑے حضرتؒ جی کے پاس باقی صرف مسکینوں کا 'ٹمٹمانا' نالے کرتے ہوئے درویشوں کی بھیڑ اور حضرت جیؒ کے اعصاب مبارکہ پر مسائل کا بوجھ لادنے والی جسموں میں ڈھکی چھپی چند سادہ روحوں کے علاوہ شاید کچھ کم ہی دیکھنے کو ملتا اس لئے کہ جب کوئی جوہری اپنے کسی نایاب ہیرے کو تراش کے لئے مخصوص کرتا ہے تو پرکھ رکھنے والی ہر نگاہ لاشعوری طور پر جھرمٹ کے بیچ میں سے صرف اسی ہیرے پر جا پڑتی ہے جو بھی طور پر کسی عظیم مقصد کے لئے چمکایا جا رہا ہوتا ہے۔

بس اللہ تعالیٰ میرے شیخ کو نظر بد و حاسد سے بچائے۔ عمر نوح عطا فرمائے اور ان کا متبرک سایہ تادیر ہم جیسے کمزور و نحیف و نزاع صوفیوں پر قائم و دائم رکھے ۔۔۔۔ ثمہ آمین۔

صوفیاء، محققین، علماء ربانیین اور قرآن کریم کے مفسرین سے ایک بات اکثر سننے یا پڑھنے کو ملتی ہے کہ بعض اوقات من جانب اللہ ایک ایسا علم باتباع نبوی علی صاحبہا کسی امتی کو ودیعت کیا جاتا ہے جس کا ماخذ اسباب ظاہرہ نہیں ہوتے یہ استحقاق خالصتاً انبیاکرام علیہم السلام کا رہا ہے کہ وہ عظیم ہستیاں کسی انسان کے آگے حصول علم کی خاطر زانوء تلمذ دراز نہیں فرماتے ان کے قلوب مطہرہ پر علوم کے عار بے مثال منزل من اللہ ہوتے ہیں۔ وہ القائی' الہامی یا وحی ربانی کے ذریعے عطا کئے

جاتے ہیں۔اس کو قرآن کی زبان میں علم لدنی کہا گیا ہے۔

نبی رحمت ﷺ کے معجزات مطہرہ کی طولانی فہرست میں ایک معجزہ امیت بڑا عجیب اور محیر العقول ہے کہ آپؐ نے ظاہراً کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا مگر بعثت مطہرہ سے لے کر ابد الآباد تک کے علوم انسانی کا ماخذ آپ کا قلب اطہر یا زبان حق ترجمان ہے اور رہے گی۔ بلکہ جب جبرئیل امین پہلی دفعہ غار حرا میں قرآن مقدس کے نزول کی ابتدا کا مژدہ بارگاہ رسالت پناہی میں سنانے حاضر ہوئے اور عرض کی "اقراء (پڑھیئے) تو آپؐ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ مگر تاریخ انسانی گواہ ہے کہ علوم ادیان وابدان آپؐ نے لٹائے ان کی بازگشت آپ کی بعثت مطہرہ سے قبل ملتی ہے اور نہ اس کی نظیر آج تک کوئی پیش کر سکا ہے اور نہ ہی آئندہ ایسا ممکن ہو سکے گا۔ آپ ﷺ کے اس اعجاز مبین کو قرآن امیت کے لقب سے سرفراز فرماتا ہے۔

اسی اعجاز مصطفوی کا کوئی کرشمہ یا شمعہ امتی جو باتباع نبویؐ عطا ہوتا ہے تو یہ امیت کی ہی خوشہ چینی کہلاتا ہے۔

میرے عظیم و عجیب شیخ کسی معروف مدرسے یا خانقاہ سے مروجہ دینی علوم میں فارغ التحصیل نہیں ہیں مگر جب بڑے بڑے علماء کو ہم آپ کی تفسیر قرآن "اسرار التنزیل" (۱۰ جلدوں پر مشتمل) دکھاتے ہیں تو ورق گردانی کے بعد پہلا سوال جو سننے کو ملتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ آپ کے شیخ کون سی درسگاہ سے فارغ ہیں؟ انہوں نے دورہ حدیث کہاں سے پڑھا ہے؟ اور رموز قرآن کے لئے کتنے سفر کئے ہیں۔ تو میں بے دھڑک کہہ دیا کرتا ہوں کہ میرے اس متبرک شیخ کو علوم اور رموز قرآن سے مزین جتنے پر مشقت اور جانفشا مجاہدات کرنے ضروری تھے۔ وہ ان کے شیخ معظمؒ نے ان کی جگہ پہلے کر چھوڑے تھے اس لئے انہیں اسکی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ صوفیاء کاملین کے بعض مرید ایسے ہوتے ہیں جو مرید کم اور مراد زیادہ ہوتے

ہیں میرے موجودہ شیخ اپنے شیخ کے مرید نہیں بلکہ مراد ہیں اس لئے بڑے حضرت جی مسلسل پون صدی مجاہدات خود ادا فرماتے رہے اور ثمرات موجودہ حضرت جی مدظلہ کو عطا فرماتے رہے۔ یہ بھی تو صوفیاء میں امیت کی ہی ایک دلربا ادا ہے۔ جو تاریخ تصوف میں صدیوں کے بعد کبھی کبھی کوئی کسی کے لئے کیا کرتا ہے۔

میرے شیخ مقدس کی حیات مبارکہ کا ایک منفرد پہلو ایسا ہے جو صوفیاء کبار کے پرنور جھرمٹ میں انہیں ممیز کرتا ہے اس کا پرتو ڈھونڈنے میں آپ کو قرون اولیٰ سے بھی آگے صحابہ کرام کی حیات مطہرہ میں جھانکنا پڑے گا۔

عمومی طور پر صوفیاء فیوض و انوارات کے بحر تلاطم خیز میں غلطاں و پیچاں تصرف یا خوارق سے عبارت زندگی گزارتے رہتے ہیں اپنے متعلقین و متوسلین کو زمانہ کی بے راہ روی سے بچانے کے لئے الگ تھلگ اور گمنام زندگیوں پر مبنی طرز حیات کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر الحمد للہ ہمارے شیخ مکرم یا ان کے شیخ معظم و محترمؒ عین سنت مطہرہ کے مطابق ہمیشہ بھرپور اور ہر شعبہ حیات میں قوت کار سے معمور زندگی گزارنے کی نہ صرف تلقین فرماتے رہے ہیں بلکہ ہر قدم پر ایک قابل تقلید نمونہ بھی بن کر دکھاتے رہے ہیں۔

حضرت جی مدظلہ نہ صرف ایک کامل صوفی ہیں بلکہ بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے شاعر غزل و نعت، حمد و نظم ہیں۔

حساس اور باریک بین نگاہوں کے حامل سیاح، جن کے سفر نامے منفرد اور دلپذیر انداز تحریر کے حامل ہیں۔ آپ منجھے ہوئے شکاری جو خنجراب کی برف پوش چوٹیوں پر بسنے والے چیتوں سے لے کر پستول کی مدد سے اڑتے ہوئے کوے پر اپنے نشانے کی دھاک بٹھانا جانتے ہیں۔ ایک تجربہ کار کاشتکار اور کوئلے کی صنعت کے بہترین کاہن ہونے کے علاوہ ملکی سطح پر مستحقین کے لئے معروف رفائی ادارہ

''الفلاح'' کی سرپرستی فرمارہے ہیں

صقارہ نظام تعلیم کو چار اداروں کی وساطت سے نہایت خوبصورت اقدار کے تحت رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ سود کی لعنت سے مبرا ایک بہترین مالیاتی ادارہ پرائیویٹ سطح پر چلارہے ہیں جس کا سالانہ منافع نہ صرف تسلی بخش ہے بلکہ سودی اداروں کے مقابل مضبوط معیار کا حامل ہے۔

آپ نے حال ہی میں ایک ایسی بین الاقوامی تحریک کا بیڑہ اٹھایا ہے جس کے تصور سے ہی آج کل کے علماء کرام خائف ہیں۔ وہ صرف درس و تدریس' وعظ و نصیحت اور تبلیغ و تعلم کو اسلام سمجھ کر مسجدوں' محرابوں' مدرسوں اور خانقاہوں کی فصیلوں کے اندر مقید ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کی دہلیز کے باہر قومی سطح پر جو طاغوتی کھیل جاری ہے اسطرف توجہ دینے کو وہ اسلام کا شعبہ ہی نہیں سمجھتے جب کہ یہ مسئلہ آج پوری قوم' عالم اسلام بلکہ انسانیت کے لئے اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ تنظیم الاخوان آپ ہی کے جذبہ نفاذ اسلام کا عملی ثبوت ہے جس دلیری اور بے باکی سے آپ نے نفاذ اسلام کے مطالبے کو قومی سطح پر اجاگر کیا ہے۔ اس سے پہلے پاکستان کی تاریخ میں کسی عالم دین نے اس طرح مضبوط موقف اختیار نہیں کیا۔ بلکہ مروجہ انتخابی سیاست کی دلدل میں غرق ہوتے رہے ہیں اور اب بھی نہایت سادگی سے وہی روش اپنائے ہوئے ہیں۔ ایک ایسے سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں جس تک رسائی قومی تاریخ کے پچھلے 50 سالوں میں ممکن ہو سکی ہے اور نہ ہی آئندہ اسکا کوئی امکان ہے بلکہ اندیشہ زیاں ہے۔

نفاذ اسلام بذریعہ انقلاب کے تصور سے ہی ہمارے علماء کی اکثریت لرزہ بر اندام ہے۔ یہود و نصاریٰ کا بیہودہ اور غلیظ پروپیگنڈہ جو جیاد پرستی' مذہبی دھشت گردی یا رد جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے نام پر مسلسل کیا جارہا ہے اس سے بالواسطہ یا بلا

واسطہ مرعوب نظر آتے ہیں۔ اندر خانے نفاذ اسلام کو ناممکن اور سعی لاحاصل سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس تناظر میں امیر تنظیم الاخوان تنہا طاغوتی یلغار کے سامنے سینہ سپر ہیں۔ قوم کو نفاذ اسلام کا مژدہ مسلسل سنا رہے ہیں' حکمت وضع فرمارہے ہیں' قومی سیاست میں اپنا مقام بنا رہے ہیں' اسلامی قوتوں کو یکجا کروا رہے ہیں اور اسلام کے مقدس وپاکیزہ نظام کے لئے راستہ ہموار فرمارہے ہیں۔

کیا مستقبل کا کوئی مورخ میرے شیخ مکرم کی ان شبانہ روز مساعی جمیلہ کو تاریخ اسلام کے ایک خوبصورت اور سنہری باب کے طور پر نہیں لکھے گا؟ یقیناً ایسا ہو گا بلکہ اس سے بھی آگے جب حقیقتاً انشاء اللہ اس خطہ زمین پر غزوۂ ہند کا غلغلہ بلند ہو گا' مہر نبوت کا پھریرا لہرائے گا' یہ مجاہد اسلام برسر اقتدار آئے گا تو انشاء اللہ تاریخ اسلام کا درخشندہ وتابندہ باب معرض وجود میں آئے گا اور یہ سب کچھ خدام تنظیم الاخوان کر گزریں گے۔

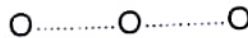
مہر نبوت علم بنا کر دنیا پر لہرائیں گے
دیکھنا یہ سیماب تم اک دن آخر ہم کر جائیں گے

مجھ پر علماء ظاہرین کے ایک مضبوط طبقے (بلکہ کبھی کبھار خود اپنے احباب) کی طرف سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں اپنے شیوخ مکرمیان کو کوئی مافوق قسم کی مخلوق سمجھتا ہوں۔ زمین پر موجود کسی بندے کو ان کے مقابل خاطر میں نہیں لاتا۔ ان کے نام نامی کے آتے ہی بے مقصد جذباتیت اور بلند فشار خون کا شکار ہو جاتا ہوں یا پھر مشائخ کبار کے بارے کوئی ایسی بات جو میرے مزاج کو راس نہ آئے وہ سنتے ہی فوراً دو حرف تختہ پر اتر آتا ہوں- وغیرہ------وغیرہ۔

مجھے اس کے جواب میں اپنے قاری کو صرف یہی باور کرانا ہے کہ یہ الزامات نہیں بلکہ ہر سالک یا حصول فیض کے صحیح طالب کے مزاج کا جزو لاینفک اور خصائص

متبرکہ میں سے ہونا چاہئیں تب ہی وہ اپنے شیخ سے کما حقہ فیض یاب ہو سکے گا۔ ورنہ فہم و خرد اور مزاجی اعتدال پسندیوں کی پر پیچ بھول بھلیوں میں ہمیشہ غلطاں و پیچاں ٹامک ٹوئیاں مار تا پھرے گا۔ زندگی کی ناؤ ڈوبنے لگے گی اور وہ عشق حق کے مے خانے سے تشنہ لب واپس دھکیل دیا جائے گا۔

ورنہ میں تو ہر جگہ بر ملا کہتا ہوں کہ میرا شیخ بس ایک بندہ حق ہی تو ہے۔



مرامیر کارواں

نسیم ملک

ذکر کرتے چند ہی روز گزرے تھے کہ تیز آنکھوں اور نوکیلی داڑھی والے ہمارے ذکر انچارج نے مجھے کہا "میں تمہیں دو نصیحتیں کرتا ہوں، انہیں پلے باندھ لو اور سلسلہ عالیہ میں رہنے کے لئے ان پر ہمیشہ عمل کرنا"۔ "ارشاد" میں نے عرض کیا۔ "پہلی بات یہ کہ استاد المکرم دامت برکاتہ کا ہمیشہ ادب کرنا۔ دوسری بات ہمارے سلسلہ کے اکابرین میں سے ایک ملک اکرم صاحب ہیں ان کے زیادہ قریب نہیں لگنا وہ بہت سخت بزرگ ہیں"۔ "تعمیل ارشاد ہوگی جناب" میں مرعوب سا ہو گیا۔ اور دونوں باتیں بڑے خلوص سے پلے باندھ لیں۔ افسوس کہ پہلی نصیحت پر عمل نہ کرسکا۔ اگر رب کریم وہ وقت دوبارہ بھی واپس لے آئیں تو بھی میں اس ہستی عظیم کا کماحقہ ادب نہیں کر سکتا۔ جو عظیم انسان میرے جیسے شخص کی تربیت کر کے اسے دربار نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تک پہنچادے۔ میں اس کے ادب کا حق کیسے ادا کرسکتا ہوں اس کے احسان کا بدلہ کیوں کر چکا سکتا ہوں، میں اس کے لئے صرف

دعا کر سکتا ہوں کہ رب کریم اسے میری طرف سے وہ جزا عطا فرمائے کہ جس کا وہ مستحق ہے۔

پر زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ دوسری نصیحت پر عمل میں بھی کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جناب ملک صاحب سے ملاقات 1975 کے منارہ کے اجتماع میں ہوئی۔ ان سے ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی۔ وہ اجتماع کے انتظامی امور میں مصروف رہتے اپنے ٹرک پر احباب کے لئے پانی اور گھر میں جلانے کے لئے لکڑیاں ڈھوتے 'ذکر پر آتے تو ہم دور سے دیکھ لیتے ویسے بھی ہماری پہلی ملاقات کوئی خاص قابل ذکر نہیں۔ نہ انہوں نے زیادہ لفٹ دی اور نہ ہی میں نے مارے نصیحت قریب ہونے کی کوشش کی۔ مگر جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو خود سے کہا کہ یہ بزرگ سخت ہوں یا نہ ہوں لیکن انتہائی وجیہہ ضرور ہیں۔ مگر یہ سخت نہ ہونے والی خوش فہمی بھی جلد ہی رفع ہو گئی۔ انہی دنوں منارہ سکول میں ایک سادھو نما شخص آ گیا۔ وہ کسی اور پیر سے بیعت تھا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر اس نے اپنے پیر صاحب کی بزرگی کے قصے سنانا شروع کر دیئے کہ کس طرح وہ پورے سال میں صرف ایک بادام کھاتے ہیں۔ ہم خاموشی اور انہماک سے سنا کئے۔ اتنے میں جناب ملک صاحب تشریف لے آئے۔ انہوں نے اسے باہر بلایا اور کچھ دریافت کیا۔ معلوم نہیں کہ اس نے کیا جواب دیا کہ ملک صاحب نے ایک پچاسی نمبر کا زناٹا اسے رسید کر دیا۔ دوسرا نوے نمبر کا۔ پھر اسے گرا لیا اور تین لاتیں جڑ دیں۔ جب اس نے اٹھنے کا تکلف کئے بغیر ہی دوڑ جانے کی کوشش کی تو moreover کے طور پر ایک عدد لات اور رسید کر دی۔ میں اس حادثے کا قریبی اور عینی شاہد تھا۔ "ہمارا وہ ذکر ماسٹر ٹھیک ہی تو کہتا تھا" میں نے خود سے کہا۔ بہر حال اس پورے اجتماع میں خود کو جناب ملک صاحب سے بچا بچا کر دور رکھنے کی کوشش میں خاصا کامیاب رہا۔

ان دنوں پنڈی رہتا تھا۔ ایک شام اطلاع ملی کہ صوبہ سرحد سے واپسی پر حافظ عبدالرزاق صاحب میرے غریب خانہ پر رات کا قیام فرمائیں گے۔ جب وہ تشریف لائے تو دیکھا ان کے ہمراہ ملک صاحب بھی ہیں۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ بندوبست ناکافی تھا۔ میں قدرے پریشان ہوا۔ جناب ملک صاحب نے فرمایا "یار میں تو صوفے پر سوؤں گا" اور جواب کا انتظار کئے بغیر صوفے پر دراز ہو گئے۔ پاؤں صوفے سے فٹ فٹ باہر نکلے ہوئے۔ کروٹ نہ بدلی اور نہ ہی بدل سکتے تھے۔ صبح اسی طرح خوش و خرم۔ اتنا پیار کیا کہ میں حیران ہو گیا اور رخصت ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد جناب ملک صاحب نے اپنی مرسیڈیز کار ایک خط کے ہمراہ مجھے بھیج دی کہ اسے بیچ دو۔ میں نے بہت کوشش کی نہ بکی۔ جناب ملک صاحب کا خط موصول ہوا کہ مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے کار بیچنے کی مزید کوشش کرو۔ میں پہلے ہی اپنی کوشش سے نالاں بیٹھا تھا' شاید بچوں کے پرچے دیکھ رہا تھا اسی سرخ پنسل سے فوراً جواب گھسیٹ دیا کہ جناب آپ کی اس کار نے مجھے بہت پریشان کیا ہے' یہ بکنے والی نہیں۔ اگلے ہی روز ملک صاحب کا خط ملا۔ "کار کی بات چھوڑو۔ مجھے تمہاری پریشانی نے پریشان کر دیا ہے۔ تحریر کی سرخ روشنائی نے مزید فکر مند کر دیا ہے۔ کار کو بھول جاؤ' ڈرائیور بھیج دوں گا لے جائے گا۔ اپنی خیریت سے مطلع کرو" اس خط سے پہلی مرتبہ جناب ملک صاحب کے متعلق میرے خیالات میں ایک غیر محسوس سا Dent پڑ گیا۔

اگلے اجتماع میں پھر اکٹھے تھے۔ اس مرتبہ جناب ملک صاحب نے ایک عجیب تماشا دکھایا۔ ایک شام ایک شیشے کی بوتل میں سانپ بند کر کے لے آئے۔ پتلا' زہریلا سانپ' تند خوا تنا کہ بوتل کو ڈسنے کی کوشش کرتا تھا۔ کہنے لگے۔ "میں نے کنوئیں میں ڈول ڈالا تو باہر آ گیا"۔ میں نے بوتل سامنے رکھ دی اور کہا کہ بوتل یا موت؟ یہ بوتل میں گھس گیا" ہم سب کافی محظوظ ہوئے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ

بوتل کا منہ کھول کر اسے باہر نکال دیں اسے مار دیتے ہیں۔ جناب ملک صاحب نے کہا نہیں بھائی میرا اس وعدہ ہے۔ اس نے موت کے بجائے بوتل چن لی تھی۔ اب میں اسے کسی ویرانے میں جاکر آزاد کر دوں گا"۔ وعدے کی اس طرح کی پابندی کم از کم مجھے بڑی اچھی لگی۔

ان دنوں استاد المکرم کی آبائی زمین کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ مزارع خالی نہیں کرتے تھے۔ میں ایک دن اسی سلسلے میں میانوالی گیا۔ چکڑالہ سے ہوتے ہوئے بہت دیر بعد منارہ پہنچا۔ صبح فیصلہ ہوا کہ ان مزارعین سے دوبدو بات کی جائے۔ جناب ملک صاحب کے ٹرک پر کافی سارے ساتھی عازم چکڑالہ ہوئے۔ جناب ملک صاحب ڈرائیو کر رہے تھے۔ میں ساتھ بیٹھا تھا اور میرے ساتھ جناب ہاشم بلوچ صاحب۔ چکڑالہ پہنچ کر زمین پر آئے (یہ وہی زمین ہے جہاں آج کل مرشد آباد ہے اور استاد المکرم محو استراحت ہیں) مزارعین سے بات کی اور واپس روانہ ہوئے۔ واپسی پر بھی میں جناب ملک صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ساری رات کا "جگ راتا" اور تھکان، تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے اپنا سر جناب ملک صاحب کے کندھے پر رکھا اور سو گیا۔ جناب ملک صاحب نے اپنا بازو اوپر کیا اور میرے سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ تین گھنٹے وہ ٹرک چلاتے رہے اور میں آرام سے سوتا رہا۔ منارہ سے نیچے والے موڑ پر میری آنکھ کھلی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے "یہ دیکھو میں یہ والا موڑ کیسے کاٹتا ہوں۔ رفتار بھی کم نہیں ہوگی اور چاروں ٹائر بھی سڑک پر رہیں گے" میں نے خود سے کہا "ہمارا وہ ذکر والا ماسٹر بالکل غلط کہتا تھا"۔

اور پھر جناب ملک صاحب سے میری شناسائی ہوگئی۔ البتہ میں نے یہ احتیاط ضرور کی کہ ان کے متعلق اپنی رائے کو احباب کی آراء سے متاثر نہ ہونے دیا اور حتی الامکان اپنی آزادانہ رائے قائم کی۔ میں اس معاملے میں کافی خود غرض واقع ہوا

ہوں۔ جب احباب نے پہلی بار مجھے سلسلہ عالیہ کی طرف دعوت دی توانہوں نے یہ بھی Highlight کیا کہ ہمارا شیخ سب سے بڑا ولی اللہ ہے۔ اس پر میرا ردعمل یہ تھا کہ میں اس دعوے کو چیلنج تو نہیں کرتا لیکن مجھے جس بات سے غرض ہے وہ یہ کہ وہ میرے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ مجھے کتنا اچھا اور نیک بنا سکتے ہیں۔ یہی سلوک میں نے جناب ملک صاحب کے متعلق اپنی رائے سے کیا۔

ایک بات ضرور تھی کہ جناب ملک صاحب ' سلسلہ میں تمام احباب سے ممتاز و منفرد تھے۔ استاد المکرم کے ہاں انتہائی سنجیدہ محفل لگی ہوتی' جناب ملک صاحب تشریف لاتے تو استاد خوش ہو جاتے اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا۔ ایک مرتبہ جناب ملک صاحب "سیف مرتضویہ" ہمراہ لائے اور پڑھ کر استادوں کو سنانا شروع کر دی۔ میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ استادوں کو معصوم بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستے دیکھا۔

اسی اجتماع کے دوران میرا جناب ملک صاحب سے مرسیڈیز کار کا سودا ہو گیا۔ انھوں نے Try دی قیمت طے کی اور چابی میرے حوالے کر دی۔ مجھے بڑی خوش گوار حیرت ہوئی کہ انھوں نے تمام شرائط میری مانیں۔ چابی لے کر خوش خوش منارہ سکول آیا تو جناب حافظ صاحب اور ملک خدا بخش صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اپنے کارنامے کا تذکرہ کیا تو بزرگ ایک دم باجماعت خفا ہو گئے۔ تم یہ گاڑی چلاؤ گے؟۔ انھوں نے بیک زبان استفسار کیا۔ "بالکل چلاؤں گا۔ مجھے کیا ہے"۔ "تم یہ گاڑی ہرگز نہیں لوگے" بزرگ بالکل ہی خفا ہو گئے۔ "واپس کرو یہ چابی۔ ملک خدا بخش کو دے دو۔ یہ انہیں دے دیں گے"۔ "لیکن یہ بڑی معیوب بات ہے۔ میں سودے سے کیسے پھر سکتا ہوں؟"۔ میں نے احتجاج کیا۔ "کوئی معیوب ویوب بات نہیں ہے۔ لو جی ملک صاحب چابی اور آگے دے دینا"۔ میں نے بوجھل

دل کے ساتھ چابی حوالے کر دی۔ اگلے ہی روز جناب ملک صاحب سے ٹاکرا ہو گیا۔ میں انتہائی ندامت کے احساس کے ساتھ ملا۔ وہ انتہائی پیار سے ملے۔ تذکرہ تک نہیں کیا۔ کبھی نہیں کیا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ استاد المکرمؒ کو یہ کہتے سنا کہ "تم سارے میرے مرید ہو صرف اکرم میری مراد ہے"۔ تو بڑا حیران ہوا۔ میں خود تو نیا ساتھی تھا، مگر ہمارے اکابرین میں تو بڑی بزرگ باکمال ہستیاں موجود تھیں۔ اسی شام بعض احباب رات دیر سے پہنچے۔ دور سے آئے تھے اور کھانا بھی نہیں کھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اندھیرے میں سے جناب ملک صاحب نمودار ہوئے۔ سر پر چپاتیوں کی پنڈ اور اس پر دال کا دیگچہ۔ "یار دیر تو نہیں ہو گئی؟۔ اصل میں آج روٹی نہیں بچی تھی۔ جب تک گھر والوں نے آٹا گوندھا، میں نے تندور جلا دیا اور روٹی جلدی پک گئی"۔

تب علم ہوا کہ جب سے سلسلہ عالیہ قائم ہوا اس کے اجتماع کے تمام اخراجات جناب ملک صاحب برداشت کرتے تھی۔ ان کی زمین کی ساری گندم اجتماع کے لئے استعمال ہوتی، اگر کچھ بچ جاتی تو وہ خود استعمال کرتے۔ یہ گندم وہ خود بوتے، کاٹتے اور صاف کراتے۔ ان کے گھر والے احباب کے لئے خود کھانا تیار کرتے اور اس سارے کام میں تمام خاندان خوشی اور فخر محسوس کرتا۔ احباب کی خدمت کا محور یہ ایک خاندان تھا۔ ایک مرتبہ بات ہوئی تو ہنس دیے۔ "نسیم تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ تمہارے پاس جو بچتا ہے وہ اس راہ میں دیتے ہو۔ میرا سب کچھ اسی راہ میں ہے۔ جو بچ جاتا ہے وہ خود استعمال کرتا ہوں"۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب احباب کا لنگر دارالعرفان منتقل ہوا تو جناب ملک صاحب کی والدہ محترمہ اور اہلیہ محترمہ دونوں روتی رہیں کہ آپ لوگوں نے ہمیں اس عظیم سعادت سے محروم کر دیا۔

میرے ایک ماموں دیوبند فاضل، مستند عالم دین تھے۔ بمضبوط بلکہ ذرا سخت

طبیعت کے مالک 'حضرت مدنی کے براہ راست شاگرد تھے۔ ایک دن ان سے کہہ بیٹھا کہ میں لطائف کرتا ہوں۔ انہوں نے کوئی لفٹ نہیں دی۔ میں نے آگے کہہ دیا کہ مراقبات بھی کرتا ہوں۔ انہوں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بولے "وہ لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے جو یہ کام کرتے تھے"۔ میں نے کہا "میرے شیخ روحانی بیعت بھی کراتے ہیں" ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "مجھے ابھی ساتھ لے چلو۔" ہم منارہ سکول آگئے۔ ماموں جان سارا دن بیٹھے آہستہ آہستہ روتے رہتے۔ دو تین دن تو میں خاموش تماشائی بنا رہا۔ آخر تنگ آکر پوچھ لیا۔ جواب میرے لئے کوئی خاص حوصلہ افزا نہیں تھا۔ کہنے لگے "تمہیں یہ سب انعامات مفت مل گئے ہیں جس طرح گلی میں چوں کو بٹتے ہیں۔ تمہیں ان کی عظمت کا احساس ہے اور نہ ہی قدر۔ ہم سے پوچھو ہماری ساری عمر ان کی آرزو اور جستجو میں صرف ہو گئی۔ اب جب کہ پاؤں قبر میں جا چکے ہیں' جسم میں جان نہیں' وہ بے نیاز اب اس بحر فیوضات تک لے آیا"۔ ان دنوں جناب ملک صاحب روزانہ فجر کی نماز کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ ماموں جان مجھ سے پوچھنے لگے۔ "یہ جو مولانا اکرم صاحب درس دیتے ہیں۔ یہ کہاں سے فارغ التحصیل ہیں؟"۔ "کہیں سے بھی نہیں" میں نے جواب دیا "کیا مطلب؟" "مطلب یہ کہ کسی بھی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل نہیں ہیں"۔ ماموں جان بالکل ہی ناراض ہو گئے۔ "تم خود احمق ہو یا مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟۔ جو نکات مولانا بیان کرتے ہیں' میں نے دیوبند میں بھی نہیں سنے۔ قرآن فہمی کے ساتھ معاملہ فہمی بھی اعلیٰ درجے کی عطاء ہوئی اور عقل و دانش کے جس Level سے ان کی بات آتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں نہ کہیں دیکھا نہ کہیں سنا۔ اس وصف نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ بات کرنے اور سننے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

تین سال کی جان پہچان کے بعد میں نے سوچا کہ جناب ملک صاحب سے محدود

اور محتاط تعلق داری میں کوئی خاص خطرہ نہیں۔

اور پھر میری اہلیہ بیمار ہوگئی۔ اس کی بیماری نے مجھے ہلا دیا۔ استاد المکرمؒ کی خدمت میں عرض کیا تو فکر مند ہوئے۔ فرمایا "انشاء اللہ عارضی تکلیف ہے" جناب ملک صاحب کو علم ہوا تو ہنس دیئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بظاہر لاتعلق رہنے والی اس ہستی نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ دارالعرفان کے پورے اجتماع کے دوران میری اہلیہ کو اپنے گھر مہمان کے طور پر رکھا اور اسکی احسن طریقے سے دیکھ بھال کی۔ پھر جب میں اپنی اہلیہ کو گھر چھوڑ آیا تو مجھے سمجھایا کہ اسے اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں۔ واپس لے آؤ اور ساتھ رکھو۔ ہماری اس تکلیف کے دوران جس طرح جناب ملک صاحب نے شفقت فرمائی، ہمارا حوصلہ بڑھایا اور ساتھ دیا۔ اس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کے اس احسان کا بدلہ دینا تو دور کی بات ہے ہم اسکا شکریہ تک ادا نہیں کر سکتے۔

اور پھر سلسلہ عالیہ کی تاریخ کا سانحہ عظیم پیش آگیا۔ 1984ء میں استاد المکرم ہمیں اپنے سائے سے محروم کر گئے۔ اس نازک وقت پر جناب ملک صاحب نے جس حوصلے اور بلند ہمتی سے احباب کو سنبھالا اور حوصلہ دیا' وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔ سلسلہ عالیہ کے احباب نے متفقہ طور پر جناب ملک صاحب کو اپنا شیخ تسلیم کیا اور ان کے دست اقدس پر بیعت کی۔ حضرت شیخ المکرم مدظلہ العالی نے سلسلہ عالیہ کی باگ ڈور اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر احباب کی تربیت انتہائی دلکش اور دلنشیں انداز میں شروع فرمائی۔ استاد المکرم نے جس عمارت کی مضبوط بنیادیں استوار فرمائی تھی۔ حضرت مدظلہ العالی نے اس کا باقی حصہ اسی طرح مضبوط اور خوبصورت طریقے سے تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ تربیت کا انداز انتہائی حسین اور چھوٹی چھوٹی باتیں جو انسان کی زندگی کا رخ بدلنے کو کافی ہو جائیں۔ "سب سے بہترین

انسان ایک مسلمان ہوتا ہے اور سب سے بہترین مسلمان ایک صوفی"۔"دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ ہرگز نہیں بنانا چاہیے اور نہ ہی دین پر عمل کو دنیاوی مسائل کا علاج سمجھنا چاہئے یہ مذاہب باطلہ کا خاصہ ہے"۔

آخر کار مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا جو تقریباً گیارہ سال میرے ذہن سے چپکا رہا کہ حضرت مدظلہ العالی کو احباب اتنا سخت کیوں سمجھتے ہیں؟ اصل میں ہم سب نے الا ماشاءاللہ اپنے اوپر دو خول ضرور چڑھا رکھے ہوتے ہیں۔ اندر انانیت کا اور اوپر مفادات کا۔ بسا اوقات یہ خول اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ ہماری اصلی شخصیت ہماری نگاہوں سے بھی اوجھل ہو جاتی ہے۔ ہم جس شخص سے ملتے ہیں اسے مفادات کے ترازو میں تولتے ہیں کہ یہ شخص ہمارے لئے کتنا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی تجارتی برتاؤ ہم شیخ کے ساتھ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ مجھے ممتاز مفتی مرحوم نے بتایا کہ میں ایک پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوا روپیہ نیاز پیش کی۔ انہوں نے مجھے چند وظائف بتائے کہ بیٹا یہ پڑھا کرو۔ میں نے عرض کی کہ حضرت اگر وظائف میں نے ہی پڑھنے تھے تو سوا روپیہ آپ کو کیوں دیتا۔ یہ سوا روپیہ تو دیا ہی اس لئے ہے کہ میری طرف سے یہ وظائف آپ پڑھا کریں۔

ہم بھی غیر شعوری طور پر اپنے شیخ کو اسی ترازو میں تولتے ہیں۔ دوسرا خول اس سے بھی مضبوط تر ہے۔ نہاں خانہ دل میں بڑائی کا خیال نہ سہی لیکن منفرد شخصیت Self-Recognition کی طلب ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ جب کہ شیخ اپنی توجہ اور شفقت سے ایسے تمام خول اتار کر اندرونی شخصیت کو نکھارتا ہے۔ دوسری بات کہ حضرت مدظلہ العالی کی اپنی شخصیت پر کوئی خول ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ان کے اندر ہے وہی باہر۔ He is what he is۔ ان کی شخصیت میں صرف کھرا پن ہے۔ پرابلم تب شروع ہوتا ہے جب ہم اپنے خول میں بند رہ کر

ان سے معاملہ کرتے ہیں لیکن اگر ایک مرتبہ یہ بات سمجھ میں آجائے تو مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے- ان سے تعلق داری بہت آسان ہو جاتی ہے۔ میرے ذاتی خیال میں He is the easiest person to get alongwith-انسان ان کے جس قدر قریب ہوتا جاتا ہے' ان کی شخصیت کی عظمت سے مرعوب لیکن مٹھاس سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ اس قدر سادہ' محبت کرنے والا' دکھ درد میں شریک' تکالیف میں ساتھ دینے والا' PUre اور شیریں انسان جو کسی کو نہیں دھتکارتا' کسی کو واپس نہیں کرتا' بلکہ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اسے اپنے چشمہ دل سے محبت کا زمزم پلاتا ہے۔ اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کی انگلی تھام کر اللہ کے قرب و معرفت کے راستے پر قدم قدم چلاتا ہے- اپنے وجود کی روشنی اور گرمی سے اس کے وجود میں اللہ اور رسول ﷺ کی محبت اور ادب کے چراغ جلاتا ہے۔ جو سب کو خوشیاں بانٹتا ہے اور سب کے غم میں شریک رہتا ہے-

خوشیاں بانٹوں جہان بھر کو میں دکھ جہاں بھر کے دل پہ سہتا ہوں

ہم جیسے Multi-Complexes میں مبتلا اشخاص کا ایک ایسی ہستی سے کہ جس میں کوئی Complex نہ ہو' تعلق رکھنا ایک بڑا عجیب دلچسپ تجربہ ہے۔ جن احباب کو ان کے ساتھ قربت کے لمحات نصیب ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس دوران زندگی کا مفہوم ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں دو سال کوئٹہ میں رہا اور اس عرصہ میں غریب خانے کو پانچ مرتبہ شرف میزبانی بخشا- خدا گواہ ہے کہ جب قیام پذیر ہوتے تو محسوس ہوتا کہ گھر میں جنت اتر آئی ہے۔ نہ وقت کا احساس رہتا' نہ بے پناہ مصروفیت کی فکر' نہ مہمانان گرامی کی تشریف آوری سے مسئلہ۔ ایک عجیب سی خوشی' اطمینان' سکون اور محبت کا احساس پورے وجود کو شاد و آباد رکھتا- ایک ایسا احساس جو اپنے وجود سے بے نیاز کر دے زندگی میں پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ اگر روح مطمئن اور

خوش ہو تو بدن کی تکلیف محسوس تک نہیں ہونے دیتی۔

زندگی تو اسی کو کہتے ہیں
جو بسر تیرے ساتھ ہوتی ہے

چلے جاتے تو گھر کے ساتھ ساتھ دل کو بھی ویران کر جاتے۔ حالانکہ مسلسل رابطہ رہتا لیکن وصل اور فراق کے معنی اپنی شدت کے ساتھ دل پر واضح ہو جاتے رہے۔ تب محسوس ہوتا کہ اس ہستی کا ہمارے ساتھ کس قدر محبت اور اپنائیت کا رشتہ ہے۔ کیونکہ جتنی محبت ہم اپنے شیخ سے کرتے ہیں وہ دراصل اس محبت کا عکس ہوتا ہے جو شیخ ہمارے ساتھ کرتا ہے۔ محبت کے چشمے بھی فراز سے نشیب کو بہتے ہیں۔

ایک مرتبہ شیخ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم اگر کچھ دن حضرت کی خدمت میں رہتے تو لطائف اسطرح درد کرنے لگتے گویا سینے میں میخیں ٹھک گئی ہوں۔ جھک کر کوئی چیز اٹھاتے تو درد محسوس ہوتا" میں نے جب یہ بات سنی تو بڑی عجیب لگی۔ سوچا حضرت مدظلہ العالی فرماتے تو صحیح ہوں گے لیکن ایک روحانی احساس کا جسمانی احساس میں تبدیل ہو جانا' ہے بڑی عجیب بات۔ کچھ ہی روز بعد حضرت مدظلہ العالی کے ساتھ بیرون ملک جانے کا شرف نصیب ہوا۔ حضرت کی سیٹ آگے Leg Spaceوالی تھی' میری پیچھے تھی۔ ٹیک آف کے کچھ دیر بعد میں حضرت کے سامنے رکھے ہوئے بیگ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے کی محفل کے بعد حضرت نے آرام کا عندیہ دیا تو میں پیچھے آگیا۔ برٹش ائیر کی فلائٹ تھی۔ انہوں نے کھانا تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی سکرین پر ایک فلم لگا دی جس میں ایک خاتون کا رقص اور گانا تھا۔ اول تو کھانے میں حرام کا واضح اور غالب عنصر' پھر شراب اور اس پر مستزادوہ رقص اور گانا۔ ایسے ماحول کی نحوست کی شدت کا صحیح اندازہ صرف

وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس میں گزرے ہوں۔ دفعتاً ایسے لگا کہ میرے سارے لطائف اور پھر پورے وجود کا ایک ایک ذرہ اللہ کے ذکر سے منور ہو گیا ہو۔ وہ ناقابل تردید احساس جو مجھ جیسے شخص کو بھی محسوس کرنے پر مجبور کر دے۔ پھر معاً پورا جہاز روشن ہو گیا۔ اس کی ناقابل برداشت نحوست پر برکات چھا گئیں۔ میں نے حضرت المکرم مدظلہ العالی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگائے گویا آرام فرما رہے تھے۔ یہ احساس اس قدر شدید ہو گیا کہ جیسے میرا وجود اور جہاز پھٹ جائیں گے۔ تب یہ بات عملاً سمجھ میں آئی کہ عظیم المرتبت اہل اللہ 'ماحول کو کیسے متاثر اور تبدیل کرتے ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً دو ہفتے قیام تھا۔ وہی شب و روز کی مصروفیت بغیر تھکاوٹ۔ چوتھے دن میں کوئی چیز اٹھانے کے لئے جھکا تو سینے میں عجیب سا احساس ہوا۔ لطائف اس طرح درد کرنے لگے گویا سینے کے آر پار میخیں ٹھک گئی ہوں۔ میٹھا میٹھا درد جو زیادہ ہوتا گیا۔ جب بھی ٹیس اٹھتی' میں مسکرا دیتا کہ یوں سمجھ میں آتی ہیں عجیب باتیں۔

1993ء میں حضرت المکرم نے الاخوان قائم کر دی۔ سارے ساتھیوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ مگر جب حضرت مدظلہ العالی نے بات سمجھائی تو احساس ہوا کہ یہ تو اہم ترین کام تھا جو اب شروع ہو رہا ہے۔

قرآن کریم نے آقائے نامدار ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد دین حق کا تمام مذاہب پر غلبہ ارشاد فرمایا ہے اس کے لئے جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض مقدسہ کے تین پہلو ارشاد ہوئے ہیں۔ اول تلاوت آیات یعنی دعوت و تبلیغ کہ اس پیام حیات آفریں کو چار دانگ عالم تک پہنچایا جائے' دوم تزکیہ' یعنی جو اس دعوت کے سامنے سر جھکا دے اس کے باطن کی صفائی اور پاکیزگی۔ سوم کتاب و حکمت کی تعلیم۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ان تین پہلوؤں میں کم از کم اپنا حصہ ضرور

حاصل کرے اور پھر کسی ایک میں مہارت حاصل کر لے۔ لیکن ہمہ وقت یہ مقصد اسکے پیش نظر رہے کہ اس نے پورے دین پر خود بھی عمل کرنا ہے اور دین مبین کو ایک مکمل ضابطہء حیات کے طور پر پورے عالم میں نافذ کرنے کے لئے جہاد مسلسل میں مصروف رہنا ہے۔ اور اس ضمن میں ہر اس فرد یا جماعت سے تعاون کرنا ہے کہ جو اسی مقصد کے لئے کوشاں ہو۔ فرمایا یہ لازم نہیں کہ ہر مسلمان' سلسلہ عالیہ میں شامل ہو بلکہ جو بھائی باہر رہ کر بھی اس عظیم ترین مقصد میں تعاون کرنا چاہتے ہیں' الاخوان ان کے لئے ایک وسیع البنیاد پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔

اس بطل جلیل کی شب و روز کی محنت شاقہ نے چھ سال کے عرصہ قلیل میں الاخوان کو پورے ملک میں مضبوط طریقے سے متعارف کرا دیا ہے بلکہ اب تو بین الاقوامی طور پر بھی مثبت اور منفی رد عمل کا اظہار ہونا شروع ہو گیا ہے۔ الاخوان کے بنیادی نعرے :-

تیرا ایمان میرا ایمان	-	رب کی دھرتی رب کا نظام
الاخوان کا پیغام	-	پاک وطن میں پاک نظام
جان و مال کی بقاء	-	نفاذ دین مصطفےٰ ﷺ
تیری بقاء میری بقاء	-	الجہاد' الجہاد

لاکھوں افراد کی زبان کے گیت اور دل کی دھڑکن بن چکے ہیں۔ عوام میں شعور جس قدر بیدار ہو رہا ہے انہیں اس بات کا یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس وقت سوال ان کی فلاح کا نہیں بلکہ بقاء کا ہے۔ اور ان کی بقاء و فلاح کی ضمانت صرف ایک ہی نظام دے سکتا ہے۔ وہ نظام جو ان کے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اور اس کے نفاذ کی کوشش میں وہی افراد مخلص ہوں گے جنہیں حکومت' دولت اور شہرت کی کوئی طلب نہ ہو بلکہ وہ صرف دین کا نفاذ چاہتے ہوں۔ اس بات



سردار عبدالقیوم کے ہمراہ مارگلہ انسٹیٹیوٹ کی افتتاحی تقریب میں حیثیت مہمان خصوصی



96 میں ضیاء الحق کی برسی پر وزیراعظم کے ساتھ

کو جان کر کئی لاکھ افراد اس میر کارواں کے ہاتھ پر موت کی بیعت کر چکے ہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ جب سیل رواں پورے معاشرے' ملک اور انشاء اللہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

بات بے جا عقیدت و محبت کی نہیں اور نہ ہی بلاوجہ تعصب و تنقید کی۔ ایسی کسی دوسری جماعت کی نشاندہی فرما دیجئے جو اپنے آقائے نامدار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کا اس قدر خیال رکھتی ہو۔ جس کے افراد شب و روز دین کی اشاعت و ترویج میں مصروف ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کی جبیں سجدہ ہائے تہجد کی لذت سے آشنا ہو' ان میں سے ہر ایک کا سینہ الحمد للہ' برکات نبوت ﷺ سے منور ہو۔ دین کی بنیادی تعلیم کا حصول ان کے لئے ضروری ہو اور مقررہ نصاب کی تکمیل ان کی روحانی ترقی کے لئے لازم قرار پائے۔ ایسے روشن جبیں اور منور قلوب والے احباب' جو بعثت نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلیٰ ترین مقصد یعنی احیاء' سر بلندی اور نفاذ دین کے لئے ہمہ وقت اپنی پوری قوت اور صلاحیت کے ساتھ مصروف عمل ہوں۔

پچھلے ہی دنوں ایک ساتھی سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ اگر رب کریم مجھے ایک اور مرتبہ زندگی عطا فرمائیں اور ساتھ یہ کہہ دیں کہ اسے تم صرف ایک آدمی کے ساتھ بسر کر سکتے ہو تو مجھے دوسری بار سوچنا نہیں پڑے گا۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی دوسرا انسان نہیں دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اتنے کمالات یکجا کر دیئے ہوں۔

اور ان کے علاوہ اسے یہ کمال بھی بخشا ہو کہ جس نئے کام کی بھی ابتداء کرے' قلیل مدت میں اس کے انتہائے کمال کو پہنچ جائے۔ ایسا صاحب سلسلہ شیخ کہ جس کی ایک توجہ سے تمام وجود منور ہو کر مراقبات ثلاثہ تک راستہ کھل جائے۔ ایسا مفسر

قرآن' جو کسی مدرسے سے فارغ التحصیل نہ ہو مگر اس کی تفسیر علماء اور عوام کو یکساں متاثر کرے۔ صاحب فہم و فراست جو معاملے کی تہہ تک پہنچ جائے اور اس کا اعلیٰ ترین حل بتادے۔ بیک وقت اعلیٰ درجے کا ادیب اور شاعر۔ ماہر شکاری جو بندوق فانی چیتے کو دوبدو شکار کر سکے۔ ایسا صاحب خرد جو کمپیوٹر سمیت تمام جدید ایجادات کو یکساں آسانی اور مہارت سے استعمال کر سکے۔ ایسا ماہر تعلیم جو معاشرے کو ایک یکساں' نیا اور بہترین نظام تعلیم رائج کر کے دکھادے۔ بلا سود بنکاری اور اسلامی تجارت کا ماڈل بنا کر پیش کر دے۔ ایسا سیاح جس نے پوری دنیا دیکھ ڈالی ہو اور اس کے ہر گوشے میں اپنی وجود کی روشنی سے دوسروں کے دلوں کے دیپ جلاتا آیا ہو۔ ایک صاحب درد جس نے انسانیت کی فلاح کے لئے ایک فاؤنڈیشن قائم کر دی ہو۔ پھر ایک ایسا وجیہہ انسان جس کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور دل گرم۔ جب بات کرے تو الفاظ کیفیات کا روپ دھار لیں۔ اور جس کی صحبت میں اللہ اور اس کی رسول ﷺ سے تعلق تازہ اور مضبوط ہو جائے۔ اتنے سارے کمالات کسی ایک انسان میں جمع ہو جانا محال ہے۔ یہ صرف ایک صورت میں ممکن ہے کہ وہ اس ہستی کامل صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا مقرب غلام ہو کہ اس کی شخصیت میں اس کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا عکس جھلکنے لگے۔ اور یہ سب کچھ ایسے نہیں ہو جاتا۔ وقت' صدیوں ان کا منتظر رہتا ہے۔ اور ان کے اثرات قرنوں کو محیط ہوتے ہیں۔ یہ انقلاب آفرین لوگ زمانے اور تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ دین کی نشاط ثانیہ اور اسلام کی سربلندی کے کارواں ہیں یہ۔

O..........O..........O

چوہدری ملا سے شیخ المکرّم تک کا سفر

عبدالودود شاہ

خواجہ نقشبند خاص خواجہ جب حضرت کا ذکر فرماتے تھے تو یہ شعر ارشاد فرماتے تھے :۔

دیوانہ شد کسے کہ رخ ما
کم گرد بگرد ماچو دیوانہ نئی

اس لئے حضرت مد ظلہ العالی کا ذکر خیر مجھے بھی دیوانہ بناتا ہے۔ لیکن دل پہ جبر کر کے ارشاد شیخ کے مطابق چند الٹے سیدھے خیالات اور پریشان افکار سپرد قلم کرتا ہوں ہو سکتا ہے کسی کا بھلا ہو جائے۔

گر بگویم شرح از حال مردان نیست بھر
ذکر ان بہتر کہ اندر کاے زھر

بیعت سے پہلے زندگی ایک اونٹ بے مہار کی سی تھی۔ کہ جہاں سے دل کو بھایا وہاں سے کھایا جہاں دل چاہا وہاں چر لیا۔ اور یہی زندگی کا خلاصہ ہے۔ بیعت سے پہلے کی زندگی کے لمحے لمحے سے اپنے حصے کی لذت لے چکا ہوں۔ ہر واقف اور پسندیدہ ذرے سے اپنے حصے کی رعنائیاں چوس چکا ہوں۔ زندگی کا یہ طویل عرصہ 18 سالوں پر محیط ہے۔ جس میں لذت پسندی و نفس پرستی کو اپنی استعداد و قوت کے مطابق انتہا پر پہنچایا تھا۔

لیکن اس دور کی ایک بات بتاتا چلوں اس طویل عرصہ میں چودھویں چاند رات کو ایک عجیب قسم کی بیقراری طاری ہوا کرتی تھی اس لئے چودھویں چاند رات کو کبھی سویا نہیں ہوں۔ چاند رات کو اس بے نام بے قراری کو دور کرنے کے لئے مناسب اقدامات بھی کرتا تھا۔ زندگی بظاہر خوش و خرم گزاری تھی جس میں بناوٹ ریا کاری اور تصنع کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جب کسی کام کو کرنا ہوتا تو کر ہی گزرتا۔ زندگی کا ہر کام پورے اخلاص۔ دیانت داری۔ صداقت اور مکمل مردانگی سے سرانجام دیا۔ دبنا جیسے سیکھا ہی نہیں۔ ہاں دبانے میں اور دوسروں کو اپنی ذہانت اور چکنی چپڑی باتوں سے رام کرنے میں انتہائی ماہر تھا۔ اور شاید ہوں لیکن اس دوران میری ہر قسم اور ہر قوم کے فلسفہ کی کتابوں تک رسائی ہو گئی جس کے مطالعہ سے مزاج کی قدرتی سخت گیری و تغیری و گرمی ہیجانی طبیعت اور دل کی بے قراری کو ظاہری سکون مل گیا۔ مگر اسکا ایک شعوری یا لاشعوری نقصان یہ بھی ہوا کہ مذہب سے دور ہوتا گیا۔ مذہبی عقیدہ اور اعمال کو فرسودہ نظریات خیال کرتا رہا۔ ثواب و عذاب کو ضعیف الاعتقادی سمجھتا رہا۔ ان فلاسفروں کو پڑھنے سے پہلے برے کام میں اگر کوئی جھجک محسوس کرتا تھا تو اب دین بلکہ دین دشمن فلسفیوں نے وہ جھجھک ہمیشہ کے لئے دور کر دی۔ اب مذہب کی فلسفیانہ تعلیمات احکامات اور

رسم ورواج اور حدود و قیود کی من پسند فلسفیانہ توجیح کرتا اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان خود ساختہ دلیلوں سے نا صرف خود بھی متاثر ہوتا اور دوسروں کو بھی متاثر کرتا بلکہ اگر کوئی ناجائز کام کرنا چاہتا تو فلسفہ کی ان کتابوں سے کوئی نہ کوئی جواز مل جاتا اور ہر شریف ناصح کو کچھ ان دلائل سے کچھ سماجی اور حکومتی حیثیت سے لاجواب کرتا۔

بہر حال زندگی اس ڈگر پر گزر رہی تھی جس میں نیک وبد کا تصور میرے اپنے مقررہ کردہ معیارات کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ ہر وہ کام نیک ہوتا جو میں کرنا چاہتا۔ اور جو کام میں بوجوہ نہیں کر سکتا تھا وہ برا ہوتا۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ بے شمار دلیلوں کے باوجود دل میں کبھی کبھار خصوصاً چاندنی رات کو ایک تکلیف دہ سی ہوک اٹھتی۔ اس ہوک میں اپنے اعمال بہت برے لگتے یہ اور بات ہے کہ یہ ہوک یا خیال اس قدر قوی نہ ہوتا کہ مجھے ان کاموں سے روک لیتا۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا یا میرے خون کی پاکیزگی تھی' میری طلب کا کھرا پن تھا۔ میرا اخلاص اور سچا پن تھا یا میری زندگی کے حالات کا نتیجہ تھا کہ صرف حضرت شیخ المکرم مدظلہ العالی کا نام سنتے ہی میں منارہ جانے کے لئے تیار ہوا کون لے گیا کیسے لے گیا یہ پھر کسی اور وقت پر بیان کروں گا۔ منارہ جانے کا فیصلہ ایک منٹ میں کیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ شیخ المکرم کا ذکر ویسے باتوں کے درمیان آیا تھا۔ دراصل وہ لوگ میرے پاس کچھ کام کے لئے آئے تھے بہر حال میں ان لوگوں کو ان کے ارادے کے بغیر ستمبر 1995ء کو اپنے ساتھ فوری خود ہی منارہ لے آیا۔ حضرت سے دفتر میں ملاقات ہوئی تو دل بہت خفا ہوا کیونکہ حضرت اس وقت حضرت نہیں نظر آتے تھے۔ بلکہ اس وقت میرے خیال میں یہ شخص پورا ملا چوہدری تھا اور ثابت بھی یہی ہوا۔ کیونکہ شیخ کی قیام گاہ ایسی نہ تھی جیسی صوفیوں کی ہوتی ہے چونکہ میرے خیال کے مطابق خانقاہ کو چند کچے اور غلیظ کمروں پر مشتمل ہونا چاہیے ہے جس کے ساتھ ہمیشہ ایک عالی شان مسجد

ہوتی ہے اس سادہ خانقاہ میں ایک ملا سبز لباس میں بیٹھا ہوتا ہے جو بے چارہ آدھا ننگا ہوتا ہے اور کپڑے ہمیشہ میلے رہتے ہیں اکثر چہرے کو چھپائے رکھتا ہے تاکہ یہ گناہ گار اس کو مزید داغ دار نہ کریں۔ جب کہ ملا چوہدری کا دفتر جدید سہولتوں سے آراستہ تھا۔ شیخ کا لباس بھی ماڈرن تھا۔ شیخ فون پر انگریزی رسالہ میں اسلام کے خلاف چھاپے گئے ایک مضمون پر کسی سے انگریزی میں Discuss کر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑے مگ میں کافی بھی پی رہا تھا۔ میں نے چودھری ملا کے دفتر میں ایک کمپیوٹر بھی دیکھا جبکہ دفتر میں داخل ہوتے وقت دفتر کے دروازے پر ایک گن مین بھی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ چوہدری ملا کے دفتر میں بعض نوادرات بھی دیکھے۔ بڑا عجیب سا لگا۔ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ خوامخواہ اس شخص سے ملنے کے لئے تم نے پانچ گھنٹے کا سفر کیا وقت اور تیل ضائع کیا اس آدمی کو خود پاس بلا لیتے۔ لیکن دل میں سوچا کہ چلو لگتا ہے کہ دین کی باتیں بطور فلسفہ ذکر ہوتی رہیں گی اس چودھری کو اپنے کسی مایوس حالات نے ملا بنایا ہے۔ بے چارہ شاید مرد میدان نہ تھا اور حالات سے بھاگ کر خانقاہ میں پناہ لی ہے اور ملا کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ تاکہ اس طرح زیادہ لوگوں کو بلا خوف و خطر اطمینان سے لوٹے۔ لیکن ہم سے اس نے کیا لینا ہے۔ اس کے ساتھ یارانہ بن جائے گا۔ وہ دبنگ سا آدمی ہے دوستی میں وفادار ثابت ہوگا سچا سا آدمی ہے اپنی لوٹ میں شاید ہمیں بھی مناسب حصہ دے گا۔ مگر ہمیں کیا خبر تھی۔ جس طرح خواجہ نقشبندیہ کا خلیفہ خاص بول اٹھا تھا۔

منکر نہ شوی بہ حالات زندلاں
ہر چہ ترا نیست کسی رانبود

بہر حال یہ میری چوہدری ملا سے پہلی ملاقات تھی۔ ان کی باتیں عجیب اور دار العرفان کا ماحول ڈراؤنا سا لگا۔ جہاں میرے اس وقت کے خیال میں دین کے سوا

سب کچھ مل سکتا تھا۔ مغرب کا وقت تھا۔ ستمبر 1995ء تھا۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا تھا مگر میں نے اپنی ظاہری آنکھوں سے صرف دار العرفان کی چار دیواری کے اندر سورج کی شعاعوں جیسی کرنیں دیکھیں جو شاید صاحب کشف لوگوں کے نزدیک انوارات ہوں گی مگر اتنا میں ضعیف الاعتقاد تو نہیں تھا۔ میرے نزدیک اس وقت یہ سورج کی شعاعیں تھیں جو کہیں سے چھن کر آتی ہوں گی۔ حالانکہ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا بہر حال بیعت کا برائے نام معمول ہوا۔ دستور العمل ایک چھوٹی سی کتاب ملی۔ جس میں ذکر و لطائف اور کچھ اور اوامر کا ذکر تھا جس کی بیعت کے بعد پابندی لازمی تھی بھلا اتنا چھوٹا سا کتابچہ اتنی وسیع کائنات میں بھرپور زندگی گزارنے کا احاطہ کسی طرح کر سکتا ہے۔ بس چوہدری ملا اگرچہ پیارا سا شخص تھا لیکن ذرا بے مروت نکلا۔ نہ آتے وقت۔ نہ جاتے وقت نہ بیٹھتے وقت چائے کا پوچھا۔ بڑا عجیب سا لگا۔ لیکن ہم نے سوچا چلو چوہدری ملا کی یہ بے مروتی ہم چند دعوتیں کھلا کھلا کر نکال لیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بات بہت اچھی لگی کہ میرے ساتھ گئے ایک صاحب مجاز کو فرش پر بٹھایا۔ اور ہمیں ایک تخت پہ بٹھایا اس اکرام سے اور فرق مراتب سے دل خوش ہوا۔ کہ چلو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملا چوہدری ہمیں وزن دار اور باوقعت شخصیت ماننے پر مجبور ہوگا۔

بہر حال نماز مغرب پڑھے بغیر منارہ سے نکلا اور 11/12 بجے رات کو گھر پہنچا تو دل میں خیال آیا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا ہے اور نہ یہ ہونے کا کام ہے اور ساتھ ہی دل میں خیال آیا کہ چوہدری ملا کو اس بارے میں ایک خط بھی لکھو کہ ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ بے چارا چوہدری ملا ہمارا انتظار کرتا ہوگا لیکن خط اس وجہ سے نہ لکھا کہ چودھری ملا کو دکھ ہوگا کہ اچھی بھلی مرغی ہاتھ سے نکل گئی۔ تو میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ اسکے دل کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے ملا چودھری کی ساری

باتیں طریقہ ذکر اور بیعت وغیرہ سب بھول گیا اور زندگی حسب معمول گزرنے لگی۔
اس ہفتہ مجھے دوستوں کی ایک خاص محفل و ماحول میں جانے کا اتفاق ہوا
خوبصورت رات تھی۔ حسب معمول گپ شپ جاری تھی کہ اتنے میں ماحول سحر
زدہ ہو گیا۔ ہر کسی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو
آگئے۔ ہر طرف سے اللہ ہو کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ہر کوئی اپنی مادی سماعت
سے سننے لگا یہاں تک کہ گلاس اور پلیٹ اور جگ بھی اللہ ہو کی آواز سے لرزنے لگے
میں ڈرا اور جلدی میں جا کر غسل کیا اور واپس آیا تو اب اللہ ہو کی گونج تیز ہو گئی اور
سارے جسم سے اللہ ہو کی آوازیں نکلنے لگیں۔ موقع پر موجود احباب مجھے عجیب
ڈراؤنے انداز میں دیکھنے لگے اور کہنے لگے شاہ جی تم سید آدمی ہو ہمیں مفت میں کیوں
ڈبو رہے ہیں تمہیں تو کوئی نکال لے گا۔ ہمارا کیا بنے گا۔ بہر حال جسم پہ ایک لرزہ
طاری ہونے لگا۔ عجیب نا قابل بیان سا خوف محسوس ہوا اور ساتھ ہی ایک غیبی آواز
سب کی موجودگی میں سننے لگا اب شیخ المکرم مدظلہ العالی کے سوا کوئی چھڑانے والا
نہیں۔ رات کے دو بجے تک اس ساری محفل نے نا قابل بیان صورت حال کو
برداشت کیا ہر لحہ میری پریشانی میں اضافہ ہو تا رہا۔ اور میں بے انتہا خوف محسوس
کرنے لگا اس لئے بے اختیار ہو کر کار لے کر سید حا منارہ آیا۔
منارہ میں آنا بہت ہی قابل نفرت لگا۔ ہم صبح 8/9 بجے پہنچے تو ملا چودھری اپنی
ڈبل کیبن میں گھر ناشتہ کے لئے جا رہے تھے۔ ان سے گاڑی میں علیک سلیک ہوئی
بہت برا لگا کہ عجیب چودھری ملا ہے ہمیں کچھ سمجھتا ہی نہیں کہ جیسے ہمیں ناشتہ کی
ضرورت نہیں۔ اور چودھری ملا مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔ اتنے میں دیکھا کہ
چند داڑھیوں والے نوعمر و بوڑھے دنیاوما فیہا اور خاص کر ہمارے جیسی عظیم شخصیت
و ہستی سے لاپرواہ ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور جب چوہدری ملا ہمارے پاس رکا

تھا۔ تو مجھے بڑے رشک آمیز انداز سے دیکھ رہے تھے بہر حال ہمیں بے انتہا غصہ آیا
کہ ہم اتنی دور سے آئے ہیں اور یہ چوہدری ملا ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتا اپنے آپ کو
اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ ہماری پیشوائی کے لئے گاڑی سے بھی نہ اترا۔ جس کا ہمیں بے انتہا
صدمہ ہوا۔ میں نے بے بسوں اور لاچاروں کی طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کیا اور اس ملک
میں ہم نے اس سے پہلے کسی بڑے آدمی کا بھی دو تین منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کیا
تھا اس کے علاوہ ہمارے استقبال کے لئے نہ نوکر آیا نہ کسی نے دروازہ کھولا نہ بیٹھنے کے
لئے صوفہ تھا اور نہ کوئی A-C والی انتظار گاہ۔ اور ان داڑھی والوں پر سخت غصہ آیا کہ
تم نے ہمارے لئے گاڑی کا دروازہ نہ کھولا۔ اور ہمارا استقبال نہیں کیا۔ کہ جیسے ان کی
تو یہ ذمہ داری تھی کہ میرے جیسی عظیم شخصیت کا استقبال کریں۔ بہر حال ان جان
لیوا حالات سے گزرتے بلا ملاقات واپسی کا فیصلہ کیا۔ مگر ایک نادیدہ قوت کے ہاتھوں
بلا سبب ظاہری کے رک گیا۔ بہر حال یہ ناقابل بیان سختیاں جھیل کر جب چوہدری
ملا اپنے دفتر میں ایک شان سے آیا تو ہمیں بھی بلا یا گیا۔

دفتر کے اندر داخل ہوتے ہی ساری خانی ونوابی کافور ہو گئی۔ اور وہی رات
والا سحر زدہ ماحول Replay ہو گیا جس سے ذکر میں منارہ آیا تھا لیکن اس وقت میں
ڈر نہیں رہا تھا بلکہ اس وقت رقت طاری تھی چوہدری ملا کو رات والا واقعہ سنایا تو
گھورنے کے انداز میں جواب دیا کہ ہاں شاہ جی اس طرح تو ہوتا ہے ذکر کے ماحول
کے بغیر تو ایسا ہوتا رہے گا۔ اور جب چوہدری ملا نے ذکر کے بارے میں پوچھا تو ہم
نے بے دھڑک شاہانہ وگستاخانہ انداز میں جواب دیا کہ یہ ناگوار عجیب سا کام ہم سے
نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی آسان سا نسخہ یا طریقہ یاد ہے تو بتا دو۔ چوہدری ملا نے میرے
اس شاہانہ جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے نظریں مجھ پر گاڑتے ہوئے کہا کہ شاہ جی
متذکرہ معمول چند منٹ کے لئے کر لیا کرو۔ سویرے نہیں اٹھ سکتے تو نماز قضا پڑھ

کر چند منٹ کے لئے معمول کر لیا کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو گا اور نظریں دوبارہ گاڑھ کر کہا کہ چند منٹ معمول کر لیا کرو۔ اگر فرق نہ پڑا تو میں ذکر چھوڑ دوں گا اور آپ کا دوست بن کر آپ والے کام شروع کر دوں گا۔ اس وقت دل میں خیال آیا کہ اب ملا چودھری ہم سے Impress ہو گیا ہے اور ہماری لائن پر آگیا ہے اس خیال کے آتے ہی تیسری بار نظریں گاڑ دیں۔ جس پر لرزہ طاری ہو گیا اور عجیب ناقابل بیان سا خیال آیا اس خیال کے آتے ہی بے اختیار زندگی میں پہلی بار کسی دوسرے شخص کی موجودگی میں رو پڑا بہر حال چوہدری ملا میرے رونے سے لاپرواہ تھے نہ ہمیں منایا۔ نہ تسلی دی بلکہ اپنی کرسی سے اٹھنے لگے جس پر مزید غصہ آیا اور فرمایا کہ شاہ جی فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔ اب تم صحیح عمر صحیح جگہ میں مضبوط ترین طاقتور ترین ہاتھوں میں آئے ہو اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ کبھی کبھار خط لکھا کرو۔ اس سے توجہ ملتی رہتی ہے الفاظ یہ تھے یا کچھ اور لیکن مفہوم بالکل یہ تھا بس مجھے یہ باتیں روایتی پیروں والی لگیں۔

اور میں نے دل میں آپ کو دوسری بار چودھری ملا کا خطاب دیا اور میں نے جب اجازت چاہی تو فوری اجازت دے دی نہ اپنی کرسی سے اٹھے اور نہ ہماری رخصتی کے لئے دفتر سے باہر آئے اس نے دفتر میں نہ چائے کا پوچھا اور نہ پانی کا بے انتہا غصہ آیا۔ کہ عجیب آدمی ہے شکل صورت وجسامت اور رنگ ڈھنگ سے اچھا خاصہ چوہدری لگتا ہے مگر ملائیت نے کنجوس بنا دیا ہے۔ مگر ساتھ دل مین خیال آیا کہ ملائیت اس کے پاس سے بھی نہیں گزری۔ کیونکہ ہمارے ہاں غریب لاچار اور بے نوا شخص کو ملا کہتے ہیں جوان پڑھ اور غریب ہو اور ہمارے شایان شان استقبال اس کی مجبوری ہو۔ بہر حال چودھری ملا نے مہمان نوازی اور عالی شان لوگوں کا اکرام سیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن میرے دفتر سے نکلنے پر چودھری ملا نے ایک فائر کر دیا کہ جا کے لنگر

میں چائے پی لو یہ بات گولی کی طرح لگی کہ اب ہم پر اتنا برا وقت آگیا ہے کہ ہم لنگر والی چائے پئیں گے۔ اس لئے میں غصے میں بغیر ناشتہ کئے منارہ سے نکلا اور راستے میں ڈرائیور نے آداب مہمان نوازی کا ذکر کر کے مزید دماغ خراب کر دیا جو ہمیشہ اچھی بھلی مہمان نوازی کا عادی تھا 4/5 گھنٹہ کے سفر کے بعد شام کو گھر پہنچا اور زندگی کی پہلی شام گھر پر گزار دی رات کو عجیب سا احساس تھا جس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب میرے دل کی گہرائیوں سے آوازیں آنے لگیں کہ یہ شخص چودھری ملا نہیں۔ شیخ المکرم ہے یہ تمہارا اکرام کیوں کرے تیرے اکرام کرنے والے کیا اور تھوڑے ہیں۔ تیرے اندر انسانوں والی بات کونسی ہے۔ اس قسم کی بے شمار باتیں ہوئیں۔ جس میں شیخ المکرم کی باقاعدہ جسمانی موجودگی محسوس کرتا رہا۔ ٹھیک 4 بجے اٹھ گیا اور بے اختیار رونا آیا بس رونا اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ آواز سنی کہ یہ شخص چودھری ملا نہیں شیخ المکرم ہے۔ اس کو اللہ نے تیرے لئے اور صرف تیرے لئے پیدا اور مختص کیا ہے اور ایک دفعہ تمہیں شیخ کی شکل میں بھی دکھایا تھا جو تم بھول رہے ہو۔ ذہن پر زور دے کر یاد کر لو اور تم "ہم" نہیں ہو۔ بلکہ تم صرف تم ہو۔ اور حضرت کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہم تمہاری انانیت کو سلب کر رہے ہیں سب دل سے غبار چھٹ گیا رونا ختم ہوا۔

اب ہر چند ایک واضح مگر بدلی ہوئی نظروں سے چیزوں کو دیکھنے لگا اور جب اس وقت میں نے طریقہ ذکر کی سختی اور دیگر شرائط و ضوابط کی سختی بیان کی تو ایک غیبی آواز نے تسلی دی اور سمجھایا۔ کہ جب فوج میں بھرتی ہو چکے ہو تو لازمی سروس کے وہ تمام قوانین اپنانے ہوں گے جو ایک فوجی بھرتی ہونے کے بعد خواستہ یا بادل ناخواستہ اپناتا ہے اور اتنے میں ایک آواز مزید گھمبیر ہو گئی کہ شاہ جی یہ قوانین و ضوابط اپنی مرضی و خوشی سے اپنا لو ورنہ اس سلسلہ میں تم پر جبر اور زبردستی بھی کی جائے

گی۔ اس سے پہلے اس قسم کی گستاخی کا عادی نہ تھا مگر پہلی دفعہ اس آواز سے ڈرنے لگا
کہ واقعی زبردستی کی جائیگی اور تمہارے خلاف قوت و جبر استعمال کیا جائے گا۔ اور ان
تمام ہدایات و قوانین کی پابندی کرائی جائے گی۔

ان نادیدہ قوتوں اور آوازوں سے مجبور ہو کر فوری نماز پڑھی چند منٹ ذکر کیا
جو سارا رونے میں گزر گیا اب یہ حالت ہو گئی کہ چند منٹ کی فراغت ہو جاتی تو میں
کسی ان دیکھی قوت کے زیر اثر اس میں ذکر کرتا رہتا بہر حال یہ ایک طویل قصہ ہے
جس کو اودھر ہی چھوڑ رہا ہوں۔ تیسری ملاقات ماہ ستمبر کے آخری دنوں یا اکتوبر کے
پہلے ہفتے میں ہوئی۔ اب دل سے سارے شکوک نکل چکے تھے اب حضرت جی کے
پیارے چہرے پہ نظریں ڈال کر حضرت جی کی موجودگی میں روتا رہتا اور ایک دن
اپنی نالائقی اور بے کاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہہ اٹھا کہ حضرت میں نالائق ہوں
یہ کام مجھ سے شرائط کے ساتھ نہیں ہو سکتا اور شیطان مجھے وسوسے دلا رہا ہے کہ یہ
کس مصیبت میں پڑے ہو کوئی آواز سانپ کی طرح پھنکارتی رہتی ہے۔ یہ چیزیں
چھوڑ دو۔ حضور میں کمزور آدمی ہوں مجھے تھام کر رکھیں۔ تو حضرت نے واضح طور پر
بتایا۔ الفاظ تقریباً یہی تھے کہ شاہ جی فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ ہمیشہ ہمارا ساتھ رہے
گا۔ اب تم واقعی صحیح جگہ آگئے ہو۔ اب ہم تم کو نہ چھوڑیں گے اور نہ بھاگنے دیں گے
باقی شیطان کے ساتھ اپنا فیصلہ خود کر لو میں اس میں کیسے آسکتا ہوں۔ ہر آدمی اپنی
ذات کا خود مکلف ہے۔ بس یہ حضرت سے تبدیلی کے بعد پہلی ملاقات تھی چونکہ
زندگی میں ہر کام نہایت اخلاص، جرأت مضبوط دل اور مردانگی سے کیا ہے آدھے
دل کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا ہے۔ آدھی دوستی آدھی دشمنی کا قائل نہیں ہوں اور ہر
کام بھرپور طریقے سے انجام دیا ہے۔ اب اللہ کا کرم اور شیخ کی توجہ اور بے انتہا
شفقت کا کمال تھا کہ ذکر و مراقبہ میں مقدور بھر وقت لگاتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ

شیطان کے بہکاوے جاری تھے شیطان سے خوب بحث مباحثے ہوتے رہے اور مباحثوں میں اکثر شیطان سے گالیاں کھاتا رہتا ایک بار جب ایک مباحثہ میں شیطان جو کہ دلائل عقلیہ سے اچھی طرح لیس تھا بڑھ چڑھ کر پوری قوت سے حملہ آور ہو رہا تھا تو تبدیل زندگی میں پہلی بار شیخ المکرم مد ظلہ العالی کی روحانیت کی طرف متوجہ ہوا۔ اور امداد کا ملتجی ہوا۔ تو شیخ کی عظیم توجہ بے مثال شفقت اور روحانی قوت کام آئی اور شیطان سے فیصلہ ہوا کہ آئندہ کے لئے یہ تین چیزیں طریقہ ذکر، سلسلہ عالیہ اور عظمت شیخ یہ تینوں عنوانات Not-negotiable ہیں۔ شیطان شریف آدمی تھا۔ حضرت کی توجہ سے لاچار ہو کر agree کر گیا شیخ کی توجہ سے ملتجی ہوں کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح شیطانی لغزشوں سے بچائے رکھیں۔ یہ میرے سفر کا وہ قصہ تھا جو میں نے چودھری ملا سے لے کر شیخ المکرم مد ظلہ العالی تک طے کیا ہے اب تو دل ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ حضرت شیخ المکرم کے قدموں میں سب کچھ لٹا دیا جائے جہاں سے نفرت اور گھن آتی تھی وہاں مر مٹنے کو دل چاہتا ہے وہی نقشبندیہ کے خلیفہ کا شعر آخر میں کام آیا

گر بگویم شرح و صفتش ہر دوام

بگزر و عمہ و نگر دو این تمام

اور اغیار کے بارے میں وہی تو ہے

منگر سوی بد حالت زند دلان

یا ہر چہ ترا نیست کسی .رانبود

سنا ہے کہ ہر شیخ سلسلہ کی مراد ہوتی ہے کاش میں بھی شیخ کی مراد ہوتا کاش، کاش۔

O..........O..........O

بحیثیت شیخ المکرّم مد ظلہ العالی

عبدالودود شاہ

حضرت مد ظلہ العالی کی یہ حیثیت یا تو اکا۔ ین سلسلہ جانتے ہوں گے یا سلوک کے اسرار و رموز سے واقف حضرات کو علم ہو گا۔ مجھے تو بس یہی علم ہے کہ تابعین کے بعد حضرت مد ظلہ العالی جتنے عظیم درجے کا صوفی نہیں گزرا ہے۔ جو ایک طرف عالم تکوین میں امام الصدیقین کے منصب پر فائز ہیں تو دوسری طرف سلوک میں حجابات الوہیت کے کسی حجاب میں سیر فرما رہے ہیں۔ مجھے یہ علم تو نہیں کہ حضرت حجابات الوہیت میں کونسے حجاب میں ہیں مگر اتنا علم ہے کہ تابعین کے بعد آج تک حجابات الوہیت میں اس مقام پر کوئی بھی صوفی نہیں پہنچا ہے بلکہ حضرت مد ظلہ العالی نے 3/4 سال پہلے فرمایا تھا کہ میں اس وقت سلوک کے ایک ایسے مقام پر ہوں جس کا پہلے کسی صوفی نے ذکر نہیں کیا ہے اور نہ اس مقام پر کوئی اور صوفی نظر آتا ہے جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ اس مقام پر جانے کے وقت حضرت جسمانی طور پر انتہائی

حدت محسوس فرماتے تھے اور اس حدت کو کم کرنے کے لئے گیلا تولیہ استعمال کئے جاتے تھے۔ اور یہ راز اس وقت کھلا جب ایسی حدت والی صورت حال حاضرین کی موجودگی میں پیدا ہوئی تو حاضرین میں کسی نے اس کو جسمانی مرض سمجھ کر ڈاکٹر بلانے کا مشورہ دیا تو حضرت مدظلہ نے انکار فرمایا اور یہ فرمایا کہ جسم کی حدت و گرمی کسی جسمانی نقص یا بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ جسمانی حدت سلوک کے ایک خاص مقام پر جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے تصوف اور سلوک کے مقامات کے بارے میں اتنے واضح وسیع اور جامع ارشادات کسی بھی صوفی نے بیان نہیں کئے ہیں۔ ہاں اگر کسی کو میرے اس مشاہدہ یا ذاتی تجزیئے کے بارے میں شک ہو تو بازار میں سلوک کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں کسی بھی ایک کتاب یا ان ساری کتابوں کے مجموعوں میں سے سلوک کے بارے میں حضرت کی ایک تقریر یا تحریر کے مقابلے میں مواد پیش کیا جائے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ تاریخ تصوف میں پہلی بار سلوک کے بارے میں اتنی ہمہ گیر معلومات اور خاص کر مقامات کے بارے میں پہلی بار دی گئی ہیں۔ اب یہ ثابت ہے کہ حضرت مدظلہ العالی کے اتنے بڑے مقامات ہیں تو لازماً آپ مدظلہ العالی کی محبت کے اثرات بھی اس قدر قوی ہوں گے جس کا تعلق تجربہ سے ہے مگر شرط صرف یہ ہے کہ طالب میں خاص طلب ہو کھری عقیدت ہو شیخ کا ادب واطاعت تہہ دل سے کرتا ہو صحبت شیخ شرائط کے ساتھ ہو۔ خالی خانہ پری نہ ہو۔ پھر ہر کسی کو اندازہ ہو جائے گا کہ صحبت شیخ در حقیقت کیا ہے؟ اس کی مکمل حقیقت بیان ہی نہیں کی جاسکتی ہے اس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آپ کسی نامرد شخص کو نکاح کے بعد کی صورت حال کیسے سمجھا سکتے ہیں۔ اللہ ہمیں شیخ کی توجہ سے دنیاوی اور سلوک دونوں میں نامردی سے بچائے۔ اگر صحبت شیخ شرائط

کے ساتھ نصیب ہو تو روحانی طور پر تو چھوڑیئے۔ جسمانی طور پر بھی صحبت کے اثرات کو محسوس کیا جا سکتا ہے گو جس سے ہم مکمل طور پر مستفید نہیں ہوتے ہیں۔

لیکن یہ ہماری اپنی بد قسمتی اور نالائقی ہے جس کا بنیادی سبب ہماری ناقص طلب، لولی لنگڑی عقیدت اور ریاکاری والا ادب و اطاعت ہے۔ جو توجہ شیخ کے سمندر سے خود ہی اپنے اپنے حصے کے دریاؤں کے دھانوں میں بند باندھ کر اپنے لئے فیوضات کا سر چشمہ ہی بند کرتے ہیں اب اگر شیخ بھی چاہے تو فیض نہیں دے سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت حال میں تو انبیاء علیہ السلام فیض نہیں دے سکتے ہیں تو پھر شیخ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم انانیت چھوڑ کر اخلاص کے ساتھ طلب لے کر شیخ کے ساتھ سچی عقیدت، کھری طلب غیر مشروط ادب و اطاعت کریں تو شیخ چاہے یا نہ چاہے فیض ملتا رہے گا ورنہ نہیں ملے گا۔ خواہ شیخ کا اپنا بیٹا کیوں نہ ہو مگر ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم صرف دکھاوے کے لئے ظاہری طور پر شیخ سے تعلق کا دعویٰ کرتے ہیں اور زور و شور سے اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے ہیں اور حضرت شیخ کے سامنے چکنی چپڑی باتوں سے حصول فیض شیخ کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ بہ باطن ہم شیخ کو اپنا بڑا یا برابر تو چھوڑیئے۔ استادی میں اپنے ہی شیخ کو اپنے شاگرد کے برابر سمجھتے ہیں اب ایسی گھناؤنی صورت حال میں حصول فیض کا دعویٰ اپنے کو دھوکہ دینا ہے اور چونکہ شیخ اپنی عظمت اور ہماری عدم طلب سے واقف ہوتا ہے اس بنا پر خاموش رہتا ہے۔ لیکن ہم اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ اگر میں غلط ہوں تو شیخ ہی مجھے کہے کہ تمہیں فیض نہیں مل رہا ہے۔ تو تب میں اپنے رویے اور خیالات پر نظر ثانی کروں گا۔ بھئی شیخ کو کیا پڑی ہے؟ کہ شیخ خوامخواہ وہ چیز آپ کو دینا چاہے جس کے لینے سے نہ صرف آپ انکار کرتے ہیں بلکہ خلوص قلب سے اس طلب کی تردید بھی کرتے ہیں۔ شیخ کی اہمیت اپنی جگہ مگر شرائط متذکرہ

نہ ہوں تو نبی ﷺ کی محبت کام نہیں آسکتی ہے۔ چہ جائیکہ شیخ۔ مگر اس سے مراد یہ نہ لیا جائے کہ میں شرائط کے ساتھ سلوک سیکھ رہا ہوں۔ تو اب اسکے ساتھ ہی ساتھ مزاج شیخ کو بھی مکرر کر تا رہوں اور مجھے فیض ملتا رہے گا۔ یہ بھی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ ایسی صورت میں بھی فیض کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ اس لئے فیض شیخ سے سیراب ہونے کے لئے مندرجہ بالا شرائط کے علاوہ مزاج شیخ کا خصوصی خیال رکھنا چاہئے۔ جہاں تک میں حضرت کی صحبت سے حضرت کی تعلیمات کو سمجھ سکا ہوں اسکا خلاصہ میں اپنے لئے اور دیگر سالکین کے لئے درج کر رہا ہوں شاید کہ مجھ جیسے بھولے بھٹکے کو راستہ ملے۔



سلسلہ اویسیہ کی عظمت

جہاں تک صوفیائے عظام میں طرز تربیت میں اختلافات کا تعلق ہے۔ صوفیاء عظام اپنی اپنی تعلیمات و برکات، کچھ طرز تربیت اور کچھ زمانے، علاقوں اور مختلف قومی مزاجوں کی وجہ سے چار سلاسل یعنی چار گروپوں میں بٹ کر مشہور ہوئے۔ ورنہ دراصل تصوف کے سلاسل بے شمار ہیں۔ جن میں تمام کی سند شجرہ حدیث کی سند کی مانند مسلم اور مصدقہ ہے۔ ان صوفیاء عظام نے نہ صرف کردار سازی میں اہم کردار ادا کیا بلکہ انہوں نے تعلیمات نبوتؐ اور برکات نبوتؐ کی مدد سے عقائد اعمال اور اخلاص کی مکمل تصحیح کی اور اپنے قول و فعل ہی سے تعلیمات نبوتؐ اور برکات کو محفوظ رکھا۔ تمام صوفیاء کی تربیت کا نصاب تعلیمات نبوتؐ اور برکات نبوتؐ پر مشتمل ہے۔ تعلیمات اور برکات نبوتؐ سے افراد کی اس طرح تربیت کی۔ کہ وہ ایک ماڈل مسلمان بن گئے۔ اگرچہ صوفیاء عظام میں طریقہ تربیت کے بارے میں بوجوہ فطری استعداد کچھ اختلافات ہیں۔ لیکن مقصود کی یگانگت اور ہمہ گیریت کی وجہ سے تربیت کے طریقوں کے ان اختلافات کے باوجود ان سے فیض کے حصول میں کوئی

رکاوٹ یا کوئی حجاب نہیں۔ اگرچہ تصوف میں طالب کی مخصوص استعداد اور شیخ کے مخصوص رجحان کے لحاظ سے بے شمار تربیت کے طریقے رائج ہیں اسلئے تربیت کے ان طریقوں کو آسانی کے لئے دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے پہلے طبقے کے نزدیک "جلب اخلاق حمیدہ" اور "سلب اخلاق ذمیمہ" کے بعد سالک کو آگے چلایا جائے اور انس الٰہی کے بڑھنے کے لئے تھوڑا سا ذکر بھی کرایا جائے۔ اسی طرز تربیت کو سلوک کہتے ہیں۔ دوسرے طبقے کے نزدیک یہ طریقہ ضروری نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے ذکر الٰہی پر لگایا جاتا ہے۔ تاکہ ذکر کی برکت سے اخلاق' عقائد' معاملات اور عبادات کی اصلاح خود بخود ہو جائے اور اتباع شریعت مزاج انسان بن جائے۔ اسی کو طریقہ جذب کہتے ہیں دور تابعینؓ سے لے کر اب تک امت مسلمہ کی تربیت و کردار سازی کا یہی طریقہ جاری و ساری ہے۔ اور تاریخ تصوف میں طریقہ جذب سے تربیت کا عام انداز بہت کم اپنایا گیا ہے۔ طریقہ جذب کے ذریعے سے تصوف میں تربیت کا بہت سرسری ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ جس کو اصطلاح میں نسبت اویسیت کہتے ہیں تاریخ اویسیت کا مطالعہ ثابت کرتا ہے۔

کہ نسبت اویسیہ کو اس وقت ترقی دی جاتی ہے جب عام معاشرہ میں کفر و طاغوتی قوتیں زور پکڑتی ہیں۔ سرکشی اور تمرد سکہ رائج الوقت بن جاتا ہے۔ معاشرے میں بد اخلاقی اور بد کرداری عام ہو جاتی ہے۔ جس سے عام مذہبی ماحول بھی کثافت زدہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کثافت زدہ ماحول سے مسلمانوں کے قلوب بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام شرعی اعمال کی انجام دہی مشکل ہو جاتی ہے اور سرزد اعمال کے ثمرات پر بھی گرد پڑ جاتی ہے مذہبی عقائد اور اعمال کا سر عام مذاق اڑایا جاتا ہے اور معاشرہ کی یہ مروجہ اقدار دینی افراد کی ہر وقت تذلیل کرتی ہیں۔ بد کرداروں کو شاباش دی جاتی ہے اور نیک لوگوں کو بد کردار اور

بد تہذیب کہہ کہ کر ان کی تذلیل کی جاتی ہے اور پریس کا ایک خاص دانشور مذہبی طبقہ اسلام ہی کے خلاف اسلام ہی کے نام پر مسلمان ہی کی زبان سے زہر اگلتا ہے۔ جس پر پشیمانی اور ندامت کی جگہ فخر کیا جاتا ہے۔ تعلیمات نبوتؐ کو کسی فلاسفر کے خیالات سے ماٰخذ شدہ اور دینی رویہ اور اعمال کو بنیاد پرستی کہہ کہ دین اللہ کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہمارے اس دور میں ہمارے اسلامی معاشرہ اور ملک میں جہاں گناہ پر فخر 'اسلام کے اعمال پر شرم اور طنز 'مسلمان عقیدہ کو پسماندہ اور ترقی کے مخالف اور عمل و کردار کے مسلمان کو بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔ جہاں گناہ کی ترغیب کے بے شمار تشہیری ذرائع سے تبلیغ عام کا سلسلہ جاری ہے۔ نیکی کی راہ میں ہر کس و ناکس بے شمار رکاوٹیں پیدا کرتا ہے اسلام اور اسلام کے نظریہ حیات کے بارے میں ہر کوئی ناگفتہ بہ باتیں سر عام کرتا ہے۔ ترغیب گناہ کی تبلیغ پریس اور الیکٹرانکس میڈیا پر باقاعدہ ہوتی ہے۔ ہر کوئی مجتہد 'مفسر 'محدث 'فقیہہ اور مبلغ بنتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور عمل میں رکاوٹوں کے پہاڑ اپنے ہی مسلمان کھڑے کرتے ہیں اور یہ سب کچھ چوری چھپے نہیں کسی لاعلمی اور بے خبری کی بنیاد پر نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر علی الاعلان کیا جاتا ہے۔

تو ایسے حالات میں رحمت حق کو وہی جوش آتا ہے جو انبیا کے مبعوث ہونے کے وقت آتا تھا۔ چونکہ اب نبوتؐ کا دروازہ تا قیامت بند ہے تو پھر اللہ کا یہ دستور ہے کہ اپنی معرفت کے حصول کے طریقہ کار کو مروجہ طریقوں میں ایک مزید قوت کا اضافہ فرما کر اس کے حصول کو عام اور آسان کرتا ہے اور اس کے اثرات و ثمرات کو بھی عام کرتا ہے۔ اس لئے اللہ کریم سلاسل تصوف میں اپنی معرفت کے حصول کے جاری طریقہ کار کو اویسیت ہی کے ذریعے مزید قوت اور طاقت دیتا ہے۔ تاکہ مروجہ اعمال اللہ پر عمل آسان ہو اور اس کے ثمرات جلدی مرتب ہو جائیں اور محسوس ہوں اسلئے ہمارے سلسلہ یا اویسیت کو باقی تمام سلاسل پر دو وجوہ کی بناء پر

فوقیت حاصل ہے۔

1۔ ہمارے طرزِ تربیت کی بنیاد اویسیت پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ روح سے روح کو فیض نصیب ہوتا ہے اور روحوں میں یہ قوت موجود ہے کہ آپس میں فیض لیں اور دیں۔ اور روح سے روح کو فیض صرف ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کا طرہ امتیاز ہے۔ باقی سلاسل میں عمریں لگا کر اور مجاہدات جھیل کر اگر کوئی سالک المجذوبی سے آگے بڑھنے کی استعداد رکھتا ہو تو ان کو نسبت اویسیہ نصیب ہونے کے بعد آگے ترقی ملتی ہے۔

۲۔ ہمارے سلسلے کی عظمت کا دوسرا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم برکات نبوتؐ کو براہ راست حضرت محمدؐ کے سینۂ اطہر مبارک سے صرف ایک واسطہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ذریعے سے لیتے ہیں۔ جو کائنات میں انبیاء کے بعد افضل ترین شخصیت ہیں۔ اور آپؓ انسانوں میں واحد غیر نبی ہیں جن کو معیت ذاتی بغیر کسی شرط کے نصیب ہے اور آپ ﷺ کے وارد برزخ ہونے کے بعد آپؐ کے ظاہری اور باطنی تمام کمالات و برکات نبوتؐ کے وارث بن گئے۔ بہر حال باقی سلاسل میں حصول فیض اور توجہ شیخ کے لئے شیخ کی خدمت میں جانا پڑتا ہے۔ اور اتحاد عالم کا ہونا فیض از شیخ کی شرائط میں سے ہے جبکہ ہمارے سلسلہ میں ایسا نہیں' ایک دفعہ جب شیخ المکرم آپ کا رابطہ روح سے قائم کرا دیں تو مشائخ سلسلہ سے از خود بغیر اتحاد عالم کے فیض کا نزول و حصول شروع ہوتا ہے۔ چونکہ مشائخ سلسلہ کو فیض درمیان میں صرف بارہ واسطوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فیض زیادہ اور طاقتور ہوتا ہے اور یہیں سے سالکین کو فیض ملتا ہے۔

O..........O..........O

حضرت مدظلہ العالی کی تربیت کا طریقہ

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان روح و جسم کا مرکب ہے اور فانی نہیں ہو گا ہاں اس کے فنا کی صورتیں بدلتی ہوں گی۔ انسان کی رہنمائی ذہن و عقل سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ انسانیت کی رہنمائی صرف انبیاء علیہ السلام کر سکتے ہیں۔ جو اس مقصد خصوصی کے لئے بنائے گئے تھے۔ آپؐ سے پہلے کے انبیاء علیہ السلام مخصوص وقت قوموں اور علاقوں میں مبعوث فرمائے گئے اور پیغمبروں کی دعوت میں ہمیشہ تسلسل رہا یعنی عقائد میں سب متفق تھے۔ احکام' عبادات وغیرہ کے طریقوں میں ضرور فرق ہے۔ سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو بھیجا جن کو اور خطابات کے علاوہ رحمت اللعالمین کا خطاب دیا گیا۔ آپؐ کی عمومی رحمت سے تمام کائنات اور اس میں موجود مخلوق اور رحمت خاصہ سے مسلمان اپنی اپنی استعداد و عقائد کے مطابق فیض یاب ہوتے ہیں بہر حال آخری نبیؐ کی دعوت کے دو حصے ہیں جن میں ایک تعلیمات اور دوسرے کو برکات کہتے ہیں۔ جس طرح تعلیمات کو حفاظت الٰہی نصیب ہے یعنی قرآن و حدیث کے الفاظ اور معنی محفوظ ہیں۔ بقیہ برکات بھی اسی

طرح محفوظ ہیں۔ ورنہ ختم نبوتؐ کا تصور باطل ہوگا اور حفاظت الہیہ کا عقیدہ بھی خطرہ میں پڑ جائیگا۔ نبوتؐ کے دونوں پہلوؤں سے استفادہ کرنے کے لئے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ضروری ہے اور بالقلب کی تصدیق صرف برکات نبوتؐ سے ہو سکتی ہے جو یا تو نبی کی صحبت سے یا ان برکات کے حامل افراد سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے شیخ کامل کے لئے محض عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اتباع شریعت پر عامل' برکات کا حامل اور برکات کو تقسیم کرنے والا ہو اور برکات کے اس حصول یا فیض کے حصول کے لئے کوئی اضافی شرط یا مجاہدات وغیرہ نہیں ہیں بلکہ جو آدمی شرائط فیض یعنی طلب' عقیدت' ادب اور اطاعت سے مزین ہو تو ان برکات کو بعد از تصحیح عقائد' اتباع شریعت میں تصحیح اعمال اور تصحیح اخلاص کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے۔ سلاسل کا بنیادی کام ہی تعلق بالرسول اور تعلق باللہ کے قیام کے لئے توفیق عمل کی قوت دینی ہوتی ہے۔ اور سلاسل توفیق عمل کی قوت کو ذکر و اذکار' مراقبات اور مجاہدات سے قوی کرتے ہیں۔ انسانی مزاج' واقعات' حالات اور ماحول کے مطابق ان اذکار' مراقبات' مجاہدات کی نوعیت اور صورتیں بدلتی رہتی ہیں مگر مقصد اور ذرائع ہمیشہ ایک رہے ہیں۔

یہی ذرائع یعنی ذکر و اذکار مراقبات اور مجاہدات ہمارے سلسلے میں بھی اپنائے گئے ہیں لیکن ہمارا زیادہ زور ذکر پر ہوتا ہے تاکہ اس کے ذریعے روح قوت حاصل کرے اور مقامات سلوک طے کرے اور ان مقامات پر روح کے جانے سے جسم کے لئے توفیق عمل کی قوت زیادہ ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ذکر کا تعلق ہے۔ ہر امر کی پابندی اور ہر نہی سے بچنا ذکر شرعی کہلاتا ہے لیکن اسکے علاوہ بھی ذکر اسم ذات کا حکم اور پھر کثرت سے ذکر کرنے کا حکم پایا جاتا ہے۔ تو مشاہیر صوفیا لسانی ذکر سے ذکر کا ماحول پیدا کرنے کے لئے قلبی ذکر کی طرف گئے۔ جب کہ ہمارے مشائخ اسم ذات

کی کثرت کے حکم کی پابندی براہ راست ذکر قلبی سے کرتے ہیں جو کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ واحد شرط یہ ہے کہ ذکر میں ایسا طریقہ نہ اپنایا جائے کہ جو خلاف شریعت ہو۔ جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جسم انسانی میں چند اعضائے رئیسہ ہیں جس سے بدن کی صحت اور خود بدن قائم ہے بالکل اسی طرح روح کے بھی چند اعضائے رئیسہ ہیں جس پر روح کی صحت وبقاء کا دارومدار ہے۔ جس طرح جسم کی مادی غذا ہے اسی طرح روح کی غذا ذکر اللہ ہے روح کے ان اعضاء رئیسہ کو اصطلاح تصوف میں لطائف کہا جاتا ہے۔ اگرچہ روح میں ان اعضائے رئیسہ کے مقام کے تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ان کے وجود کا کوئی انکاری نہیں ہے جہاں تک لطائف کی جسم میں جگہ کے اختلافات کا تعلق ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اگر کوئی معدہ کو سینہ میں پھیپھڑوں کو پیٹ میں، دل کو پاؤں اور دماغ کو ہاتھوں میں بھی قرار دے۔ تو جگہ کی اس تبدیلی سے صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بشرطیکہ یہ اعضائے رئیسہ صحیح طور پر اپنا وظیفہ سرانجام دے رہے ہوں۔ ورنہ اگر ان کو اپنے اصلی مقام پر تسلیم بھی کر لیا جائے اور یہ اپنا کام نہ کرتے ہوں تو جسم کی صحت اور بقا کو خطرہ ہو گا بعینہ یہی مثال روح کے لطائف کی بھی ہے۔ اس کو جہاں بھی تعین کوئی کرے تو جسم ہی کے اندر کرے گا اور اگر ان کو صحیح طریقہ سے ان کی خوراک یعنی ذکر الہی پہنچائی جائے تو روح کی صحت برقرار رہے گی اور جسم میں جگہ کے اختلاف سے روح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

ہمارے سلسلے میں روح کے لطائف قلب روح سری، خفی، اخفی، نفس اور سلطان الاذکار ہیں۔ موخر الذکر دو لطائف نہیں ہیں جن کی تفصیل اور ذکر کا طریقہ کتابوں میں ملتا ہے اور حضرت مدظلہ العالی اس کا ذکر اور طریقہ ذکر بار بار فرماتے ہیں۔ شرائط سے ذکر اور حدود قیود میں صحبت سے لطائف منور ہو جاتے ہیں اور روح

میں قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس راستے پر سفر کر سکے۔ جس راستے پر آپؐ معراج کو تشریف لے گئے تھے جہاں ان کیفیات اور سفر کو سلوک کے لحاظ سے کچھ مقامات کا نام دیا گیا ہے تاکہ سالک کو اپنے سفر کی طوالت اور اپنی محنت کے ثمر کا مسلسل احساس ہوتا رہے۔

حضرت کا ذکر اور طریقہ تربیت ذکر یہ ہے کہ ذکر میں منہ، آنکھیں بند ہوں، سانس ناک سے تیزی سے لی جائے جسم کو حرکت دی جائے اور توجہ اس بات پر لگی رہے کہ جو سانس اندر جا رہی ہے ساتھ "اللہ" لے جا رہی ہے اور باہر آنے والا سانس "ہو" کو باہر لا رہا ہے۔ ضرب وغیرہ کا ذکر عملی مثال سے سکھایا جا سکتا ہے یہ پڑھنے والا راستہ اور طریقہ نہیں ہے۔ ناک کے ذریعے تیز سانس اور جسم کی حرکت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو توجہ "اللہ ہو" پر قائم رہتی ہے اور دوسرا یہ کہ جسم میں ایک خاص درجہ حرات پیدا ہوتا ہے جو پرواز روح کے لئے بطور شرط ہوتا ہے اور روح کی پرواز میں بھی معاون ہوتا ہے چونکہ یہ طریقہ خلاف شریعت نہیں بلکہ مشائخ عظام کا آزمودہ طریقہ ہے اس لئے بحث و مباحثہ میں پڑنے کے بجائے ساری توجہ اپنے کام پر لگانا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی مزید ریسرچ کرنا چاہتا ہے تو وہ کہیں تصوف کے مدرسہ میں داخلہ لے کر باقاعدہ طور پر سلوک کے نظریات کا علوم حاصل کرے۔ مگر بات یہ ہے کہ سلوک تو نظریاتی چیز ہے ہی نہیں بلکہ کرنے کا کام ہے اور کرنے کے کام میں مشائخ کی نقل کرنی چاہئے نہ کہ ان کے ساتھ بحث و مباحثے یا سوالات اور نہ شیخ اپنے سلسلہ کے طریقوں کی فلاسفی بتانے کا مکلف ہے ہاں اگر شیخ اس کو بیان فرماتے ہیں تو ان کا احسان و عنایت ہے۔

ذکر کے فوائد میں یہ بات ہے کہ اس سے روح میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور روح کی استعداد ہی لطائف کرانے کا مقصد ہے۔ ذکر پر مداومت، متوجہ الی اللہ بنا

صحبت بد سے پرہیز اور حلال طیب غذا' یہی روح کی استعداد کو بڑھاتی ہے۔ جس سے روح میں شیخ کی فیوضات کے جذب کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور جب روح میں جذب کی یہ استعداد بڑھ جاتی ہے تو توجہ شیخ کو بھوک لگ جاتی ہے اور سالکین کی طرف خود بخود اس طرح متوجہ ہو جاتی ہے جس طرح ایک دودھ پلانے والی ماں اگر بازار میں گھومے تو اس کے سینہ میں دودھ آجاتا ہے۔ تو اسکو یعنی ماں کو علم ہو جاتا ہے کہ بچہ کو بھوک لگی ہے۔ یہی مثال توجہ شیخ کی بھی ہے اور جب روح کو شیخ کی توجہ مل جاتی ہے تو روح کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مجلس شیخ سے مستفید ہونے کے لئے صدیاں نہیں چاہئیں بلکہ مطلوبہ شرائط کے ساتھ چند لمحے گزارنے والا شخص شیخ کی مجلس میں بے شرائط صدیوں سے رہنے والے شخص سے زیادہ حاصل کر جاتا ہے۔

اور اگر ان دو صفحات کو غور سے پڑھا جائے تو فیض شیخ میں رکاوٹ ذکر میں تیزی کیوں؟ 'ناک سے ذکر کیوں؟'۔ توجہ شیخ اور استعداد جذب' سلوک کے لوازم اخذ فیض کے حصول' مانع فیض' رویہ اور صحبت شیخ کے فوائد' ذکر کا طریقہ وغیرہ اور دیگر اس قسم کے سوالات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ واضح ہو گا کہ خلاف شیخ جانا اس راہ کی بڑی رکاوٹ ہے روح میں قوت آنے کے بعد حضرت مدظلہ العالی سالک کو راہ سلوک پر چلاتے ہیں۔ جس میں کافی سارے منازل عالم خلق میں ہیں اور اس سے زیادہ منازل عالم امر میں ہیں جو روح کا اصلی مسکن ہے اور اس سے زیادہ منازل حجابات الوہیت میں ہیں۔ سلوک کے یہ تمام مقامات بتانے کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس پر چلنے والا شخص خود بخود ان کو جان اور سمجھ جاتا ہے راہ سلوک میں اوپر جانے کو عروج اور نیچے آنے کو نزول کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھیئے کہ راہ سلوک میں عروج کی نسبت نزول کی اہمیت ہوتی ہے۔ کہ جتنا ایک کامل' عام شخص کی طرح

شریعت کے مطابق زندگی گزارتا ہے وہی مرد کامل ہے اور مرد کامل کی حیثیت کا تعین اس کے نزول کے درجات سے کیا جاتا ہے۔ حضرت مدظلہ العالی کے سلوک میں مقامات سلوک کا حصول مقصود نہیں۔بلکہ مقامات سلوک کی کیفیات کا حصول مقصود ہے۔جو سالک اپنی عملی زندگی میں اپنا کر اپنی زندگی شریعت کے مطابق گزارتا ہے اور شریعت کے سامنے مردہ بدست زندہ ہو جاتا ہے۔جس کا حضرت جی اپنے بیانات میں بار بار ذکر فرماتے ہیں۔ذکر و مراقبہ و اتباع شریعت پر کچھ شرائط کے ساتھ مداومت پر ہر سالک کو توجہ کی یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔جس کا درجہ ہر سالک کی اپنی استعداد و استطاعت کے مطابق ہوتا ہے۔اس توجہ کی یکسوئی سے اس کو کچھ کیفیات نصیب ہوتی ہیں جو کشف یا وجدان کی صورت اختیار کرتی ہیں۔

1۔ جب جسم روح کا تابع ہو جاتا ہے۔تو دنیا میں' جسم میں روح کی وہی قوت آجاتی ہے جو روح کو برزخ میں نصیب ہوتی ہے۔اور جسم روح کی آنکھوں سے بھی دیکھنے لگ جاتا ہے۔اسکو کشف کہتے ہیں۔

2۔ اور اسی طرح جب بدن روح کا تابع ہو جاتا ہے تو اب جسم بدن کے آلات سے بڑھ کر روح کے ادراکات سے کام کرتا ہے اس کو کرامت کہتے ہیں۔

3۔ ذکر و مراقبہ و اتباع شریعت میں استقامت کے نتیجے میں بدن میں اپنی حیات کے لئے طاقت نہیں رہتی ہے بلکہ بدن جو کچھ کرتا ہے روح کی ترقی و قوت کے لئے کرتا ہے۔اس وقت شرح صدر نصیب ہو جاتی ہے۔وہ چیزوں کی حقیقت جان جاتا ہے۔اور اس پر علوم نزول شروع ہو جاتا ہے۔

بہر حال کشف و وجدان کی معلومات کو شریعت پر پیش کرنا ضروری ہے۔موافق شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے اور خلاف شریعت کو چھوڑنا

چاہئے۔ بعض سالکین پر راہ سلوک میں چلتے ہوئے کچھ مجاہدات آتے ہیں۔ جو اس راہ کا خاصہ ہے اور ہر کسی کو اسکا سامنا اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق کرنا پڑتا ہے عام طور سے اسکا سبب متعلقہ مقامات کے لئے جن اعمال و نوافل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سالک سے بوجوہ چھوٹ جاتے ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اس پر مجاہدات مسلط کئے جاتے ہیں۔ جو مال پر، جان پر، یا عزت پر وارد ہوتے ہیں۔ مجاہدات سے بخیریت گزرنے کے صرف دو طریقے ہیں کہ صبر سے صورت حال کا مقابلہ کیا جائے اور تقویٰ برت کر اپنے اعمال کی کمی کو دور کیا جائے۔ حضرت مد ظلہ العالی کے طریقہ تربیت کے خاتمے کے ساتھ ایک بات ہمیشہ مد نظر رہے کہ کوئی ایسا کام 'ایسا طریقہ' ایسی سوچ نہ اپنائی جائے جو شیخ المکرم کے بتائے ہوئے طریقوں کے خلاف ہو۔ ورنہ نہ صرف موجودہ کمائی ہاتھ سے نکل جائے گی بلکہ جتنی پہلے کمائی تھی وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔

عبدالودود شاہ

O..........O..........O

تعلیماتِ شیخ کا خلاصہ

ضرورت و تاریخ نبوت :

انسانیت کی تاریخ واضح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ انسانیت کی فلاح وبقاء و نجات کے لئے نبوت کا ہونا اشد ضروری ہے جو خود رب العالمین کی صفت ربوبیت کا تقاضا بھی ہے کہ ہر ضرورت مند کی ضرورت ہر جگہ ہر وقت اور ہر صورت میں پورا کرے۔ لیکن بد قسمتی سے بعض افراد اس ضرورت نبوت کا انکار کرتے ہیں اور اکثر افراد رواداری میں نبوت کی ضرورت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس تسلیم پر ان کے اپنے اعمال تک گواہ نہیں ہوتے۔

اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ میں حضرت مدظلہ العالی کی تعلیمات سے ثابت کروں کہ انسانیت کی فلاح و نجات صرف نبوت ہی سے ممکن ہے اس کے سوا کوئی اور ذریعہ ایسا نہیں کہ انسان نبوت سے مبرا ہو کر نجات حاصل کریں۔

لیکن نبوت کی ضرورت واہمیت تب سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جب تخلیق کے عمل

ومراحل کو سمجھا جائے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو لفظ "کن" سے پیدا فرمایا اور ان تمام مخلوقات میں انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور اسے احسن تقویم کا خطاب دیا اور احسن تقویم کا خطاب مشروط تھا معرفت خداوندی کے ساتھ کیونکہ انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت و معرفت کے لئے کی تھی اب سوال یہ ہے کہ انسان کو اس بوجھ معرفت کا مکلّف کیوں بنایا۔ اسمیں وہ کونسی خوبی یا اضافی چیز تھی جس کی بنا پر یہ معرفت کا مکلّف ہوا اور باقی مخلوقات کو اس کا مکلّف نہیں بنایا۔

اس سلسلہ میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ مخلوقات دو قسم کی ہیں ایک غیر مکلّف مخلوق ہے جو اطاعت الٰہی کی غیر شعوری طور پر پابند ہے کیونکہ غیر مکلّف مخلوق کے وجود کی بقاء اطاعت الٰہی میں مضمر ہے۔ جہاں ان سے اطاعت چھوٹتی ہے وہیں سے ان کا وجود فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور دوسری مکلّف مخلوق میں انسان جن فرشتے اور شیطان شامل ہیں۔ اب اس مکلّف مخلوق میں سے انسانوں میں خصوصی طور پر ایک استعداد رکھی گئی ہے جس کو Discretionary Power کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مکلّف مخلوق اپنی مرضی و اختیار سے اس Discre-tionary Power کو استعمال کر کے کسی بھی قسم کا عقیدہ اپنا سکتی ہے اب سوال یہ ہے کہ انسان میں اس خصوصی استعداد رکھنے کا سبب کیا تھا۔ کیوں کہ جب ہم اس خصوصی استعداد کے رکھنے کے سبب کا جائزہ لیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سے چار قسم کی مخلوق مکلّف ہے۔

1- شیطان :۔ جن کی تخلیق آگ سے کی گئی ہے۔ شر ہی شر ہے۔ اور ان سے خیر کا صدور محال ہے خلق شیطان کے وقت یہ "ونفخت فیہ من الروحی" کے مخاطب نہیں تھے۔

2- جن :۔ یہ بھی شیطانوں کی ایک قسم ہے اور آگ کی ایک خاص حدت سے ان کی تخلیق کی گئی ہے ان سے خیر و شر دونوں کی صدور ممکن ہے لیکن یہ بھی "و نفخت فیہ من الروحی" کے مخاطب نہیں مگر مکلف یہ بھی ہیں ان کے ساتھ جنت کا وعدہ نہیں ہاں گناہ پر عذاب کا وعدہ ہے چونکہ یہ اس خطاب کے مخاطب نہیں تھے اس لئے ان میں بھی نبوت کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کیونکہ ان کی خصوصی تخلیقی نوعیت ہی ان کو نبوت کی ضرورتوں سے مبرا کرتی ہے۔

3- فرشتے :۔ ان کی تخلیق نور سے کی گئی ہے خیر ہی خیر ہیں ان سے شر کا صدور محال ہے۔ اطاعت الٰہی پر مجبور محض ہیں لیکن یہ "ونفخت فیہ من الروحی" کے مخاطب نہیں ان کی جسمانی ساخت و تخلیقی ضروریات ان کو نبوت سے مبرا کرتی ہیں۔

4- انسان :۔ انسان ہی دراصل اس کائنات کا خلاصہ ہے جس کی تخلیق ایک خاص مقصد یعنی معرفت خداوندی کے لئے کی گئی اب معرفت خداوندی کے حصول کی شرائط کے مطابق ہمیں انسان کی اس استعداد کا جائزہ لینا ہوگا اور جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم انسانوں میں دو قسم کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔

ا۔ مادی جسم ۲۔ روح جو امر ربی میں سے ہے

لیکن جب ہم جسم انسانی کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ انسانی جسم چار عناصر آگ + پانی + ہوا اور مٹی کی باہمی ترکیب امتزاجی سے بنایا گیا ہے۔ جن میں اہم جز مٹی کا ہے اور یہی مٹی یعنی ارض اسی جسم کی تمام ضرورتوں کا

مرکز ہے۔ جس جسم میں انسان کی تمام ضرورتوں کے عام عناصر رکھے گئے ہیں جس کی ان مادی ضرورتوں کے پیش نظر انسان کو ایک دماغ دیا گیا ہے جو شعوری طور پر چیزوں کو سوچتا اور سمجھتا ہے۔ جس کو کام میں لا کر مٹی سے اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ روز اول سے لے کر آج تک اور روز قیامت تک انسان کی ضرورتیں ہمیشہ ایک جیسی رہیں گی ہاں ان ضرورتوں کے ذرائع بدلتے رہیں گے۔ دماغ کو اگر تربیت اور تعلیم سے سکھایا جائے تو اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی ضرورتوں کی تسکین کے علاوہ اپنے لئے سہولیات بھی ایجاد و دریافت کر سکتا ہے۔ ضروریات کی تسکین اور سہولیات کی فراہمی کے لئے انسان کا کسی مذہب یا عقیدہ کا پابند ہونا ضروری نہیں کیونکہ یہ چیزیں مذہب کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

بہر حال جب یہ چاروں عناصر انسان میں ایک خاص ترکیب و توازن سے ملے تو انسان میں مزید دو اضافی چیزیں شامل ہو گئیں۔ جس میں ایک کو نفس کہتے ہیں اور دوسرے کو روح حیوانی یا روح سفلی کہتے ہیں اور اسی سٹیج پر انسان میں روح حقیقی پھونکی جاتی ہے اور روح حیوانی سے اس میں حیات پیدا ہوتی ہے اور نفس جسم کی ضروریات و سہولیات کے لئے محرک کا کام دیتا ہے۔ چوں کہ نفس کی تخلیق ان مادی عناصر سے کی گئی ہے اس لئے اس کا طبعی میلان ان چاروں عناصر کے اندر ودیعت شدہ قوتوں کی طرف ہوتا ہے اور ان عناصر اربعہ کا طبعی مزاج نفس کو اپنی اپنی قوتوں کی وجہ سے، مختلف اسباب کی وجہ سے متحرک کرتا ہے چونکہ نفس مادہ ہی کی ایک لطیف صورت ہے اس لئے جسم سے لطیف ہے۔ مگر اس کا قدرتی رجحان اپنے اعمال و میلانات کی وجہ سے ہے۔ اس کے مختلف درجات مثلاً نفس لوامہ، نفس امارہ اور نفس مطمئنہ کے نام سے متعارف ہیں اور نفس کی اپنی قوتیں صرف دو ہیں۔ قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ اور نفس کی ان دو اعمالی قوتوں کے درجات کو i۔ افراط ii۔ اوسط

iii۔ تفریط کہتے ہیں۔ جس میں مطلوبہ درجہ انسانیت کی اپنی دنیاوی بقا کے لئے بھی اور آخرت کی بقا کے لئے اوسط درجہ ہے۔ جس کی تہذیب ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اس کی تربیت و تہذیب نہ کی جائے تو جسم کے اپنے بنیادی اجزاء پانی، ہوا آگ اور مٹی ہیں۔ جن کے طبعی اور فطری رجحانات ہیں اور نفس کا ادھر کو متوجہ ہونا فطری ہوتا ہے۔ مثلاً آب و ہوا کا مزاج۔ ہوا و حرص' پانی کا' ہیجان و شورش' آگ کا' غصہ و شہوت پسندی' اور مٹی کا اپنا مزاج ذلت وانکساری ہوتے ہیں جن سے نفس متاثر رہتا ہے اور وہی اعمال سرانجام دیتا ہے جو ان عناصر کا اپنا طبعی مزاج اور میلان ہے اسلئے نفس کبھی افراط کبھی تفریط کے اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لئے تہذیب نفس و جسم انسانی ضروری ہے تاکہ نفس اسی تہذیب کے مطابق جو روح سے مہذب اعمال یعنی مطلوبہ درجہ اوسط کے اعمال سرانجام کروائے اور اسی تہذیب کو سکھانے سمجھانے کے لئے نبوت کی ضرورت پڑتی ہے۔

کیونکہ

یہ جسم انسانی 'مادی اور غیر مادی اشیاء کا مرکب ہے۔ مادی اشیاء کا ذکر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس جسم کا دوسرا اہم عنصر "ونفخت فیه من الروحی" ہے جس کی بناء پر انسان مکلّف ہے یعنی اسمیں ایک ایسی چیز ڈالی گئی ہے جو مقصد تخلیق یعنی معرفت خداوندی کے حصول کی قوت واستعداد رکھتی ہے۔ لیکن مجرد روح یا مجرد جسم میں معرفت خداوندی کے حصول کی استعداد نہیں ہوتی ہے بلکہ جسم سے مل کر یا جسم کا جز ہو کر خاص اعمال' طرز حیات اور عقیدہ اپنا کر اپنا مقصد تخلیق حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے لئے اس پیدائشی استعداد کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ روح کیا ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے؟ اور کون اس کی تربیت کر سکتا ہے؟

ہمارے لئے بس اتنا ہی ضروری ہے کہ روح "من امر ربی" میں سے ہے اور عالم امر سے آئی ہوئی ہے۔ من امر ربی سے ہونے کی وجہ سے صفات باری سے متعلق ہے۔ اور صفات باری کو فنا نہیں ہاں۔ صفات باری اپنی صورتیں بدلتی رہتی ہیں اس وجہ سے روح ابدی ہے اس کو فنا نہیں۔ ہاں روح اور جسم کے باہمی تعلق کے درجات سے "فنا کا لفظ عارضی طور پر بولا جاتا ہے۔ لیکن دائمی طور پر یہ جسم نہ فانی ہے اور نہ روح فانی ہے دراصل روح و جسم دونوں فانی ہیں لیکن اس دوامی سفر میں اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اب جب یہ ثابت ہوا کہ انسان دو چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک مادی جسم ہے جو عناصر اربعہ سے بنا ہے۔ جس میں غالب عنصر مٹی کا ہے اس وجہ سے جسم کی تمام مادی ضرورتوں کا مرکز بھی مٹی ہے اور ان مادی ضرورتوں کے حصول کے لئے انسان کو دماغ دیا گیا ہے کہ وہ اس کا شعوری استعمال کر کے اپنے لئے ضروریات و سہولیات مہیا کرے۔ جہاں تک جسم کے دوسرے حصے یعنی روح کا تعلق ہے جو امر ربی میں ہے اسکا تعلق عالم تخلیق سے نہیں ہے۔ بلکہ عالم امر سے ہے اس لئے روح کی سہولیات اور ضروریات دونوں کا سامان اور لوازمات عالم امر میں رکھے گئے ہیں۔ جو اللہ کی شان و ربوبیت کو ثابت کرتی ہے۔ اس لئے روح میں جسم کے مادی دماغ کی طرح ایک قوت رکھی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ عالم امر سے اپنا تعلق قائم کر سکتی ہے اور وہاں سے اپنی ضروریات پوری کرتی ہے اب سوال یہ ہے کہ روح عالم امر سے اپنی ضروریات کیسے پوری کر سکتی ہے اور وہ ضرورت کیا ہیں؟

دراصل روح کی اپنی غذا تعلق باللہ کے قیام میں ہے جتنا جتنا تعلق باللہ قائم ہوتا ہے۔ اتنی ہی روح کو طاقتور غذا ملتی ہے اور روح کی صحت بر قرار رہ کر طاقتور ہو جاتی ہے۔ اور عالم امر کی طرف اسکا آنا جانا رہتا ہے۔ اور یہ تعلق باللہ جتنا کمزور ہو گا اتنا ہی اس کا رابطہ عالم امر سے کم ہو گا۔ اتنی ہی روح کی اپنی غذا مقدار اور کوالٹی میں

کم ہو جاتی ہے عالم امر سے روح کے تعلق کے درجات سے روح کی صحت وبیماری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ عالم امر سے کم تعلق ہونے کی وجہ سے روح بیمار ہو جاتی ہے اور اس کو طبعًا نیک اعمال ایسے ہی برے لگتے ہیں جس طرح جسم بیمار ہو جاتا ہے تو اچھی بھلی غذا کڑوی وبری لگتی ہے یہاں تک کہ عالم امر سے روح کا تعلق منقطع ہونے کی وجہ سے روح کو ایک قسم کی موت آجاتی ہے جس پر غضب خداوندی وارد ہو جاتا ہے روح کی موت کوئی مادی چیز نہیں۔ بلکہ غضب الٰہی کا وارد ہونا ہی روح کی موت ہے۔ اب جب روح کا عالم امر سے رابطہ اور تعلق اتنا اہم ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کا عالم امر سے تعلق ورابطہ کون پیدا کرے گا؟ تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کیا مجرد روح میں جسم کی طرح کوئی دماغی یا کوئی ایسی دیگر قوت ہے کہ اس کو کام میں لاکر عالم امر میں اپنا تعلق اس طرح قائم کریں کہ جس طرح جسم اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دماغی قوتوں کو کام میں لاکر اپنی ضروریات پورا کرتا ہے۔ لیکن مجرد روح میں ایسی قوت نہیں۔ ہاں عالم امر میں آنے جانے کی استعداد موجود ہے۔ روح اپنی اس ضرورت کے سلسلہ میں دماغ کو متحرک کرتی رہتی ہے کہ جسم کچھ ایسے اعمال اپنائے کہ اس سے اس کا عالم امر سے تعلق قائم ہو جائے اور مرنے سے بچ جائے اور انسان کے اندر کی یہی استعداد انسانوں کو نبوت کے ماننے کا مکلف بناتی ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات اپنی شان ربوبیت کے مطابق تب تک خلق کو کسی چیز کا مکلف نہیں بناتی ہے۔ جب تک اس تکلیف کے تمام ذرائع اور اسباب مہیانہ فرمائے۔ چونکہ مجرد جسم ومجرد روح یا دونوں میں عالم امر سے براہ راست تعلق کے قیام کی استعداد نہیں پائی جاتی ہے۔

تو اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان ربوبیت کے مطابق انبیاء علیہ اسلام کو اس ربط وتعلق کے قیام کے ذریعے اسباب وطریقوں کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور

انسانوں کے سوا دیگر مخلوقات میں انبیاء علیہ السلام کو اس لئے مبعوث نہیں فرمایا۔ کیوں کہ ان کی تخلیقی نوعیت تعلیمات نبوتؐ سے مبرا ہیں اس لئے انبیاء کو صرف انسانوں میں مبعوث فرمایا تاکہ انسانوں میں رہ کر ان کی رہنمائی کریں۔ اور دعوت الی اللہ اور تزکیہ کے ذریعے ان کا تعلق عالم امر سے قائم کردیں جس کے نتیجے میں انسان کو علم و حکمت نصیب ہو جاتی ہے اسلئے نبی تخلیقی طور پر نبی ہوتے ہیں۔ ان کو کسی مدرسہ کالج، یونیورسٹی اور اکیڈیمی میں نہیں بنایا جاتا ہے۔ نبی تخلیق سے لے کر ابد الآباد تک نبی رہتا ہے۔ اور کسی بھی وقت اور حالت میں ان سے نبوت کی نفی نہیں کی جاتی ہے یہ اس لئے کہ نبوت وہبی ہے اور ولایت کسبی ہے۔ اب نبی کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کا تعلق عالم امر سے قائم کردیں تاکہ تعلق باللہ قائم ہو جائے جس سے روح کی ضرورت پوری ہو جائے۔ اس لئے تعلق باللہ کا قیام تعلق بالرسول یا اتباع النبوی کی مرہون منت ہے۔ یعنی تعلق بالرسول کے بغیر تعلق باللہ کا قیام ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے پیغمبروں پر ایمان لانا عقیدے کا اہم جز ہوتا ہے اور یہیں اس سے قبل یا بعد کے فلاسفروں اور جدید دور کے دانشوروں کے عقائد و خیالات کی تردید ہو جاتی ہے۔ حیات انسانی میں بے شمار انبیاء کرام آئے اور ہر نبی نے تعلق باللہ کے قیام کی کوشش کی۔ پھر آپؐ مبعوث ہوئے۔ ہر نبی کے بعد دوسرا نبی اس وقت آتا ہے۔ جب اس سے پہلے کے نبی کی تعلیمات و برکات معدوم ہو جاتی ہیں انبیاء کی ان کوششوں کا خلاصہ یہ ہے۔

1۔ بعض نبی دعوت الی اللہ کے نتیجے میں ایک صالح معاشرہ بنا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

2۔ بعض انبیاء خود سلطان بن گئے۔ یا کسی اور کو اپنا جانشین بنا کر دنیا سے چلے گئے۔

3۔ بعض انبیاء اپنی دعوت کے نتیجے میں شہید کر دیئے گئے۔

4۔ بعض انبیاء بغیر کسی صالح معاشرہ کے قیام کے وارد عالم برزخ ہوئے۔

نبوت کی یہ تاریخ جاری تھی کہ انبیاء آتے رہے اور جاتے رہے تو سب سے آخر میں اللہ نے آپ ؐ کو مبعوث فرمایا اور آپ ؐ کو خاتم نبوت کا خطاب دیا گیا۔ اب قیامت تک دوسرا نبی نہیں آئے گا۔ اور یہی دین محفوظ ہوگا چونکہ دین تعلیمات و برکات کا مجموعہ ہے اور ہمارے دین کی تعلیمات ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔ الفاظ کے لحاظ سے بھی اور معانی کے لحاظ سے بھی۔ تو یقیناً برکات بھی محفوظ ہوں گی اور اگر برکات محفوظ نہیں ہوں گی تو دین کی حفاظت کا الہیہ عقیدہ غلط ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ یہ عقیدے کا ایک اہم جز ہے کہ اس دین کی تعلیمات اپنے معانی الفاظ اور برکات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اب تعلیمات دین محفوظ کرنے والے مفسر محدث فقہیہ وغیرہ کے نام سے مشہور ہوئے اور برکات نبوت کے محفوظ کرنے والے زاہد' عابد' صوفی کے نام سے مشہور ہوئے اور یہی سلاسل تصوف کا بنیادی فلسفہ 'اصول' اور طریقہ ہے آپ کا طریقہ تہذیب وتربیت قرآن سے اسطرح ثابت ہے۔

1۔ تلاوت کتاب

اس سے مراد دعوت الی اللہ ہے تاکہ انسانوں کا تعلق باللہ قائم ہو جائے۔ آپ ﷺ نے دعوت الی اللہ اور تعلق باللہ کے قیام کے لئے کچھ ضروری احکامات دیئے ہیں۔ جن کو اوامر اور منہیات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوامر میں فرض' واجب' سنت' اور مستحب اعمال شامل ہیں۔ جب کہ منہیات میں حلال حرام مکروہ مباح شامل ہیں۔ اوامر اور منہیات کی پابندی ہی عقائد کی گواہ ہوتی ہے۔ جن کی پابندی سے تعلق باللہ قائم ہو جاتا ہے اور تعلق

بااللہ کے درجات ہی ثواب کے درجات کو گھٹاتے اور بڑھاتے ہیں۔ان ہی اوامر اور منہیات کے قیام و نفاذ کے لئے آپؐ نے مدینہ میں ایک ریاست تشکیل دی جس کی حدود آپؐ کے وارد برزخ ہونے کے تئیس سال کے اندر اندر معلوم دنیا کے تین چوتھائی حصوں پر پھیل گئی بہر حال ان افعال واعمال کے بعد دوسرا درجہ آتا ہے۔

تزکیہ

اتباع نبویؐ اور تلاوت کے بعد آپؐ نے اپنی صحبت کے ذریعے برکات نبوتؐ کو تقسیم کیا ہے۔آپؐ کی صحبت کی عظمت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ آپؐ کی صحبت میں آنے والا ہر فرد صحابیؓ کے بلند ترین منصب پر فائز ہے جو انبیاء کے بعد کا درجہ ہے اور آپؐ کے صحابہؓ کے درجات اتنے بلند ہیں کہ آپؐ کے صحابہؓ پر ایمان لانا پرانے الہامی مذاہب میں عقیدوں کا ایک اہم جز رہا ہے۔

3۔ تعلیم و حکمت!

جب کسی کا تزکیہ ہو جاتا ہے جو تعلیم کتاب اور صحبت نبویؐ سے ہوتا ہے تو اس کو انعام میں علم و حکمت دی جاتی ہے۔تب سے لے کر ابد الآباد تک صحابہؓ کی علم و حکمت کی مثال نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔آپؐ نے ان پڑھوں کو عالم اور گڈریوں کو جرنیل بنایا۔جنھوں نے دنیا کی تاریخ پر ابد تک اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔غرض آپؐ نے علم و حکمت کی ایسی نرسری لگوائی کہ جہاں سے دنیا ابد الآباد تک سیراب ہوتی رہے گی۔دنیا جتنی بھی ترقی کرے یا ترقی کرے گی،صحابہؓ کے علم و حکمت کے خزانوں سے دنیا خوشہ چینی کرے گی اور صحابہؓ کی عظمت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ اگر آج کوئی ایسی صورت

حال پیدا ہو جائے جس میں کوئی صحابیؓ زندہ ہو جائیں اور وہ فرما دیں کہ نمازیں پانچ نہیں دو ہیں تو ساری امت اپنے اپنے فقہوں کی کتابیں دفن کر دے گی اور ساری مسلم امہ اسی ایک شخص صحابیؓ رسولؐ کی بات ماننے کی مکلف ہو گی اور یہی ان کی اصلی عظمت ہے۔

سلاسل!

آپؐ کے طرز دعوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ جس میں تعلیمات نبوتؐ ہر کوئی عالم' استعداد کے ساتھ بلا شرط عقیدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اور ہمیں بے شمار غیر مسلموں کے بارے میں علم ہے کہ وہ تعلیمات نبوتؐ میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ جہاں تک برکات نبوتؐ کے حصول کا تعلق ہے۔ برکات نبوتؐ کے حصول کی شرائط' تصحیح عقیدہ' تصحیح اعمال اور تصحیح اخلاص ہے جس کے بغیر برکات نبوتؐ کا حصول ناممکن ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپؐ کے وارد برزخ ہونے سے برکات ختم نہیں ہوئیں۔ بلکہ تعلیمات دین کی طرح باقاعدہ سند کے خاص محفوظ ہیں۔ آپؐ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ جامع کمالات نبوتؐ ہوئے۔ آپؓ کے بعد یہ برکات حضرت عمرؓ کو جامع طور پر ملیں۔ آپؓ کے بعد یہ برکات جامع طور پر حضرت عثمانؓ کو ملیں اور حضرت عثمانؓ کے بعد یہ برکات جامع طور پر حضرت علیؓ کو ملیں لیکن حضرت علیؓ کے دور میں پھر کوئی ایسا شخص نہیں رہا کہ اس بات کی استعداد رکھتا ہو کہ جامع طور پر یہ برکات وصول کر سکے۔ یعنی بحر نبوتؐ کی بحر 'بحر صدقؓ سے گزر کر بحر فاروقیت سے ہو کر بحر غنا میں داخل ہو کر بحر شجاعت و علم میں جمع ہوئیں۔ بعد میں استعدادوں کی کمی کی وجہ سے یہ لہریں ندی نالیوں میں

مٹ گئیں۔اس لئے حضرت علیؓ ہی کے زمانے میں برکات نبوتؐ کے حصول کے لئے مجاہدات کی ضرورت پڑی تاکہ کمالات نبوتؐ کے حواصل کی استعداد پیدا ہو سکے اور ہر عالم تکمیل درس کے بعد حاملین برکات کی صحبت میں رہے۔اور یہی وجہ ہے کہ تمام سلاسل کی ابتدا حضرت علیؓ سے ہوتی ہے۔لیکن یہ بات بتاتا چلوں کہ برکاتؐ کے حصول کے لئے یا برکات نبوت کے فیض دینے کے لئے تعلیم بطور شرط کبھی نہیں رہی۔صرف طلب عقیدت ' ادب و اطاعت کی شرائط ہیں۔اور یہیں سے سلاسل تصوف سرگرم عمل ہو گئے۔ہر سلسلے کا اپنا طرز تربیت ہے۔لیکن بنیاد وہی ہے کہ ایسے مشروع طریقوں سے اپنی استعداد بڑھائی جائے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ برکات نبوتؐ حاصل ہو جائیں۔اسلئے ہر سلسلہ کے اپنے اذکار مراقبات و مجاہدات مقرر ہیں اور ہر سلسلہ کا اپنا طرز تربیت ہے۔چونکہ یہ لوگ برکات نبوتؐ سے سیراب تھے اور ان کو تعلیمات نبوتؐ کے تقاضوں کا علمی و عملی مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جس طرح اسلامی معاشرہ کے ارتقاء کے پہلے دور ہی میں فقہی مکاتب متعارف ہوئے اور قانون کی درجہ بندی ہر لحاظ سے مکمل ہوئی بالکل اسی طرح صوفیانہ طرز کو بھی فروغ حاصل ہوا۔کیونکہ صوفیاء عظام کے نزدیک مسلم معاشرہ کا مذہبی وجود تعلیمات نبوتؐ کے ساتھ ساتھ برکات نبوت کا بھی مرہون منت ہے۔بالکل اسطرح طرز تصوف کی تربیت میں بھی درجہ بندی ہوئی۔صوفیائے عظام کے نزدیک مسلم معاشرہ کی وحدانی حیثیت کو صرف اور صرف تعلیمات نبوتؐ اور برکات نبوتؐ ہی کے ذریعے قائم کیا جاسکتا ہے اور اسکو بھی وسعت دی جاسکتی ہے اس سلسلہ میں صوفیائے

عظام نے تربیت کا وہی مزاج اور وہی طریقہ کار جاری کیا جو خود دورِ نبوتؐ اور دورِ صحابہ کرام میں مروج تھا۔ صوفیائے عظام کی ان ہی برکات سے اب تک اسلامی معاشرہ کی وحدانی حیثیت اپنی اصل صورت پر قائم ہے۔ حکومتوں اور علاقوں میں تقسیم ہونے کے باوجود پاکستان کا مسلمان اور اندلس کا مسلمان اپنے طرزِ عمل میں مکمل مماثلت رکھتا ہے۔



مرشد کامل

ایک نگاہ نفسیات اور نفسیات دانوں پر بھی!!

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم اما بعد فاعوذ باالله من الشیطن الرجیم
بسم الله الرحمن الرحیم

میری زندگی کا خوبصورت دن' محترمہ بشریٰ اعجاز صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ نا مکمل اجنبی مگر خط مین مذکور ایک نہایت معتبر حوالے نے اجنبیت کی دیواریں پل بھر میں گرا کر دلوں کو محبت کی تاروں سے جوڑ دیا۔ یوں لگا جیسے ہم ایک ہی تسبیح کے موتی' ایک ہی دیوار کی اینٹیں اور ایک گھر کے باسی ہیں۔ جی ہاں' یہ حوالہ ہے سید الاستاذ شیخ المکرم حضرت امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی کا، جو ایک نگاہ سے دلوں کو جوڑنے کا فن جانتے ہیں جن کا حوالہ بھی نگاہ کا کام کرتا ہے۔

محترمہ حضرت کی حیات مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ایک

کتاب ترتیب دے رہی ہیں۔ حکم ہوا۔ آپ کا موضوع نفسیات ہے۔ حضرت مد ظلہ العالی کے ساتھ نفسیات کے حوالے سے اپنے تجربات تحریر کر کے جلد از جلد آپ کو ارسال کروں اللہ کے کرم کا بے تحاشا احساس ہوا جس نے اس ذرۂ بے توقیر کو اپنے محترم و محبوب شیخ کے بارے کچھ لکھنے کی سعادت نصیب فرمائی اس استاد کے بارے جس نے ایک ماہر نفسیات کی حقیقی علم نفسیات کی طرف راہنمائی فرمائی۔

استاد المکرم کے بارے کچھ لکھنے کی جسارت کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بات علم نفسیات کے بارے ہو جائے۔ علم نفسیات کا موضوع دراصل انسانی واقعات و کردار کا مطالعہ کر کے اس طریقِ زندگی کی تلاش ہے جس سے انسان معاشرے میں ایک مفید اور موثر کردار ادا کر سکے تاکہ وہاں اس کے ارد گرد کے لوگ مل جل کر سکون و اطمینان سے زندگی گزار سکیں۔

بد قسمتی سے جتنے علوم نفسیات موجودہ دور میں پڑھائے جاتے ہیں وہ مغرب اور امریکہ کی ان تحقیقات کا نچوڑ ہیں جو ان کے اپنے خدا بیزار معاشروں کی مخصوص اقدار و مسائل کو سامنے رکھ کر خالصتاً غیر اسلامی ماحول میں کی گئی ہیں۔ جو معاشرہ جس بات کو درست تصور کرتا ہے اس کی تحقیقات کا رخ بھی اسی سمت مڑ جاتا ہے۔ مذہب انسان کا ذاتی مسئلہ تصور کیا جاتا ہے اور مذہب کو نفسیاتی طریقہ علاج میں استعمال کرنے سے منع کیا جاتا ہے کہ ماہر نفسیات صرف بندوں کے بندوں سے تعلق کی بات کرے مگر خالق کو درمیان میں نہ لائے کہ یہ مریض کا ذاتی مسئلہ اور معاملہ ہے۔ جو ماہرین نفسیات مذہب کی بات کرتے ہیں وہ زیادہ تر خود بھی مذہب کی بنیادی روح سے واقف نہیں ہوتے۔

علم نفسیات میں جدید ترین تحقیقات اور جدید ترین نفسیاتی طریقہ علاج کی دریافت کے باوجود ماہرین نفسیات انسانی مسائل کا موثر حل تلاش کرنے میں ناکام

رہے ہیں معاشروں کا زوال، نفسیاتی امراض میں روز افزوں اضافہ، اور دن بدن بڑھتی ہوئی بے راہ روی، بے چینی اور نامعلوم خوف ماہرین و محققین نفسیات کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نفسیاتی مریضوں میں صحت یابی کا تناسب 3 سے 10 فیصد ہے۔باقی مریض وقتی طور پر نفسیاتی علاج کے طریقوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد انہی علامات یا مختلف علامات کے ساتھ واپس نفسیاتی علاج گاہ کا رخ کرتے ہیں۔

نفسیاتی علاج میں ناکامی کا ایک سبب معاشرتی ناانصافی و ناہمواری اور مریض کی ہسپتالوں میں صحت یابی کے بعد ایک Stressfull environment میں واپسی بھی ہے۔معاشروں میں بے چینی کے چند بڑے اسباب جدید تحقیق کے مطابق تعلیم کی کمی، معاشی اور معاشرتی بد حالی، ازدواجی و خاندانی جھگڑے، ناانصافی، بدامنی، اور یورپی اور امریکی اقوام میں دوسری قومیتوں کے خلاف پایا جانے والا شدید تعصب اور تشدد کے رجحانات شامل ہیں۔مغربی معاشروں میں Individualism یعنی فرد کے ذاتی کردار اور حقوق پر زور دیا جاتا ہے۔خاندانی زندگی کا تصور پرانے زمانے کی بات اور شخصی آزادی میں رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔

نفسیاتی علاج کرنے کے لیے ماہرین نفسیات میں چند بنیادی شخصی خصائص کا پایا جانا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔دوران تربیت ان شخصی خصائص کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے ان میں، ذہانت، برجستگی، ہوشیاری مریض کی بغیر کسی Judge-ment کے قبولیت یعنی (Unconditional Positive regard)، سننے کی صلاحیت (Listening ability)، اعتماد حساسیت (Sensitivity)۔

دوسروں کے دکھ کو محسوس کر سکنے کی صلاحیت (Empathy)، صبر و برداشت، نفسیاتی طریقہ ہائے علاج میں مہارت اور تحقیقی ذہن وغیرہ شامل ہیں۔

مختلف پس منظر کے لوگوں کے علاج کے لئے ماہرین نفسیات کے لئے مختلف مذاہب کے بارے چیدہ چیدہ معلومات رکھنا' معاشرے کے رجحانات اور اسکے حالات پر نظر رکھنا' معاشرتی مشکلات سے آگاہی' ان کے حل کے لئے معاشرے میں میا مختلف سہولیات کے بارے میں معلومات رکھنا شامل ہیں۔

اتنی وسیع معلومات اور کڑی تربیت کے باوجود ماہرین نفسیات خود بے چینی بے سکونی' اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ یہ بے سکونی اور بے اطمینانی مسلمان ممالک کے نفسیات دانوں میں بھی پائی جاتی ہے خصوصا تب جب نفسیات میں مغربی اور امریکی نقطۂ نظر اسلامی اقدار و قوانین سے ٹکراتا ہے۔ ماہرین نفسیات کی اپنی تربیت میں مذہب کا عمل دخل نہیں ہے۔ جامعات اور ہسپتالوں میں زیادہ تر چوٹی کے ماہرین نفسیات نہ صرف مذہب کی روح سے ناواقف ہیں بلکہ اس کے نفسیات میں عمل دخل کے سخت مخالف بھی ہیں۔ وہ یورپ کے مذہب کو ذات تک محدود رکھنے کے نقطۂ نظر کے شدت سے حامی ہیں۔

نفسیاتی طریقہ علاج میں شخصیت کے عقلی' جذباتی اور عملی پہلوؤں پر توجہ دی جاتی ہے۔ یہ تین Schools of thought اپنے طریقہ علاج میں ایک شخصیت کے کسی ایک پہلو پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اور اسکی مدد سے دوسرے دونوں پہلوؤں کی بہتری کے لیے کام کرتے ہیں۔ مثلاً عقلی پہلو (Cognitive aspect) کے مطابق فرد کی سوچ ہر جذبے اور عمل کے پیچھے کار فرما ہوتی ہے۔ اور اسے بدلا جائے تو جذبہ اور عمل دونوں بدلے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ دوسرے ماہرین نفسیات جذبات پر کام کر کے سوچ اور عمل کو اور تیسری طرح کے ماہرین نفسیات عمل کی تبدیلی کو سوچ اور جذبے کو بدلنے میں مددگار تصور کرتے ہیں۔ جدید تحقیقات اور طریقہ کار اب ان تینوں طریقوں کو ایک ساتھ استعمال کر کے انسانی

کردار کی بہتری کے لئے کوشاں ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں کئے گئے سروے کے مطابق Asians خصوصاً مسلمانوں میں ذہنی صحت کا معیار دوسری اقوام کی نسبت ناساعد حالات کا شکار ہونے کے باوجود ان سے بہتر پایا گیا ہے۔ دوسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جو مذہب پر عمل کرتے ہیں گزشتہ دہائی میں ماہرین نفسیات کی دلچسپی مذہب اور اس کے ذہنی اور نفسیاتی طور پر مثبت اثرات کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس پر تحقیقات جاری ہیں۔ بے سکونی اور بے چینی کا شکار انسان سکون کی تلاش میں ہے اور کسی پناہ کی تلاش میں بھی۔

نفسیات کے میدان میں احقر کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جن سے بہت سے سوال ذہن میں پیدا ہوتے رہے۔

1- مریضوں میں صحت مند ہونے کا تناسب اتنا کم کیوں ہے ؟

2- باوجود ایک لمبا عرصہ مریضوں کے ساتھ محنت کرنے کے اور ہر معلوم طریقے سے علاج کے باوجود مریضوں میں بہتری کا عمل رک کیوں جاتا ہے۔؟

3- اس جمود کو کیسے توڑا جا سکتا ہے۔ ؟

4- معاشی اور معاشرتی بے انصافیوں کے شکار مریضوں کی کس حد تک مدد کی جا سکتی ہے اور کیسے ؟

5- مریضوں کے Relapse rates یعنی دوبارہ بیمار ہونے کے تناسب کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے ؟

6- ماہرین نفسیات خود احساس عدم تحفظ، بے چینی اور بے سکونی کا شکار کیوں ہیں ؟

7- باوجود علم رکھنے کے وہ کونسی چیز ہے جو عادات کو بدلنے میں شدید مزاحمت کرتی ہے ؟

8-مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے سے ہم خوفزدہ کیوں ہیں ؟
9-نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ہمیں نفسیاتی عوارض و ذہنی امراض کیوں نظر نہیں آتے ؟
10-کیا دین اسلام میں کوئی ایسی بات ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے 'باوجود مذہب کا علم رکھنے کے اور اس کی افادیت تسلیم کرنے کے اس پر عمل کیوں نہیں ہو پاتا۔

سینکڑوں سوال ذہن میں گردش کرتے رہے۔ بہت سی کانفرنسیں' تقاریر' ورکشاپس attend کیں' نفسیات کا پہلو عقلی لحاظ سے بہت متاثر کن تھا۔ مگر اس کے باوجود معاشرہ دن بدن زوال پذیر ہے۔ معاشرہ جو افراد سے بنتا ہے۔ بے سکون افراد کی مدد کی کیا صورت ہو کہ معاشرے کو ترقی اور بہتری کی راہ پر ڈالا جاسکے۔ قرآن حکیم کے ترجمے کو پڑھنا شروع کیا تاکہ دیکھ سکوں کہ دینِ اسلام اس کا کیا حل پیش کرتا ہے پڑھنے سے یہ تو یقین ہو رہا تھا کہ جواب اس میں ہی ہیں مگر جواب کے مختلف حصے علیحدہ علیحدہ رہے۔ Links نہ بن پائے۔ دماغ نے اسکی حقانیت تسلیم کی' مگر عملی زندگی میں عمل ندارد۔ اس صورت حال میں صحیح سمت میں رہنمائی کی طلب اور بے چینی رب جلیل کے در پر لی گئی۔

حمد للہ' اللہ نے رہنمائی فرمائی اور آخر کار شعبہ کلینکی نفسیات نے مذہب اور ذہنی صحت کے موضوع پر چند لیکچرز کا اہتمام کیا۔ محترم جناب کرنل مطلوب حسین صاحب اور قبلہ آفتاب اقبال صاحب کے یکے بعد دیگرے ایک ماہ کے دورانیے میں 4 لیکچرز ہوئے۔ بتایا گیا کہ قرآن حکیم سکون قلب کا جو نسخہ تجویز کرتا ہے وہ اللہ کا ذکر ہے اور یہی نفسیاتی امراض کا شافی علاج بھی ہے ذکر سے اللہ سے محبت پیدا ہوتی ہے اور جس سے محبت کی جائے اس کی بات ماننے کو جی چاہتا ہے۔ خالق کائنات

اللہ تعالیٰ کو ہم تسلیم کرتے ہیں مگر اسکے بتائے ہوئے اصول و ضوابط کے تحت یعنی قرآن و سنت' شریعت مطہرہ کے تحت زندگی نہیں گزارتے۔ کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے سے محبتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے اور اللہ پر یقین پختہ ہوتا ہے یہ یقین اور محبت مل کر عمل میں آسانی پیدا کرتے ہیں یوں جب خالق کائنات کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق حقوق و فرائض کی ادائیگی ہوتی ہے تو بہتر انسان اور بہتر معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس میں ہر شخص دوسرے کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور ایک مضبوط معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جب سب کو ان کے حقوق ملتے ہیں تو سب چین و سکون سے زندگی گزار سکتے ہیں اور نفسیاتی امراض حملہ آور نہیں ہو پاتے۔

نفسیاتی طریقہ علاج میں 'میں بے شمار قسم کی Relaxation Excercises آزما چکی تھی۔ سوچا یہ بات تو دل کو لگتی ہے اسے بھی آزما دیکھنا چاہئے۔ اللہ کے کرم سے ذکر اللہ شروع کیا۔ پہلے سے حیرت انگیز طور پر بے تحاشا سکون محسوس ہوا۔ پھر دنوں میں اپنی ذات کی کوتاہیاں اور خامیاں کھل کر سامنے آگئیں۔ اپنے گناہوں کا شدید احساس ہونے لگا کیسے اور کس طرح کی زندگی گزار دی دل کا حال خراب ہونے لگا سوچا یہ سب 'سالوں کی نفسیات کے ساتھ وابستگی کے دوران کیوں نظر نہیں آیا۔

آخری لیکچر حضرت مد ظلہ العالی کا تھا۔ اس لیکچر کے صرف 10 منٹ میسر آسکے۔ لیکچر کے چند آخری جملے سننے کو مل سکے اور پھر سوال و جواب شروع ہو گئے۔

جیسے پہلے عرض کیا کہ اپنے سوالوں کے جواب کی متلاشی تھی اور مختلف لوگوں سے رابطہ کر چکی تھی ایک مشہور عالم دین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی انہوں نے فرمایا وہ عورتوں سے نہیں ملتے۔ دل کی تڑپ زیادہ ہو گئی۔ پھر کہاں جاؤں کس سے



جسٹس غلام مجدد مرزا بریگیڈیر اکرم اور راجہ منور DSP کے ہمراہ شکار پر ہے۔

حضرت ملک اکرم اعوان 'منیر نیازی و دیگر احباب کے ساتھ

پوچھوں۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پوچھا مولانا مرد تو دین کا علم حاصل کرنے کے لیے باہر جا سکتے ہیں تلاش کر سکتے ہیں خواتین کیا کریں۔ فرمانے لگے خواتین مرد حضرات سے سرخی پاوڈر کی فرمائش کر سکتی ہیں دین سیکھنے کی کیوں نہیں کر سکتیں۔ پوچھنا چاہتی تھی کہ جہاں یہ Facility نہ ہو کیا کریں؟ مگر لیکچر ختم ہو چکا تھا۔ سوال دل میں رہ گیا اور مولانا تشریف لے جانے لگے۔ میں تیزی سے پیچھے لپکی شاید بات کرنے کا موقع مل جائے پوچھوں۔ آپ سکھا دیں گے مجھے؟ مگر موقع نہ مل پایا۔ ان چند لمحات میں اعتبار کا ایسا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ مجھے دل میں جیسے یقین ہو گیا کہ میرے سوالوں کے جواب وہیں سے ملیں گے۔

اللہ نے اپنے خاص کرم سے وسیلہ بنایا اور حضرت سے ملاقات کا بار ہا شرف حاصل ہوا۔ کئی مرتبہ آپ کیساتھ ذکر نصیب ہوا۔ کئی لیکچر سننے کا موقع ملا۔ آپ کے افکارِ عالیہ میری آنکھیں کھول رہے تھے اور نگاہیں اور دل۔ اپنی گزشتہ زندگی خوف پیدا کر رہی تھی ساری زندگی گناہوں میں ضائع کر دی۔ کیا حشر ہو گا؟ جواب آیا' باقی زندگی جس لمحے درست کرنے کا عہد کر لیں وہ غفور الرحیم ہے معاف فرما دیتا ہے۔ مگر پتہ کیسے چلے معافی مل گئی؟ فرمایا۔ زندگی کا سفر گناہ سے نیکی کی طرف ہو جائے اور زندگی میں سکون آ جائے تو سمجھ لو رحمت باری نے بڑھ کر تھام لیا۔

الحمد للہ۔ اللہ کی رحمت کا احساس ہونے لگا۔ خوف کی جگہ سکون آنے لگا اور شک کی جگہ یقین نے لے لی۔ زندگی میں تیزی سی آنے لگی۔ قرآن حکیم پڑھنے کو نہ صرف دل چاہنے لگا بلکہ سمجھ آنے لگا۔ کڑیوں سے کڑیاں ملنے لگیں اپنے اندر ایک الارم سسٹم محسوس کیا جو ہر وقت گناہوں سے Warn کرتا ہے۔ اپنے اندر اعتماد محسوس ہونے لگا۔ دل میں خوشی آنے لگی۔ زندگی خوبصورت ہو گئی لوگوں کی پرواہ کے بغیر رب کریم نے درست فیصلوں کی توفیق دی۔ غلط کاموں سے انکار کر

دیا۔ بہت ناراضگیاں ہوئیں مگر مجھے نہ صرف خوشگوار حیرت ہوئی بلکہ بہت اعتماد محسوس ہوا جب میں نے کسی فرد کے ڈر سے اپنے درست فیصلے تبدیل نہیں کئے۔ نہ لوگوں سے نفرت اور دوری کا رویہ اپنایا۔

چند ہی دنوں میں آپس میں اعتماد کی فضا قائم ہو گئی۔ اور بے تحاشا تجربات ہوئے۔ اللہ کریم نے اپنے خاص کرم سے مشاہدات سے نوازا۔ مجھ ذرہ بے وقعت کو اپنے حبیب ﷺ کی زیارت سے مشرف بار کیا۔ اس در سے آشنا فرما دیا۔ اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کے اس حبیب غلام کے قدموں میں حاضری کے طفیل جتنا عطا کیا ان قدموں کی خاک سے جتنا پایا اس کے قابل نہ کبھی تھی اور نہ ہوں اور نہ کبھی ہو پاؤں گی۔ جتنے تجربات ہوئے۔ نہایت عجیب تھے مگر ہر تجربہ' ہر احساس یقین اور اعتماد میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ جہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا کہ زندگی میں اب کیا تبدیلی لاؤں؟ کیوں' کیسے؟ محسوس ہوتا کائنات کے ہر ذرے کو زبان مل گئی ہو' درخت کا ہر پتہ' پھول کی ہر پنکھڑی۔ کتاب کا ہر ورق۔ لوگوں کا لفظ لفظ' کائنات کی ہر حرکت۔ دل کی ہر دھڑکن گویا پیغام دیتی محسوس ہوئی۔ یہ تبدیلی لاؤ۔ اس لئے۔ ایسے۔

ہر سوال کا جواب ملنے لگا۔ قرآن حکیم پڑھنا شروع تو بہت عرصے سے کیا تھا مگر اب سمجھ آنے لگا۔ لگتا تھا روزانہ کے سبق میں اللہ رب العزت زندگی گزارنے کا طریقہ خود تعلیم فرما رہے ہیں ایک طلب پیدا ہو گئی میں کون ہوں؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مجھے زندگی کیسے گزارنا ہے۔ جواب ڈھونڈنے لگی اور جواب ملنے لگے ہر جواب تیزی سے آس پاس سے ہی مل جاتا۔

نفسیات کی انہیں کتابوں سے جو پڑھا تھا۔ دوبارہ پڑھا تو نئے نکات سامنے آنے لگے جو پہلے کبھی سمجھ نہ آئے تھے۔ کام اور وقت میں برکت ہونے لگی۔ دل میں اتنی خوشی محسوس ہوئی دل چاہا ہر شخص اس سکون اور خوشی کو حاصل کر لے۔ الحمد للہ۔

اللہ نے لوگوں تک اپنا نام پہنچانے کی توفیق دی ان کا بھی یہی حال پایا۔ چند دنوں کے اندر ان کی حالت میں خوشگوار تبدیلی آنے لگی۔

نفسیاتی مریضوں کو دوسری قسم کی Relaxation Exercises بتانے کے بجائے اللہ کا نام بتانا شروع کیا۔ ماہرین نفسیات خودکشی پر مائل مریضوں کو فوراً ہسپتال کے دماغی امراض کے شعبے میں بھیجتے ہیں تاکہ اس کو دوا دی جا سکے اور Under Observation رکھا جا سکے کہ وہ خودکشی کی کوشش نہ کر سکے اور اس کا موڈ بہتر کیا جا سکے۔ ان مریضوں کے علاج کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

ایک بہت شدید ڈیپریشن کی شکار مریضہ نے جو خودکشی پر مائل تھی۔ مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اس وقت میں Ph. D کے لئے لندن آنے کی تیاری میں مصروف تھی اور کوئی ایسا نیا مریض نہیں لے رہی تھی جس کا علاج لمبا ہو۔ تاکہ میرے جانے کے بعد اسے نئے سرے سے کسی دوسرے therapist کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں مشکل نہ ہو۔ میں نے اسے کسی دوسرے سائیکولوجسٹ کے پاس بھیجنا چاہا اس نے انکار کر دیا۔ سوچا اللہ کا نام لے کر شروع کرتے ہیں۔ اور دوران سیشن اسے Convince کرنے کی کوشش کروں گی کہ کسی اور کے پاس چلی جائے۔ بہت بہتر لوگ موجود ہیں۔ پہلے Session میں اس کو ذکر اللہ بتایا اور اللہ کی رحمت پر بھروسے کو کہا۔ اسے کہا صبح شام ذکر کرو۔ ہو سکے تو دن میں زیادہ بار کر لو۔ 12 دن کے اندر 6۔ ذکر اللہ کے Session ہوئے اور اس کے بعد اس کے ڈیپریشن کا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی سہیلیاں اس کے آس پاس کے لوگ اسکی شخصیت کی خوشگوار تبدیلی سے حیران تھے۔ جو کل تک سب کے لئے دردِ سر تھی آج انہی کو سکون کا نسخہ بتا رہی تھی، سبحان اللہ "کل یوم ھو فی شان"۔ ساتھی ماہرین نفسیات

نے اس قدر تیزی سے تبدیلی کو ناممکن قرار دیا اور اسے مریض کی بناوٹ قرار دیا تاکہ Therapist کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

اگر ایسا ہوتا تو دوسرے لوگ اس کی شخصیت کی تبدیلی کو نوٹ نہ کرتے اور مجھے وہ خود کہہ چکی تھی کہ اسے اب میری ضرورت نہیں ہے اللہ کا ساتھ اسے محسوس ہوتا ہے اور اللہ ہی اسے کافی ہے۔ 4- برس کے بعد اب بھی ماشاء اللہ وہ متحرک اور فعال ہے اور اللہ کا نام آگے پہنچانے میں مصروف ہے۔

دوسری مریضہ بھی شدید ڈیپریشن کا شکار تھی کہ کمرے سے بھی باہر نہ نکلتی تھی یہ میڈیکل کی ایک ذہین طالبہ تھی۔ اس نے نہ صرف میڈیکل کالج جوائن کیا بلکہ انتہائی محنت سے اپنی کلاس میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ آج بھی اپنی فیملی کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم سے خوش باش ہے۔ نفسیات کی دنیا میں اس بیماری کی شدت میں اتنی Speedy recovery کی مثال نہیں ملتی۔ جبکہ صحت یاب افراد دوبارہ بھی اس مرض یا کسی اور نفسیاتی مرض کا شکار نہ ہوئے ہوں۔ یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ دونوں مریضوں کو دوران مرض اساتذہ کے ساتھ ذکر کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کی اہمیت آپ پر مضمون کے باقی متن میں واضح ہو جائے گی۔

اس روحانی طریقہ علاج میں میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ قرآن حکیم میں ذکر اللہ کا بے سکونی کی دوا ہونا پڑھا تو تھا مگر اس تبدیلی کا تجربہ اپنی اور اپنے مریضوں کی ذات میں اس قدر تیز اور خوبصورت تھا کہ شدید تجسس اور لگن پیدا ہوئی کہ دیکھا جائے کہ یہ کیسے کام کرتا ہے؟ اہل اللہ اس خوبصورت سائنس سے کیسے کام لیتے ہیں؟ بارہا ایسا ہوا تھا کہ میں اپنے سوال یا مسئلہ دل میں لے کر جاتی تھی اور بغیر پوچھے Exactly مجھے اس کا جواب مل جاتا تھا۔ روحانی معالج کی تشخیص کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے؟ اس قدر مختصر الفاظ میں اور بعض مرتبہ صرف خاموشی سے صرف

نگاہ کے اثر سے' صحبت کے اثر سے اس قدر تیز تبدیلی کیسے آتی ہے؟ بغیر کچھ بتائے اہل اللہ مسئلے سے کس طرح آگاہ ہو جاتے ہیں۔ بغیر کچھ کیے علاج کیسے کر دیتے ہیں؟ شخصیت کی خوبصورت تعمیر کا یہ کون سا انداز ہے؟

اگر مجھے خود ذاتی طور پر یہ تجربات نہ ہوئے ہوتے تو شاید میں اس کو اوروں کی طرح توہم پرستی سمجھتی' مگر اپنے تجربے کو جھٹلانا ممکن نہ تھا۔

حضرت میں' میں نے روایتی پیروں والی کوئی بات نہ دیکھی' طبیعت انتہائی سادہ' نہ اونچی مسندیں' نہ کروفر' کھرا پن طبیعت کا خاصہ' میں نے انہیں دین و دنیا کی بہترین تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتے پایا' چاہتے ہیں لوگ دین کے اصولوں پر سختی سے عمل کریں اور بہترین دنیاوی تعلیم بھی حاصل کریں۔

مجھے دو سال پہلے P.H.D کے لئے سکالرشپ مل چکا تھا۔ امریکہ میں داخلہ ہوا مگر ویزہ نہیں ملا۔ دو سال میں' میں نے خود زیادہ کوشش نہیں کی۔ میں خوفزدہ تھی کہ کہیں وہاں جا کر اسی معاشرے کا رنگ قبول نہ کر لوں۔ اپنے اوپر ذرا اعتماد اس بارے محسوس نہ ہوتا تھا اللہ کے ذکر نے بہت اعتماد دیا' اللہ کی معیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ خوف آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا مگر اب بھی فیصلے کی ہمت نہ پڑی۔ حضرت سے ضمناً ذکر کیا تو آپ نے فرمایا ضرور کرو P.H.D' ضرور جاؤ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ امریکہ کا ویزہ نہیں ملا برطانیہ میں کر لو۔ حضرت کے کہنے میں ایسی بات تھی۔ دل مائل ہوتا چلا گیا۔ اللہ پر بھروسہ کر کے apply کیا۔ اللہ کے کرم' حضرت کی دعا سے فوراً داخلہ ہو گیا۔

اسی اثناء میں رسول کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف بار ہوئی۔ محسوس ہوا' حکم ہوا ہے ذکر پر تحقیق کرو۔ حضرت سے عرض گزار ہوئی۔ آپ نے فرمایا''آپ کا موضوع نفسیات ہے ذکر کے ''انسانی نفسیات' دماغ اور سوچ پر اثرات'' کا اپنے

شاگردوں میں مطالعہ کر کے یکجا کریں۔

"یہ سب کیسے ہوگا؟اس کازیادہ اندازہ نہ تھا"

بہر حال P.H.D کے لئے برطانیہ آگئی۔ خود پر مغربی معاشرے کارنگ چڑھ جانے کا کچھ خوف محسوس ہوتا تھا۔ حضرت کو خط لکھا۔ آپ نے تفصیلی جواب عنایت فرمایا۔ فرمایا" بیٹے آپ اعتماد سے رہیے۔ آپ کو وہاں ڈرنے کی ضرورت نہیں، سب کمزوریاں انسان کے اندر ہوتی ہیں۔ باہر سے کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ اچھے لوگ وہاں بھی ہیں انہیں اچھے ساتھ اور خلوص کے ساتھ راہ بتانے والوں کی ضرورت ہے۔

خط پڑھ کر بہت حوصلہ بڑھا۔ اللہ پر اعتماد، اس کے ساتھ پر یقین اصل بات ہے۔ خوف انسان کے اندر کی کمزوری ہے۔ گویا اعتماد کی کمی خوف کا باعث ہے دوسرے لوگ یا معاشرتی اثرات نہیں۔ ساتھ ہی فرمایا کہ مجھے ایک اچھا ساتھ بننا ہے اور خلوص کے ساتھ اللہ کا پیغام پہنچانا ہے بے شک بظاہر کیسے لوگ ہوں ہر شخص کو اس گندے معاشرے سے نکلنے کے لیے Support کی ضرورت ہے۔ ان کے اندر تڑپ اور اچھائی کا راستہ معلوم کرنے کی خواہش موجود ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایک اچھا اور مضبوط ساتھ مہیا کریں۔ ایک باعمل اور باکردار زندگی گزارنے کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ساتھ ہی رابطہ بذریعہ خطوط کی ہدایت بھی فرمادی۔

آج اپنی تحقیق کے آخری مرحلے پر آکر مجھے پتہ چلا کہ حضرت مدظلہ العالی میرے محترم وشفیق استاد نے اس وقت میری تحقیق کے رزلٹ ہی مجھ سے بیان فرما دیئے تھے آپ نے کس خوبی سے انسان کی شخصیت، معاشرے کے اثر، اور اس کی بہتری کے بہترین نکات ارشاد فرمادیے ہیں۔

اعتماد اور خوف کے اس تعلق کو جدید ترین تحقیقات ثابت کر رہی ہیں۔ میری اپنی تحقیق کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ شخصیت میں اعتماد کا فقدان خوف پیدا کرتا ہے۔ ایک پر خلوص اور اچھا ساتھی اس خوف سے نکلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے یعنی معاشرے میں Social Support کی quality دوسرے مشکل میں گھرے انسانوں کے لیے خوف سے نکلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اور اس طرح ایک خوبصورت معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

شخصیت میں اعتماد 'اللہ پر بھروسے پر منحصر ہے۔ زندگی میں واضح مقاصد 'ان لوگوں کے ساتھ رابطہ جو کہ سیدھا راستہ بتا سکتے ہیں۔ (گویا سیدھا راستہ اور سیدھا راستہ بتانے والوں کی ' دونوں کی اپنی اہمیت ہے) اور خلوص کے ساتھ بتا سکتے ہیں انسان کو زندگی کی مشکلات سے اور اپنی ذمہ داریوں سے اصول و ضوابط کے تحت عہدہ براء ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے دوسری طرف خلوص سے راہ بتانے والے کو اچھا ساتھی قرار دیا۔ گویا بے خوف اور پر اعتماد شخص ایک ایسی مضبوط شخصیت کا حامل ہوتا ہے جو ایک اچھا ساتھ اور مضبوط سہارا مہیا کر سکتا ہے دوسروں کو خوف سے نکلنے کی راہ دکھا سکتا ہے۔ اعتماد کا فقدان خوف کا باعث ہے اور خوفزدہ شخص اندر سے کمزور ہوتا ہے۔

ان دونوں طرح کی شخصیات کو قرآن حکیم شجرۃ طیبہ اور شجرۃ خبیثہ کی مثال سے واضح فرماتا ہے۔

شجرۃ طیبہ :- وہ درخت جس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی ہیں۔ تنا سیدھا اور مضبوط اور شاخیں گھنی ہوتی ہیں۔ ایک مضبوط شخصیت کے حامل شخص کی' زندگی بنیادی اصولوں (Fundamental Principles) پر استوار ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔ جس طرح ایک مضبوط' گھنا درخت سایہ

مہیا کرتا ہے تنے سے ٹیک لگا سکتے ہیں۔ شاخوں پر گھر بنا سکتے ہیں دھوپ اور بارش سے پناہ لے سکتے ہیں پھل کھا سکتے ہیں غرض بے تحاشا فوائد ہیں۔ اس کے برعکس،
شجرۂ خبیثہ :۔جس کی جڑیں زمین میں گہری نہیں ہوتیں۔ جیسے گھاس' ہر کوئی اس پر سے گزر جاتا ہے۔ ذرا سی حالات کی سختی اور حادثہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ جو خود کمزور ہوں دوسروں کو سہارا نہیں دے سکتے۔

(ضمناً عرض کرتی چلوں ماہر نفسیات کی دوران تربیت اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرے اور شخصیت کا اعتماد اور خلوص Develop کیا جائے تاکہ مریضوں کی مدد اچھے طریقے سے کی جائے):

حضرت دامت برکاتہم کے یہ چند سادہ جملے نفسیات کی دنیا کی اہم حقیقتیں کھول رہے ہیں۔ اب سوال اس سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ نفسیاتی مریضوں میں High Relapse rate کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کیا یہ ماہرین نفسیات کی اپنی ذات کی اصلاح کی طرف اشارہ کرتا محسوس نہیں ہوتا کہ نفسیات دانوں کو اپنی شخصیت مضبوط بنانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ دوسروں کی مدد کر سکیں اور ایک مفید معاشرے کی تکمیل میں اپنا مفید کردار ادا کر سکیں۔

نفسیاتی مریضوں کی صحت یابی کا یہ انتہائی کم تناسب ایک اور طرف بھی اشارہ کر رہا ہے وہ یہ کہ موجودہ نفسیات زندگی کے جن اصول و ضوابط کو Advocate کر رہا ہے اسکی جڑیں انسانی زندگی میں گہری نہیں ہیں جو انسان کو ایک مضبوط شخصیت کا حامل شخص بنا سکیں۔ وہ کون سے اصول و ضوابط اور حقوق و فرائض کا کون سا نظام ہے جس کی جڑیں گہری ہیں اور اس کو اپنا کر ہی معاشرے کو مضبوط شخصیت کے حامل افراد مہیا کیے جا سکتے ہیں ؟ ایک مضبوط نظام صرف ایک مضبوط ہستی ہی دے سکتی ہے اور وہ ذات پاک جس نے اس کائنات کا نظام اس قدر مربوط و مضبوط بنایا ہے کہ ایک

لمبے عرصے سے اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہی انسانی زندگی کے اصول و ضوابط (اس کائنات کا ایک حصہ ہوتے ہوئے) اس کو درست وضع دے سکتے ہیں اور اس مضبوط ہستی کا ساتھ ہی انسانوں کو مضبوطی مہیا کرتا ہے کہ وہ اس راہ پر چل سکیں۔ انسانوں کو اس مضبوط و کامل ہستی کی ضرورت ہے۔ اور اللہ رب العزت' اس کائنات کا خالق و مالک ہی وہ ذات پاک ہے جس کا ساتھ انسانوں کو مضبوط سہارا مہیا کرتا ہے۔ بنیادی حقوق و فرائض کا نظام جو اس ذات پاک نے اس عظیم ہستی کو دے کر بھیجا جس کا تعلق اسکی ذات سے سب سے زیادہ مضبوط ہے یعنی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کی تعلیمات پر عمل کر کے ہی ایک مضبوط معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔

اس کی مثال ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی ایک ایسے معاشرے میں ملتی ہے جس کا ہر فرد دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرتا ہے۔ خیر خواہی کرتا ہے۔ ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثالیں قائم کرتا ہے۔ "مومن و کافر کے حقوق کا یکساں خیال رکھتا ہے۔ پھر مسلمانوں کے زوال کو دیکھیں تو زندگیاں اس لائحہ عمل سے جو آپ' کا بتایا ہوا ہے' ہٹتی نظر آتی ہیں اور بے سکونی' بے چینی۔ ڈیپریشن اور ذہنی بیماریاں بڑھتی نظر آتی ہیں۔

جو ہٹ کر چلیں تیری راہوں سے آقاؐ
مقدر میں ان کے ہے واہی تباہی

اور وہ لوگ جو ہر دور میں اسی راستے کے مسافر رہے۔ انتہائی نا مساعد حالات میں انسانیت کو اس پستی سے نکالنے کا باعث بنے جو اس راستے سے ہٹنے والوں کا مقدر بن جاتی ہے۔

دسمبر ۱۹۹۵ء میں حضرت کے دورہ برطانیہ کے دوران مجھے بہت قریب سے

سے حضرت کو دیکھنے کا موقع ملا میں نے انھیں بے حد شفیق پایا۔ پڑھائی کی بات پوچھا' حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور پڑھنے کا ایک بہترین نسخہ بھی عطا فرمایا جس سے مجھے تنقیدی زاویہ نگاہ سے لٹریچر کو پڑھنے میں مدد ملی۔ فرمایا ایک مرتبہ کہانی کی طرح پڑھ جاؤ' اور دوبارہ اسے اچھی طرح پڑھو۔ تعلیمی نفسیات کے ماہرین اس طریقے سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اپنی Definition درست کرنے کی تلقین بھی فرمائی۔ اس ایک بات نے زندگی کے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ ایمان و یقین سے لے کر معاملات ' مشکلات ' تحقیق ہر جگہ یہ بات بنیادی حیثیت کی حامل پائی۔ یعنی ہر چیز ' زندگی کے ہر aspect کو درست زاویہ نگاہ سے دیکھنا اور حقیقت کو جاننا ایک کامیاب اور پُرمسرت زندگی کی ضامن ہے۔

زندگی میں جب کبھی کسی مشکل وقت میں گھبراہٹ اور بے چینی کا شکار ہوئی۔ اسکی بنیادی وجہ کوئی نہ کوئی غلط فہمی۔Misjudgement تھی۔ بہت سی باتیں جو معاشرے سے سیکھیں تھیں ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اچھی بات پر عمل کرنا اس لیے مشکل تھا کہ اس معاشرے کے رسوم و رواج نے مشکل بنا دیا تھا۔ مگر جب حقیقت میں احکامات کا مطالعہ کیا تو وہ سادہ اور آسان پائے۔ کسی بھی شے کی حقیقت انسان درست طور پر سمجھ لے تو انسان کی زندگی سے شک نکل جاتا ہے۔ اس علم کا ہونا ایمان میں زیادتی کا باعث ہوتا ہے اور شک ایمان ؛ یقین کے منافی ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیقات کے مطابق نفسیاتی امراض کی جڑ شک ہے۔ شک انسان میں تشویش anxiety' Depression اور دیگر امراض کا باعث ہوتا ہے۔ شک سے انسان کی قوت فیصلہ متاثر ہوتی ہے۔ جو شخصیت میں کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ قوت فیصلہ کے فقدان کی وجہ سے ذہنی پریشانی پیدا ہوتی ہے اور خود اعتمادی پر زد پڑتی ہے اپنے فیصلوں کے لیے وہ دوسروں کی طرف دیکھتا ہے۔ اپنی منزل کی

طرف بڑھنے سے جھجھکتا ہے۔دوسروں میں اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور معاشرے پر ایک بوجھ بن جاتا ہے' آہستہ آہستہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ پھر ذرا سی مشکل اس کمزور شخصیت کو ڈھانے کے لئے کافی ہوتی ہے

ہر چیز کو اس کے تناظر میں دیکھنا اس چیز کا زندگی کے باقی شعبوں سے اسکا تعلق واضح کر دیتا ہے اور ایک صحیح سوچ صحیح عمل اور مضبوط تعلق کی اساس ہے۔ گویا اللہ اور اس کے بندوں سے درست اور مضبوط تعلق کی بنیاد خود تعلق کی definition پر منحصر ہے۔ انسان جس طرح زندگی کو Define کرتا ہے ویسی ہی زندگی گزارتا ہے۔ اس بات سے علم کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

اب میں نے حضرت کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ ان کا بات چیت کا انداز' لوگوں سے میل جول' معمولات محسوسات وغیرہ۔ بیسیوں لوگ ملنے آرہے ہیں' ہر کوئی مسئلہ' پریشانی لے کر آتا ہے بلا کا تحمل ہے۔ نہ پیشانی پر بل' نہ چہرے کی بشاشت اور لہجے کی تازگی میں کوئی کمی دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لیئے اپنے آرام کی قربانی۔ دوسروں کو بغیر Judgement کے قبول کرتے ہیں کسی آنے والے کو مایوس نہیں لوٹاتے۔

مرض پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اعتماد اس درجہ کا کہ کسی کی دولت یا Status سے متاثر ہوئے بغیر سچی اور کھری بات کہتے ہیں۔ ہر ایک کا حوصلہ بڑھاتے محبت اور شفقت کے موتی لٹاتے انتہائی خلوص سے مشورہ دیتے ہیں۔ Organization اور ڈسپلن انتہائی درجہ کا۔ اوقات مقررہ کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ اپنا کام خود کرتے ہیں۔ ہر قسم کی شدید مصروفیت اور شدت کی بیماری کے باوجود کسی قسم کی شکایت نہیں کرتے نہ تھکن کا اظہار کرتے ہیں۔

انتہائی جامع اور مختصر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر نہایت قوت سے بیان کر دیتے

ہیں دوسروں کی عزت نفس کا اسقدر خیال رکھتے ہیں کہ تکلیف پہنچنے کے باوجود شرمندہ نہیں کرتے درگزر کرتے اور احسان کرتے ہیں۔ علم کا ایسا اتھاہ سمندر کہ لوگوں کی سمجھ کے مطابق ان سے کلام کرتے ہیں اور انھیں کے شعبے کی مثال دیتے نظر آتے ہیں ہر خلوص سے آنے والا مختصر مدت میں حضرت کے حسن اخلاق کا مداح اور آپ کی شخصیت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ نہ صرف حضرت کا گرویدہ ہوتا ہے بلکہ حضرت کے پاس آنے والے ایک دوسرے کا نام پتہ جانے بغیر ایک دوسرے کے لیے مجسم ایثار و قربانی' سراپا محبت اور بہترین خیر خواہ بن جاتے ہیں خلوص سے کہی گئی چھوٹی سی بات کی انتہائی قدر کرتے ہیں۔ علم کی قدر اور رائے کا احترام کرتے ہیں بہت سے اور پہلو ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔

علم نفسیات کا بھی یہی مقصد ہے کہ انسان جو معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی درجہ کے مفید انسان ہوں Psychological Theories ایسے انسانوں کی بات تو کرتی ہیں مگر Therapy سے ایسا ہوا تو نہیں کہ اس اعلیٰ درجے کی خصوصیات دیکھنے میں یا پڑھنے میں آئی ہوں مگر حضرت کی صحبت سے جلدی تبدیلی کیسے آتی ہے؟ کیا عوامل کارفرما ہیں؟

سوال ابھرتے چلے گئے۔ دل نے کہا یہی اصل نفسیات ہے۔ مگر یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ کیسے حضرت کے پاس آنے والے اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ ایسا کیسے ہوتا ہے کہ جو سوال میرے ذہن میں ہوتے ہیں بغیر پوچھے حضرت اس کا جواب ارشاد فرمادیتے ہیں۔ حضرت کی چند لمحوں کی صحبت' چند لمحوں کی گفتگو کیسے مجھ میں تجلی بھر دیتی ہے جو کام بہت مشکل لگ رہا ہوتا ہے آسان لگنے لگتا ہے کیسے ان کی بات ماننے میں ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے؟ کیسے اپنے مسائل لکھ کر خط پوسٹ کرتی ہوں تو جواب آنے سے پہلے جواب مل جاتا ہے جس کی تصدیق بعد میں آپ کے خط سے

ہو جاتی ہے۔سوالات کی بھر مار تھی۔جو اب آیا آپ علم نفسیات کی Definition ٹھیک کریں منصب رسالت؛ آپ کو علم نفسیات کی تعریف اور ماہر نفسیات کا کام بتاتا ہے۔"منصب رسالت یہ ہے کہ وہ بندے کو اللہ سے آشنائی دے اور بندے کو بندوں کے ساتھ رہنے کا سلیقہ سکھائے۔نبی اکرمؐ نے عقیدہ' عبادات بھی عطا فرمائیں اور حقوق و فرائض کا وہ لازوال نظام بھی عطا فرمایا جس نے ثابت کر دیا کہ اگر دنیا میں کسی خدا کے منکر کا یا کافر کو بھی جان ومال و آبرو کا تحفظ نصیب ہوا تو اس نظام کے زیر نگیں آکر ہوا۔"

گویا منصب نبوت اللہ سے لوگوں کو آشنا کر کے ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں بندوں کو بندوں کے باہمی حقوق و فرائض کا علم ہو اور اسے معاشرے پر لاگو کیا جائے تاکہ ہر فرد و بشر سکون و اطمینان سے باہمی یگانگت کے جذبے کے تحت زندگی گزار سکے۔

"دنیا میں صرف حقوق و فرائض کی پہچان ہی کافی نہیں بلکہ ان کو ادا کرنے کے لیے قوت چاہئے اور وہ قوت اللہ کے ساتھ تعلق سے نصیب ہوتی ہے۔یہی فرق ہے شریعت اور طریقت میں حضرت نے فرمایا۔

"شریعت مکتبہ فکر کا خاص طریقہ ہے جس میں زندگی کے رولز بیان ہوں اور عمل میں خلوص حاصل کرنے کے لیے کیا حیلے کئے جائیں یہ طریقت ہے۔انسان اس کائنات میں منی کائنات ہے جو نظام اور جو ترتیب اور عوامل کائنات میں کارفرما ہیں وہی انسان میں بھی ہیں جس طرح کائنات ایک Organised System کے تحت چل رہی ہے شریعت انسان کو اعمال کا وہ سسٹم مہیا کرتی ہے مگر اس کائنات کے نظام کو خوبی سے چلانے کے لیے طریقت کی ضرورت ہوتی ہے انسان مادے اور روح سے مل کر بنا ہے۔روح ایک بلڈنگ ہے اور یہ انسان کے کردار

سے تعبیر ہوتی ہے۔ شریعت اس کی تعمیر کے طریقے اور اینٹیں گارا اور مادی دنیا میں عمل کے طریقے ہیں طریقہ صحیح ہوگا تو تعمیر بھی درست ہوگی۔

Physical Structure مومن و کافر کا یکساں ہے۔ صحیح کھانا کھانے سے دونوں کی صحت درست رہے گی اگر کافر معاشرہ وہ اصول اپنالے جس سے ایک عمدہ معاشرہ تکمیل پاتا ہے تو معاشرہ مضبوط ہوگا یہ Physical act اگر مومن Opposite کرے گا تو تباہ ہوگا۔

عمل کے لیے انسان کو اللہ نے شعور عطا فرمایا ہے۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق ہی شعور کا ہے۔ جانور اپنے فطری اطوار سے مغلوب ہوتا ہے انسان راستہ تلاش کرتا ہے۔ خواہشات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ درست راستہ اختیار کرتا ہے اور غلط سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔

جانور کو بھوک لگے تو جو ملے کھالیتا ہے۔ انسان انتظار کرتا ہے کہ خوراک صحیح ہو۔ صحیح طرح حاصل کی گئی ہو۔ کسی دوسرے کا مال نہ اڑایا جائے جائز طریقے سے حاصل ہو۔ اسی طرح Bound sex ہے یہ مہذب راستہ ہے جو انسانی شعور کو اپیل کرتا ہے انسان خواہشات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ نسل انسانی کی افزائش اس کا مقصد ہے۔ اگر حدود ہٹادی جائیں تو حیوانیت آجائے گی۔ انسان اگر صرف ضرورت پوری کرے تو وہ حیوانیت کی سطح سے بھی نیچے آجاتا ہے۔ زندگی اور معاشرے کی تعمیر صرف اس وقت ہوتی ہے جب انسان شعور سے زندگی گزارے۔

نبیؐ کی شریعت پر عمل کرنے کے لئے برکات نبویؐ کا حصول ضروری ہے۔ جو Urge کو بدل دیتی ہیں۔ Depth of heart میں جہاں خواہش جنم لیتی ہے خواہش بدل گئی تو Suttle Heart میں تبدیلی آئی۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو پہلے لوٹ مار کر خوش ہوتا ہے اب دوسروں کو کھلا کر خوش ہوگا۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اسلام کی تہذیب خود اسلام ہے۔ ایمان لانے سے مٹی کھودنے تک سارا دین ہے۔ یہ نہ صرف انسان کو اللہ سے آشنا کرتا ہے بلکہ معاشرے میں زندگی گزارنے کی حدود و قیود متعین کرتا اور عمل کے لیے خلوص مہیا کرتا ہے۔ یہی انسان کو سکون مہیا کرتا ہے"

حضرت مدظلہ العالی سے جب بے سکونی کی وجہ دریافت کی تو آپ نے تین باتیں ارشاد فرمائیں۔

1-Conflict :-"مثلاً توقعات کا زیادہ ہونا اور عمل کا اسے meet نہ کر سکنا۔ مثلاً توقع ہے کہ بہت دولت مند ہو جاؤں مگر کام کم کرے۔ تو یہ imbalance اس میں کمزوری پیدا کرتا ہے۔

2-نفس کو مارنا :-یعنی برے خیال آنے پر اس جذبے کو کچل دینا کیونکہ اس سے Urge پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی فعالیت کو کم کر دیتی ہے"

3-جسمانی کمزوری :-سارے عمل کو کمزور کر دیتی ہے۔ کمزور انسان شیطان اور جنات کے حملوں سے بچ نہیں سکتا۔ وساوس Tension اور پاگل پن کا شکار ہو جاتا ہے۔

تینوں صورتوں میں جسم و روح میں عدم توازن انسان میں کمزوری اور بے سکونی پیدا کر دیتی ہے۔ تینوں صورتیں خالق کائنات سے ناآشنائی کا نتیجہ ہیں۔ تینوں صورتوں میں منصب رسالتؐ سے ناواقفیت یا بے توجہی ظاہر ہوتی ہے۔ منصب رسالتؐ جو عقیدہ عبادات کے ساتھ حقوق و فرائض کا بے مثال نظام عطا کرتا ہے۔ جس میں انسان' عرفان ذات۔ اپنی ذات جس میں نفس اور جسم کے حقوق تک شامل ہیں۔ ان تمام باتوں کا علم ہی کافی نہیں دل کا نور نبوتؐ سے روشن ہونا ضروری ہے جو عمل میں اخلاص اور آسانی کا باعث بنتا ہے۔

اپنی ذات ہی کے مطالعے سے یہ بات میرے سامنے آئی کہ تمام نفسیاتی امراض کی جڑ "ایمان باللہ" کا نہ ہونا یا کمزور ہونا ہے۔ جس کو جس درجے کا اعتماد یا یقین اللہ پر حاصل ہوگا اسی درجے کی شخصیت کی مضبوطی حاصل ہوگی۔

طبیعت میں سکون اور خوشی اسی نسبت سے حاصل ہوگی۔ ذکر اللہ اس یقین و ایمان کی کیفیات کو زیادہ کرتا ہے صرف اس وقت جب اسے صرف اللہ کی خوشنودی' یقین اور سکون کی کیفیات حاصل ہوں گی وہ غفلت برتنے یا مفادات کی ملاوٹ سے بے چینی' گھبراہٹ' اداسی' مایوسی' اور رشک سے تبدیل ہو جائیں گی جس سے نہ صرف فرد کی ذات متاثر ہوگی بلکہ اسکے فرائض کی ادائیگی میں خلل آئے گا اور لوگوں سے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوگا اور یوں معاشرے میں ایک بگاڑ پیدا ہوگا۔

اللہ کا ذکر انسان کو اپنی اور خالق دونوں کی پہچان عطا کرتا ہے۔ خالق و مخلوق کے تعلق کو واضح کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق غافل دل پر ایک پردہ ہوتا ہے اور دل زنگ آلود ہوتا ہے تو وہ صحیح بات کو نہ دیکھ سکتا ہے نہ درست بات سن سکتا ہے اور نہ ہی درست سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ ہر چیز دھندلی ہوتی ہے بلکہ اسی طرح جیسے اگر ہم کسی چیز کی تصویر لینا چاہیں تو کیمرے کو فوکس کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے Lense کو ایک سمت میں کچھ قوت کے ساتھ گھمانا پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ چیز واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے جب ایک نقطے پر جا کر ہر چیز واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اس چیز کا روشنی میں ہونا ضروری ہے۔ اللہ کے ذکر سے دل سے پردہ ہٹتا اور روشنی آتی ہے۔ شیخ کی صحبت میں ہمیشہ Direction (سمت) اور قوت (Force) سے چیزوں کو میں نے Focus میں آتے دیکھا ہے۔ واضح ہوتے دیکھا ہے۔

جب روشنی میں ہر چیز اپنے تناظر میں نظر آتی ہے تو اپنی زندگی کی

Disorganization گندگی سب نظر آنے لگتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس روشنی میں یہ بھی علم ہونے لگتا ہے کہ تنظیم ممکن ہے اور کس طرح ممکن ہے۔ بے ترتیبی کیونکہ انسانی فطرت کے خلاف ہے تو فطری طور پر انسان زندگی میں ترتیب لانے کی کوشش کرتا ہے اگر اسے گندگی نظر آتی رہے اور وہ اسے صاف نہ کرے اور غیر منظم چیزوں کی تنظیم نہ کرے تو ذکر کرنے کے باوجود اسکی شخصیت میں تبدیلی نہیں آتی جو کہ بے سکونی کا باعث ہوتی ہے۔ تنظیم بندی کے یہ اصول اسے شریعت مطہرہ سے پتہ چلتے ہیں۔ مگر جو شخص بھی اس کے لیے عمل شروع کر دیتا ہے تو اپنی ذات اپنے حلقے کی صفائی اور تنظیم کے بعد وہ آس پاس کی تنظیم خود بخود کرنا چاہتا ہے کہ فطرت تنظیم کا تقاضا کرتی ہے دوسروں کی مدد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس طرح یہ دائرہ انسان کی ذات سے بڑھ کر اپنے خاندان' ارد گرد کے لوگوں، دوست احباب' شہر، ملک اور پھر ساری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ فرد نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی Support مہیا کرتا ہے ایک بہتر مستقبل اور بہتر معاشرہ ترتیب پاجاتا ہے۔

اللہ کے ساتھ تعلق کی اہمیت جو مجھے سمجھ آئی وہ یہ تھی کہ اگر صرف گندگی اور Disorganization گناہ' نافرمانی وغیرہ انسان کو نظر آئیں مگر اسے اللہ کی معیت اور رحمت کا احساس نہ ہو یہ اس میں خوف پیدا کرتا ہے جو بے سکونی کا باعث ہوتا ہے۔ نفسیات کی عمومی Relaxation کی Exercises انسان کے ذہن کو فوکس عطا کرتی ہیں اور اسے اپنی زندگی میں بے ترتیبی کا احساس بھی دیتی ہیں مگر اللہ کی رحمت کا احساس اور اس بے ترتیبی کو دور کرنے کا حوصلہ عطا نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ مریضوں میں ایک level پر جا کر جمود طاری ہو جاتا ہے اور وہ کوشش کے باوجود اپنی عادات کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

جب اللہ کے ذکر سے دل میں نور آتا ہے اور شیخ کی صحبت قرآن و سنت کی روشنی میں انسان کی سمت کو اللہ کی طرف بدلتی ہے تو جہاں گناہ کا خوف ہوتا ہے دوسری طرف اللہ کی رحمت کی امید ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ جب ذات کی Organ-ization قرآن و سنت کے مطابق ہونے لگتی ہے تو گناہ چھٹنے لگتے ہیں اللہ سے محبت بڑھتی ہے اور پھر اللہ کی محبت کے چھوٹ جانے یا کم ہو جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ اور اس کی رحمت کی امید نیک اعمال کی طرف رہنمائی کرتی اور قوت عطا کرتی ہے۔

یعنی زندگی میں ایک Balance آجاتا ہے۔ Balance انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتا ہے اور پھر اس کی جڑیں زمین میں مضبوط ہو جاتی ہیں اس کے بعد وہ معاشرے کے دوسرے افراد کے لیے ایک مضبوط سہارا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت سے اس عمل کے بارے میں دریافت کیا کہ بہت کم الفاظ میں بہت قوت کیسے Transfer کر دی جاتی ہے۔ کس طرح بات کر کے انسان عمل کے جذبے سے سرشار اور قوت محسوس کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا:-

"روح کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ جسمانی نظام کو الفاظ کے تبادلے کے لئے واسطے یا Medium کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ روح دوسرے شخص کی روح سے بغیر کسی واسطے کے پیغام وصول کر لیتی ہے۔ روح لمبی چوڑی زبان میں بات نہیں کرتی بلکہ

"Spirit conveys the essence to the other spirit"

اس بات سے وضاحت ہوئی کہ محبت کس طرح کام کرتی ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ انسان میں جس قدر قوت ہوتی ہے دوسرے کو اتنا ہی متاثر کرتی ہے۔ ماہرین نفسیات جو کام سالوں میں نہیں کرتے۔ نبیؐ کے امتی، روشن دل کے مالک لوگ لمحوں میں نگاہوں میں کیسے کر ڈالتے ہیں۔

یہ قوت اللہ پر ایمان کے ساتھ۔اللہ کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے اور یہ صحبت میں وہ اثر نگاہ کو وہ قوت عطا کرتی ہے جو ہر آنے والے کا دل روشن کر کے اسے اپنے احوال سے آگاہ ہونے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔اور اسے بھی وہ قوت عطا کرتی ہے کہ وہ اس برے حال سے ایک بہتر اور پر سکون زندگی کی طرف اپنا سفر شروع کر سکے۔

انفرادی طور پر اشخاص کی شخصیت و کردار میں تبدیلی پھر معاشروں کی تبدیلی کا سبب بن جاتی ہے۔

ماہرین نفسیات کا کام بے حد اہم اور نازک ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی ذات کی اصلاح کریں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی Disorganiza-tion کو دور کریں' اپنے دلوں کو اللہ کے نور سے روشن کرنے کے لیے ہم خود روحانی علاج کے iustitutions میں پہلی جماعت میں داخلہ لیں۔اپنی شخصیت کے درخت کی جڑیں دین اسلام کے مضبوط اصولوں پر عمل کر کے مضبوط کریں تاکہ معاشرے کی ایک مضبوط بنیاد بنانے میں فعال کردار ادا ہو سکے۔ذکر اللہ کی مدد سے 'نور نبوتؐ سے دل روشن کر کے پھر قرآن و سنت سے وہ نفسیاتی اصول وضع کریں جس سے مضبوط شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔"معاشرے سے ابتری دور کرنے کے لیے بھی ماہرین نفسیات کا کردار اہم ہے۔کیونکہ موجودہ طریقہ علاج کے تحت مریض جب صحت یابی کے بعد اسی معاشی اور معاشرتی طور پر ناہموار ماحول میں جاتا ہے تو اس کے دوبارہ مریض بننے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔انفرادی کوششوں کے علاوہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان معاشی' معاشرتی' تعلیمی ناہمواریوں اور بے انصافی اور بدامنی کے خلاف صف آرا ہو کر ایک بہتر اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے جدوجہد کی جائے کیونکہ

مسلمان کو جب اللہ کی جانب فوکس اور اس سے محبت کا تعلق نصیب ہوتا ہے تو وہ صرف اپنی بہتری کے لئے کام نہیں کرتا بلکہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کو Sup-port system مہیا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے تاکہ ہر فرد و بشر کو انصاف، تعلیم، معاش کے ذرائع اور امن مہیا ہو سکے۔

نفسیات کی مختلف Theories کے مطابق بھی انسان عرفان ذات کے اعلیٰ مقصد کی طرف تب ہی متوجہ ہوتا ہے جب اس کو بنیادی ضروریات یعنی، معاش، امن اور انصاف مہیا ہو۔ اگر بنیادی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں تو فرد کی De-velopment اس ایک نقطے سے آگے نہیں ہو پاتی۔ پھر یہ افراد جب معاشرے کے لیے بیج کی حیثیت رکھتے ہوں تو معاشرے کا بالکل وہی حال ہوتا ہے جو اس وقت ہمارے معاشرے کا ہے۔

معاشرے کو سنوارنے کی یہ عملی جدوجہد اس معاشرے کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوگی جہاں ہر کافر و مومن کو یکساں انصاف مہیا ہوتا ہے۔ اسلامی نظام ہی کامل طور پر یہ مقاصد پورے کرتا ہے اور اس نظام کو ملک عزیز میں مہیا کرنا بنیادی مقصد ہے۔ جس سے فرد صحت یاب ہو کر جب پر امن معاشرے میں واپس جائے گا جہاں اس کی جان، مال، عزت و آبرو محفوظ ہوگی تو اس کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں گے۔

حضرت مدظلہ العالی کی روحانی یونیورسٹی خوبی وہ بے مثال لوگ تیار کر رہی ہے جو ان کی صحبت میں اپنے دلوں کو روشن کرتے، اپنے کردار کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالتے اور معاشرے کی صحت یابی کے لیے اپنی تمام کوشش صرف کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت کی نگاہ عالیہ دلوں کو وہ قوت عطا کرتی ہے جو عملی زندگی میں خلوص اور قوت عطا کرتی ہے اور اپنے اندر، اور آس پاس کی صفائی پر انسان

اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔

حضرت کے ارشادات عالیہ کی روشنی بے مثال ہے جس میں ہر شخص اپنے کردار کو خوبی پر کھ سکتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں منہ سے نکلی ہر بات دلوں کو متاثر کرتی چلی جاتی ہے۔ اللہ کریم حضرت مد ظلہ کا دست شفقت و سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور ہمیں ان کی جوتیوں کے طفیل اپنی زندگیاں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرز پر گزارنے کی توفیق عطا فرمائے ان لوگوں کی طرح جنہوں نے انسانیت کو اپنے کردار سے متاثر کیا اور ایک زمانے سے ظلم و جور مٹا کر عدل وانصاف اسلامی کی دولت سے کافر و مومن کو یکساں مالا مال کیا۔

خصوصاً ہم ماہرین نفسیات کو حضرت سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم ایک مضبوط معاشرے کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کر سکیں۔ مرشد کامل ایک نگاہ نفسیات اور نفسیات دانوں پر بھی۔

....اور کچھ نہیں ہوا۔

کرنل سلطان

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان کے ساتھ میرا پہلا رابطہ 1981ء میں ہوا۔ حضرت کی جس صفت سے میں حد درجہ متاثر ہوا' وہ آپ کا قرآنی آیات کی تشریح کا ایک منفرد طرز بیان تھا۔ حضرت کا معمول ہے کہ آپ منبر پر تشریف رکھتے ہی قرآن شریف اٹھاتے ہیں۔ ایک دفعہ چومتے ہیں اور جدھر سے کھل جائے تلاوت کر کے بیان شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا بیان ہمیشہ ہی نہایت فصیح مدلل اور تقریب کی عین مناسبت سے ہوتا ہے۔ میں نے کبھی بھی حضرت کو ورق گردانی کرتے یا کوئی مخصوص سورت یا آیت کی تلاش میں ورق پلٹتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ قرآن شریف کا نسخہ عموماً مقامی مسجد یا رہائش گاہ وغیرہ کا ہوتا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور موقع پا کر پوچھ لیا' حضرت نے نہایت مختصر جواب دیا کہ ''یہ زندہ کتاب (قرآن عظیم الشان) ہے اور وہاں سے کھلے گی جہاں پڑھنے والے کی نیت ہو گی۔ حضرت کا یہ امتیازی طرز بیان ایک زندہ کرامت ہے حضرت کے حکم کے مطابق آپ کا بیان آپ

کی طرز گفتار کے عین مطابق' حرف بحرف لکھا جاتا ہے۔ خواہ اس میں اردو ادب کی غلطیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ جسارت عہد حاضر کا کوئی عالم دین ہی کر سکتا۔ ذیل میں دو واقعات کا ذکر کروں گا جن کا تعلق فقط میری ذات سے ہے۔

پہلا واقعہ 1994ء کا ہے۔ میں ان دنوں افغانستان کے مغربی شہر ہرات میں کونسل جنرل تھا۔ مجھے حکومت کی طرف سے احکام ملے کہ پاکستان اور ترکستان کے مابین تاریخی راستے پر پہلے تجارتی قافلے کی قیادت کروں۔ یہ قافلہ کوئٹہ میں تیار ہوا۔ جہاں سے قندھار اور ہرات سے ہو کر بخارہ (ازبکستان) اور اشک آباد (ترکمانستان) تک جانا تھا۔ اور راستے میں آٹھ بڑے شہروں کے تحائف لے جانے تھے۔ افغانستان میں خانہ جنگی کی وجہ سے مرکزی حکومت کا عمل دخل نہیں تھا۔ اسلیئے مجھے مقامی لوگوں سے رابطہ کرنا پڑا۔ تاکہ قافلہ بحفاظت گزر سکے۔ انہی دنوں افغانستان میں طالبان کی اسلامی تحریک معرض وجود میں آئی تھی۔ جس کا مرکز قندھار شہر کے اطراف میں تھا' اس سلسلے میں مجھے حضرت ملا محمد عمر مجاہد (موجودہ امیر المومنین افغانستان) سے بھی ملنا پڑا۔ حضرت ملا صاحب نے مشورہ دیا کہ قافلہ چند دن تاخیر سے چلے' کیونکہ قندھار کے اطراف میں جنگ کا خطرہ تھا۔ اس کے برعکس حکومت پاکستان کی خواہش تھی کہ کارواں یکم نومبر کو اشک آباد پہنچے۔ کیونکہ وہاں ترکمانستان کا یوم منایا جارہا تھا اور بیشتر سربراہان مملکت مدعو تھے۔ مجبوراً مجھے قافلے کو 31 اکتوبر چلانا پڑا۔ اور خدشات کے عین مطابق قندھار شہر کے مضافات میں سابقہ کیمونسٹ ملیٹنٹ Communist Militant' کے لوگوں نے روک لیا۔ جن کی مدد کچھ مقامی مجاہدین بھی کر رہے تھے۔ یہ لوگ طالبان کے مخالف تھے اور پاکستان کے خلاف منفی پراپیگنڈہ کی وجہ سے نہایت اشتعال میں تھے۔ وہ حکومت پاکستان پر طالبان کی مدد کرنے کا الزام لگا رہے تھے۔ حالانکہ اس وقت تک حکومت

پاکستان کو طالبان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ بہر کیف میں نے اپنے سابقہ تعلقات کا سہارا لیتے ہوئے ان لوگوں کے ساتھ مذاکرات کئے جس سے ان کے غصے میں کمی ہوئی۔ مگر وہ قافلے کو کسی حالت میں چھوڑنے پر راضی نہیں تھے اور نہایت سختی سے اپنے موقف پر قائم تھے آخر کار میں قافلے سے دست بردار ہو کر قندھار پہنچا اور حکومت پاکستان کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ کوشش جاری رکھی کہ قافلے میں شامل تقریباً 100 افراد کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچے۔ میں نے غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے ہر چارہ آزمایا اور حکومت پاکستان کے قافلے کو اس طرح روکنے کے دیگر مضمرات سے افغانوں کو آگاہ کیا۔ تین دن کے لگاتار رابطے سے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ تمام افراد اور گاڑیوں کو یکجا رکھنے کی یقین دہانی ہو گئی۔ لیکن قافلے کی رہائی کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔ مجھے یہ اطلاع ملی کہ قافلے کے افراد کو طالبان کے خلاف جنگ میں ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چوتھے دن میں بالکل مایوس ہو گیا، کیونکہ ان حالات میں حکومت پاکستان بھی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ بلکہ حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی حالات کو مزید بگاڑ دیتی۔ جب ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ حضرت مولانا کو ضرور اطلاع کرنی چاہئے۔ خوش قسمتی سے میری پاس سیٹلائٹ ٹیلی فون تھا۔ رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ حضرت منارہ سے اسلام آباد چلے گئے ہیں اور رات کو واپسی ہو گی رات کو رابطہ ہوا۔ میں نے تمام حالات سے حضرت کو آگاہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کی کہ حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ ان کا سلجھانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پورا قافلہ چار دن سے میدان جنگ میں رکا ہوا ہے جس کے دونوں طرف فریقین ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہیں۔ حضرت نے پوری بات توجہ سے سنی اور فرمایا کہ فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے لئے اتنا جواب اطمینان بخش تھا۔ لیکن

میں نے بے صبری سے مزید پوچھا کہ حضرت کب تک حالات ٹھیک ہوں گے جواب ملا کہ دو دن کے اندر اور حضرت نے دعائیہ الفاظ کے ساتھ ٹیلی فون بند کر دیا۔ میں پوری رات سوچتا رہا کہ حالات ٹھیک تو ہو جائیں گے مگر کس طرح۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ یا حل نظر نہیں آرہا تھا جس سے حالات ٹھیک ہو جائیں اور قافلہ صحیح سالم مخالفین کے نرغے سے نکل آئے۔ اس کے ساتھ ہی طالبان نے پیش قدمی شروع کر دی تو مخالفین نے قافلے کو فائر کی زد میں لا کر سامنے کھڑا کر دیا جونہی طالبان نے لڑائی کا آغاز کیا تو پہلی گولی کے ساتھ ہی تمام مخالفین بد حواس ہو گئے اور قافلے کو چھوڑ کو فرار ہو گئے۔ میں جب قافلے کے پاس پہنچا تو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمام گاڑیاں اور افراد صحیح سلامت ہیں۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد قافلہ منزل مقصود کی طرف چل پڑا۔ اور اس کے بعد واپسی تک مکمل خیریت رہی۔ میرے ساتھی افسران حیران تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ یہ صاحب کون ہیں جنہوں نے اطمینان سے دو دن کا عرصہ بتایا اور قافلہ دو دن کے بعد بغیر کسی نقصان کے آزاد ہو گیا یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ ظہور پذیر ہونے کے بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ 1998ء کا ہے جب حکومت ایران نے اپنی تمام افواج افغانستان کی مغربی سرحدوں پر لا کھڑی کیں اور کسی بھی وقت ایک نہایت ہی خونریز جنگ کا خطرہ تھا۔ میں اپنے دفتر میں سٹاف کے ساتھ ہرات موجود تھا۔ مجھے حکام بالا نے واضح کر دیا کہ خطرے کی صورت میں تمام عملے کو حفاظت نکالنا میری ذاتی صوابدید پر ہوگا یہ ایک اور خطرناک صورت حال تھی اور دن بدن اشتعال انگیزی میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ ہم لوگ دن رات طرح طرح کے منصوبے بناتے۔ جیسا کہ ہرات پاکستانی سرحد سے کافی دور تھا۔ اور زمینی راستہ ایسے حالات میں استعمال کرنا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ اور لڑائی کی صورت میں ہوائی راستہ بھی مکمل بند ہو

سکتا ہے۔ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا صاحب کو صورتحال سے آگاہ کروں ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ حضرت پشاور میں ہیں۔وہاں کا نمبر تلاش کیا اور آخر کار حضرت کے موبائل ٹیلی فون پر رابطہ ہو گیا۔ حضرت نے پوری تفصیل سنی اور فرمایا کہ تم نے اطلاع کر کے اچھا کیا ہے۔ فکر مت کرو کچھ نہیں ہو گا اس "کچھ نہیں ہوگا" کا مفہوم سمجھنے سے میں قاصر رہا۔ایک ہمسایہ ملک کے تمام سفارت کار مزار شریف میں مارے گئے۔اور وہ نہایت غصے کی حالت میں اپنی ۲ لاکھ سے زائد فوج لے کر سرحد پر چڑھ آیا ہو اور نہایت خطرناک دھمکیاں بھی دے رہا ہو تو کس طرح یقین آجائے کہ کچھ نہیں ہوگا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔
حالات کچھ ایسے بن گئے کوئی بھی خطرہ ہم تک نہ پہنچ سکا۔



”میرے ابو“

آسیہ اکرم اعوان

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہل دل
ہم لوگ وہ نہیں جن کو زمانہ بنا گیا

میں اپنی تحریروں کو عنوان نہیں دیا کرتی۔ لیکن آج مجھے لگا یہ خاص عنوان دیئے بغیر میں شائد ایک سطر بھی نہ لکھ پاؤں گی۔ بادی النظر میں تو یہ عنوان شائد پڑھنے والوں کی نظر میں غلط قرار پائے کیونکہ وہ صرف میرے ابو نہیں ہیں ہم سب بہن بھائیوں کے ابو ہیں اور مجھے سب کی طرف سے ان کے بارے میں ہمارے جذبات کا Representative مقرر کیا گیا ہے۔

لیکن انسان خود غرض واقع ہوا ہے اور اگر میرے اتنے سے اعتراف کے بعد یہ عنوان درست قرار پاتا ہے تو مجھے اقرار ہے میں خود غرض ہونے کی حد تک اپنے ابو سے وابستہ ہوں میری روزہ مرہ کی روٹین بلکہ ساری زندگی کا محور ان کی ذات ہے۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلا سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ ابو کہاں ہیں اور آج کیا کر رہے ہیں بلکہ ساری فیملی ہی کا یہی طریقہ کار ہے ان کے حساب سے ہماری روٹین

Set ہوتی ہے۔

جتنے روز وہ گھر پہ نہیں ہوتے اتنے روز خالی پن کا احساس تقویت پکڑ تا رہتا ہے ہر طرف بے رونقی سی رہتی ہے۔ لیکن ہر روز صبح ان کے فون سے ہوتی ہے۔ یہ ان کی ہمیشہ کی عادت ہے وہ کہیں بھی چلے جائیں چاہے ایک روز پہلے ہی سہی گھر پر فون ضرور کرتے ہیں اور جس طرح ان کی گاڑی گھر میں داخل ہوتے وقت ہم سب ہر طرف سے دوڑے آتے ہیں اسی طرح فون کے گرد گھیر ائنگ ہو جاتا ہے۔

اس طرح وہ ہمارے پاس نہ بھی ہوں تو ہمیں پتہ ہوتا ہے اس وقت وہ کس جگہ بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔

ان کی ذات مرکز کی طرح ہے اور ہماری زندگیاں محور جیسی اس کی دو بڑی وجوہ ہیں ایک تو یہ ہے کہ اس میں امی کی لاشعوری کوشش کا بہت عملی دخل ہے۔ وہ کچھ اسطرح کہ جہاں تک میری یاداشت میرا ساتھ دیتی ہے مجھے یہی یاد پڑتا ہے کہ امی نے ہر حوالے سے ابو کی ذات کو ہمارے لئے ایک Simble کے طور پر پیش کیا ہے۔

کسی چیز کو ترک یا اختیار کرنے کے لئے ہمارے پاس معیار ابو کی ذات ہوتی تھی۔ ہم میں سے کوئی جب اچھا کام کرتا' اچھی بات کہتا جس میں اس کی ذہانت کا اظہار ہوتا تو امی ہمیشہ یہی تعریف کرتیں۔ "یہ اپنے ابو پہ گیا ہے" یا "شکر ہے انہوں نے اپنے باپ کا مزاج پایا" بلکہ اب بھی یہاں تک کہہ دیتی ہیں۔ "شکر ہے مجھ پہ نہیں گئے"۔

لیکن یہ بات خاص ہے کہ اس چیز نے ہمیں ہماری ماں سے دور نہیں کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک امی ابو کوئی الگ سے دو انسان نہیں ہیں امی کی تعریف ابو کی تعریف ہے اور ابو کی صفت امی کی صفت ہے۔

اور میں یہ بات بھی جانتی ہوں بلکہ پورے وثوق سے یہ کہنے کی پوزیشن میں ہوں کہ ہمیں ابو کی ذات سے جوڑنے کی یہ کوشش ایک لاشعوری کاوش ہے اس میں کسی پلاننگ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ایک تو امی جیسی سادہ مزاج اور تک سیدھے مدے سے یہ سب کچھ عملاً کرنا بعید از قیاس ہے دوسرے میں سمجھتی ہوں ان کے اپنے نزدیک چونکہ ابو کی ذات 'سوچ' پسند' ناپسند ہی ہر شے کا معیار تھی تو انہوں نے ہمیں بھی یہی بات سکھائی۔

ہم اپنے ماں باپ کو جج نہیں کر سکتے۔انہوں نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟ قدرتی طور پر یہ بات ایک بچے کے ذہن میں اپنے والدین کے حوالے سے آتی ہی نہیں کیونکہ والدین کی خیر خواہی پہ ہمیں اندھا اعتماد ہوتا ہے اور دوسرے وہ ہماری زندگیوں کا حصہ ہوتے ہیں ان کی ذات کا الگ سے کوئی وجود ہمارے ذہنوں میں نہیں ہوتا۔

جو بات میں نے اوپر کہی ہے اس کا محرک میرا اپنا ادراک نہیں ہے بلکہ ایک دفعہ کسی نے میرے سامنے اس حوالے سے بات کی تو میرے ذہن نے اس پر سوچنا شروع کیا اور جو کچھ میں نے پایا وہ اب آپ سے کہہ دیا۔

ابو سے اس درجہ Attachment کی دوسری وجہ خود ابو کی ذات ہے۔وہ خود اپنے بچوں سے باپ ہو کر ماں جیسا پیار کرتے ہیں۔

اپنے ہر بچے سے وہ اس قدر قریب ہیں کہ ہمیں آج تک کوئی خواہش 'کوئی ضرورت اپنے منہ سے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ہمیں آج تک سب کچھ بنا کہے ملا ہے۔

پڑھائی میں ہم کوشش کرتے ہیں انہیں اچھی رپورٹ دیں کھانا نہ بھی کھانا ہو تو بہت دفعہ صرف اسلئے میز پر حاضری لگواتے ہیں کہ ان کے ذہن میں رہے گا اس نے کھانا نہیں کھایا۔وہ خود بہت بد مزہ ہوتے ہیں۔

بھائی کام سے 'واک یا شکار سے جب تک نہ لوٹے وہ انتظار کرتے ہیں۔ کھانے پہ سب کی موجودگی لازمی ہوتی ہے۔ ہماری کھانے' پینے' پہننے اوڑھنے سے لے کر شاپنگ اور سیر تک وہ خود ہر شے کا بندوبست کرتے ہیں۔

ان کے بغیر کہیں جانے کا ہمارے پاس کوئی concept نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہم اتنا پھرے ہیں کہ دور نزدیک کی کوئی وادی ہم نے نہیں چھوڑی۔ اب ہمارے لئے سب سے Exciting news کسی نئی جگہ کا Discover ہونا ہے۔

کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ابو کسی نئی جگہ کے بارے میں سنتے ہیں یا خود دیکھ کر آتے ہیں تو ہمارے لئے عید کا سماں ہوتا ہے Picnic کا سب سامان لے کر ہم دو دو گاڑیوں میں لدے پھندے جاتے ہیں۔

بہت دفعہ ان کے ساتھ شکار بھی کیا ہے۔ بیٹے تو شکار کا ایسے لازمی حصہ ہوتے ہیں جیسے بندوق۔ لیکن وہ ہمیں بھی لے جاتے ہیں ہمارے گھر میں بھی ایک اپوزیشن پارٹی ہے۔ قدیر بھائی۔ "وہ چلتا پھرتا کرفیو ہیں۔ بقول ان کے ہم اگر ساتھ ہوں تو شکار، شکار نہیں رہتا Picnic بن جاتا ہے"

لیکن ابو کہتے ہیں "اگر ہم انہیں ساتھ لے کر نہیں جائیں گے تو پھر یہ کس کے ساتھ جائیں گی؟"۔ ایک دفعہ کہا۔ "دیکھو وہ لوہے کا گیٹ ہے اگر میں انہیں باہر نہ لے کر جاؤں تو شاید مہینوں یہ باہر کی دنیا نہ دیکھیں۔ یہ بھی انسان ہیں ان کا بھی خوشی پہ حق بنتا ہے"۔

اور ان کی آواز بھر آگئی۔ وہ بہت جلد رو پڑتے ہیں۔ بہ یک وقت چٹان کی طرح سخت ہیں اور اپنی بات میں اٹل ہیں۔ اور کسی گلاب کی پتی کی طرح نرم ہیں جس پہ شبنم بھی گرے تو آنسو کا گماں ہوتا ہے۔

میں اس کے تصور میں یہ کہتا ہی رہوں گا

وہ شخص گلابوں کے جزیرے کی طرح ہے

شاید اسی بات کا ذکر قرآن نے بھی کیا ہے۔"اشد علی الکفار رحمہا بینھم۔"

بہت دفعہ ایسا ہوا کسی کی تکلیف کا ذکر ہوا تو رو پڑے' شعر کہا اور آواز ٹوٹ گئی۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کے لئے بہت بڑی ہوتی ہے۔ بلکہ الٹا حساب ہے بہت بڑی بڑی باتیں' حادثے' نقصان وہ بڑے آرام سے سہہ جاتے ہیں لیکن کسی چھوٹی سی بات پہ ان کا دل کتنا دکھا ان کی آنکھیں ان کی آواز سب بھید کھول دیتی ہیں۔

میں نے اپنے مزاج میں بہت سا حصہ اپنے ابو سے پایا ہے اسکا ادراک مجھے بہت سی باتوں سے ہوا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس لمحے جس بات پہ ان کا دل دکھتا ہے۔ عین اسی لمحے وہی بات میرے بھی دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔

دل یوں درد محسوس کرتا ہے کہ آنکھ بھر آتی ہے۔ میں انہیں دیکھتی ہوں وہ مجھے دیکھتے ہیں اور پھر ہم اپنا درد باقی سب سے چھپا لیتے ہیں آنکھ میں آئی نمی لوٹ جاتی ہیں اور ان کی ٹوٹی ہوئی آواز کا زور واپس آجاتا ہے۔

میں نے سارے کام ابو سے سیکھے ہیں۔ ڈرائیونگ اور شوٹنگ تو ہم سب نے ہی ابو سے سیکھی ہے اس لئے ہم سب Though Drivers اور اچھے نشانہ باز ہیں۔ البتہ میں نے سٹنگ' روٹیاں بنانا اور کئی Hair Style بھی ابو سے سیکھے ہیں۔

بہت عرصہ پہلے وہ جب امریکہ سے واپس آئے تو انہوں نے مجھے فرنچ ٹیل بنانا سکھائی جو وہاں پہ دیکھ کر آئے تھے۔ ہم نے پریکٹس میری چھوٹی بہن پہ کی تھی۔

روٹیاں جب ٹیڑھی بنتی تھیں تو وہ قدیر بھائی سے کہتے "مذاق اڑانے یا اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے ٹیڑھی کھانے سے تمہارا کوئی پیٹ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ تم نہ کھاؤ میں خود کھالوں گا"۔

جیولری، کپڑے، برتن کسی بھی چیز میں کوئی نیا سٹائل آئے وہ سب سے پہلے ہمارے لئے لاتے ہیں۔ ہم لوگ آج بھی نئے کپڑے، جوتے یا جیولری پہنیں تو چھوٹے بچوں کی طرح بھاگے بھاگے پہلے ابو کو دکھاتے ہیں۔

اور ہم چھوٹے بچے ہی تو ہیں۔ کیونکہ جتنا ہم بڑے ہوتے ہیں اتنے وہ ہم سے اور بڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ماں باپ اور اولاد کا رشتہ تو پہلے دن جیسا ہی رہتا ہے۔ بچے بڑے بھی ہو جائیں تو والدین کے بچے ہی ہیں۔

تربیت کے معاملے میں ان کا کہنا ہے کہ بچے کو غلط اور صحیح کی تمیز دو اور پھر چھوڑ دو۔ اگر کوئی غلط کرتا ہے تو اسے خمیازہ بھگت کر سیکھنے کا موقع دو۔ جو صحیح کرتے ہیں اسکی بہت قدر کرتے ہیں۔

بہت کم کسی بات پہ ہمیں ڈائریکٹ ڈانٹا جاتا ہے۔ Indirectly ان کے غصے کا اظہار ہوتا ہے اور ہم خود ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اس کی شان نزول کس کی کونسی حرکت ہے۔ جو موجود نہ ہو یا نہ سمجھے تو ہم ہیں نا۔ ان کے جذبات کی ترجمانی خوبی کر دیتے ہیں۔ میں نے یہ دیکھا ہے اس طرح بچے ڈھیٹ نہیں ہوتے بلکہ Sensitive ہو جاتے ہیں اور پھر والدین کی ذرا سی ناگواری چابک کی مار سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔

اسی طرح پڑھائی میں جس کا جو جی چاہا اسنے پڑھا۔ جتنا چاہا اتنا پڑھا اور اگر کوئی فرسٹ آیا تو اپنی مرضی سے آیا۔ یا اپنی ذہانت وشوق سے کسی نے کوئی انعام جیتا تو جیتا۔ اس پہ کوئی دباؤ نہ تھا۔ نہ پوزیشن برقرار رکھنے پہ اصرار تھا۔ ہاں پذیرائی خوب ہوتی تھی۔

اس لئے ہم سب کبھی نصاب تک محدود نہیں رہے اور غیر نصابی سرگرمیوں نے ہمیں آل راؤنڈر بنا دیا۔

بیٹیاں ہی نہیں وہ بیٹوں کو بھی اسی انداز میں لیتے ہیں۔ جب پہلی دفعہ ہمارے بھائی جان نے کراچی سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تو سب سے زیادہ ڈسٹرب ابو جی ہونے تھے۔ انہوں نے انہیں روکا تو نہیں بلکہ وہاں ان کی رہائش' کاروبار وغیرہ کا پورا بندوبست کر کے دیا لیکن وہ بہت بے چین تھے۔

جس دن بھائی نے جانا تھا اس دن بے قراری میں ان سے ایک جگہ بیٹھنا محال ہو رہا تھا مجھے یاد ہے ڈائننگ ٹیبل پہ وہ کہہ رہے تھے۔

''میں نے اپنے سب بچوں کو آج تک یوں ساتھ لگا کر رکھا ہے جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے سمیٹے پھر رہی ہوتی ہے۔ اب بچے بڑے ہو گئے ہیں خود بیوی بچوں والے ہیں۔ اپنا اچھا برا دیکھ سکتے ہیں کما کر کھا سکتے ہیں۔ ان کے آگے ان کی ساری زندگی پڑی ہے اور ترقی کے مواقع بہت ہیں اب انہیں جانا ہے۔ لیکن آج تک کوئی مجھ سے دور نہیں ہوا ہے تو بشیر کا جانا مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔

ان کی آواز بھر اگئی تو وہ چپ ہو گئے۔ اس درجہ شفقت اور محبت کے باوجود اولاد ہو یا مال اسباب کوئی بھی چیز ان کے پیروں کی بیڑی نہیں ہے بلکہ اپنی ہر ملکیت کو اللہ کی راہ میں کام کرنے کے سلسلے میں بطور ذریعہ استعمال کرتے ہیں وہ ہمیشہ یہی دعا کرتے ہیں کہ ''اللہ ہماری جان' مال اولاد کو اپنی راہ میں قبول فرمائے''۔

اور امی ہمیشہ خود بھی یہ دعا کرتی ہیں اور ہمیں سکھاتی رہتی ہیں کہ اللہ کبھی ہمیں ان کی آزمائش کا سبب نہ بنائے۔ کیونکہ اللہ کے بندوں پہ آزمائشیں لازمی بات ہوتی ہے۔ کیونکہ آزمائش کا آنا کبھی ان کے مناصب کا تقاضا ہوتا ہے اور کبھی ان کے لئے ترقی کا باعث۔ بدنصیب ہے وہ جوان کی آزمائش کا' دکھ کا سبب بنتا ہے۔

مال کے ہونے یا نہ ہونے سے انہیں کوئی خاص فرق اس لئے نہیں پڑتا کہ ان کی زندگی جیسے پہلے تھی ویسے ہی اب بھی ہے۔ خوراک سادہ' لباس' رہن سہن سادہ'

اپنا کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔
آج بھی انہوں نے کیا پہنا ہے؟ ان کی کونسی چیز کہاں رکھی ہے؟ دوا کہاں ہے؟ کب کتنی لینی ہے؟ اپنے سب کام ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔
سوال "کمنا انہیں اتنا ناپسند ہے کہ اگر بھول کر کھانے کے ساتھ پانی نہ رکھیں تو کبھی نہیں کہیں گے پانی دو۔ خود اٹھ کر لے لیتے ہیں۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایسی چیز جو کھانے میں ہمیشہ ساتھ لیتے ہیں ہم نے نہیں رکھی تو وہ نہیں مانگیں گے۔ برتن اٹھاتے ہوئے ہمیں خود ہی خیال آجائے تو آجائے ورنہ وہ نہیں کہتے کہ یہ نہیں تھا۔
بلکہ امی بتاتی ہیں ایک دفعہ کھانے میں نمک ڈالنا وہ سرے سے بھول گئیں۔ ابو آئے کھانا کھایا اور اٹھ گئے۔ آخر میں جب امی نے کھانا کھایا تو حیران ہوئیں اور بتایا اس میں تو نمک ہے ہی نہیں۔ آپ کو پتہ نہیں چلا۔
لیکن جہاں تک میرا خیال ہے امی ابو ایسے لوگ ہیں جو جینے کے لئے کھاتے ہیں کھانے کے لئے نہیں جیتے۔ میری بڑی بھابھی کہتی ہیں لوگ کھا کے خوش ہوتے ہیں اماں جی دوسروں کو کھلا کے خوش ہوتی ہیں۔
امی کی آج بھی آخر میں کھانا کھانے کی عادت ہے۔ ہم لوگ جو روٹی کے ٹکڑے چھوڑ دیتے ہیں۔ جو سالن چھوڑ دیتے ہیں وہ باری باری سب بچوں کی پلیٹیں صاف کرتی ہیں وہ کہتی ہیں۔
"رزق کا زیاں اللہ کی ناشکری اور بے برکتی کا باعث بنتا ہے۔ ہم کس لائق ہیں اگر اس نے نوازا ہے تو اس کا احسان ماننا چاہئے"۔ اور وہ وقتاً فوقتاً اللہ کی نعمتوں کا شمار کرتی رہتی ہیں۔ اس سے ہمارے دلوں میں چیزوں کی قدر اجاگر رہتی ہے۔ ہم انہیں روٹین میں نہیں لیتے۔
اور واقعی نعمت تبھی نعمت ہے جب اسے بطور نعمت لیا جائے۔ ورنہ ایک اندھے

کو کیا معلوم کہ اس کی ہاتھ میں کنکر ہے یا ہیرا۔ شکر کا جذبہ بھی اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ میں نے واحد اپنا گھر دیکھا ہے جہاں تھوک کے حساب سے چیزیں آتی ہیں اور یہ ابو کی شروع سے عادت ہے۔ لیکن اسے سنبھالنا اور سنبھل کر استعمال کرنا امی پہ موقوف ہے وہ اس میں سے ایک دانہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتیں۔

جب کہ ہمارے نانا ابو کے گھر کو "وڈیاں ملکاں دا گھر" بولا جاتا تھا۔ پھر اچھے برے سبھی طرح کے دن آئے اور گزر گئے۔ امی ابو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔

شاید زمانے کو وہی لوگ بدل سکتے ہیں جنہیں زمانہ نہ بدل سکے۔ ایسے لوگوں کے سامنے دولت کتنی بے وقعت ہو جاتی ہے۔ سونا تبھی سونا ہے جب اسے ماتھے پہ باندھ جائے۔ پاؤں میں پڑا ہو تو جیسے لوہا ایک دھات ہے ویسے ہی سونا بھی ایک دھات ہے اور بس۔

ابو روپے کو دوسروں پر یوں لٹاتے ہیں۔ جیسے یہ ان کا اپنا نہ ہو۔ واقعی کسی درخت سے توڑ لائے ہوں۔
یوں بھی کچھ لوگ انہیں لوٹ کر لے جاتے ہیں
کچھ طبیعت بھی فقیروں کی غنی ہوتی ہے

اسے کوئی کیا لوٹے گا جو خود لٹانے پہ آمادہ ہو۔ ایک رشتہ دار بیمار ہوئے 50 ہزار انہیں دیا۔ دوسرے روز ایک ملازم حادثاتی طور پر فوت ہوا 50 ہزار اسے دیا گھر گئے۔ گلی پکی ہو رہی تھی چندہ مانگنے والوں کو 10 ہزار دے دیا۔ دارالعرفان آئے کسی مزدور نے چھت ڈالنا تھی اسے 10 ہزار دے دیا۔ ایک جاننے والے فوت ہوئے ان کے گھر والوں کو 10 ہزار دے دیا۔

یہ وہ واقعات ہیں جو چند دنوں میں اوپر تلے ہوئے اور کسی نہ کسی طرح ان واقعات کا ہم سے تھوڑا بہت تعلق بنتا تھا تو یہ باتیں ہمارے علم میں آئیں۔ ورنہ ان

کے بائیں ہاتھ کو علم نہیں ہوتا کہ دائیں نے کیا دیا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ انہیں کسمپرسی میں رہنا پسند ہے۔وہ خوش لباس ہیں۔خوشبو ان کی کمزوری ہے۔ہمارے پاس ہمیشہ اچھی سے اچھی گاڑی رہی ہے وہ کہتے ہیں جو اللہ نے نعمتیں دی ہیں ان کا اظہار کرنا بھی شکر کی ایک قسم ہے۔اگر دنیا کو مطمع نظر نہ بنالیا جائے تو دنیا کو برتنے میں کوئی خامی نہیں ہے اسلئے کہ یہ بنی ہی انسان کے برتنے کے لئے ہے۔اللہ نے ہر شے کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔

تیرے خوش پوش فقیروں سے وہ ملتے تو سہی
جو یہ کہتے ہیں وفا پیرہن چاک میں ہے

صلہ رحمی ایسی کہ کوئی مجھ سے کہے بھی تو چند ایک گھر ایسے ہیں کہ میں وہاں کبھی نہ جاؤں لیکن ان کی تمام تر نیکیوں کے باوجود جو وہ ہم سے روا رکھتے ہیں ابو کسی نہ کسی طرح سے ان کی کفالت کرتے ہی رہتے ہیں۔ان کی ناجائز ضدوں کو بھی مان لیتے ہیں اور پھر قدیر بھائی کو تسلیاں دیتے ہیں۔

"وہ وہ کرتے ہیں جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں میں وہ کرتا ہوں جو میرے ایمان کے مطابق صحیح ہے۔برے کے ساتھ برا بن جانا خود اپنے ساتھ زیادتی ہے۔ہر شخص سے دوسروں کو وہی ملتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے اور آپ سے وہ جو آپ کے پاس ہے۔ ایک دفعہ کہا۔

"برے رشتہ دار بھی رحمت ہوتے ہیں۔آخرت میں چھوٹ کا باعث بنتے ہیں"۔

اہل دنیا کی یہ حالت کہ نہ الفت نہ وفا
اور میرا دل وہی انداز پرانے مانگے

آج تک ہم پہ کوئی بات Impose نہیں کی گئی وہ ہمیشہ ہر ایک کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ سب کے ساتھ ساری باتیں Discuss کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ رہنے سے کئی طرح کے Experiencess ہوتے ہیں۔ انسان خود خود سیکھتا چلا جاتا ہے۔ آپ کسی لمحے، کسی موضوع پہ کوئی بھی سوال کر سکتے ہیں وہ پوری توجہ سے سنتے اور تسلی بخش جواب دیتے ہیں۔ ان کی یاداشت کمال کی ہے وہ چلتی پھرتی لائبریری ہیں جس سے ہم اٹھتے بیٹھتے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کے باوجود مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ جتنے بلند تر ہیں اتنا ہمیں ادراک نہیں ہے۔ گاڑی میں موٹروے پہ جاتے ہوئے میں بڑے حضرت جی کے مکتوبات پڑھ رہی تھی۔ ابو سے ایک بات کی وضاحت چاہی تو انہوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ اعلیٰ حضرت کے ہاتھ کی تحریر ایک صفحے پہ چھپی تھی پڑھ کر بولے یہ اصل تحریر نہیں ہے پھر کئی سال پہلے لکھی گئی لیکن آج بھی اس میں برکات موجود ہیں۔

اس کتاب میں کئی جگہ حضرت کی تحریر میں ہے کہ یہ مسئلہ مشائخ سے رات Discuss ہوا۔ یا اس بات پہ دربار نبویؐ سے یہ حکم آیا ہے۔ تو میں اسے پڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہی سب سلسلے ابو کے ساتھ بھی وابستہ ہوں گے۔ کیوں کہ وہ موجودہ شیخ سلسلہ ہیں۔

لیکن ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کبھی ہمیں احساس نہیں ہوا کہ اس جہان میں رہتے ان کا ایک اور جہان بھی آباد ہے۔

میں بات گیان کی کرتا ہوں تیرے دھیان میں بھی
الگ تھلگ نہیں دنیا سے سادھوؤں کی طرح

ان کی گفتگو، سب باتیں کتنی عام فہم سی ہوتی ہیں جن میں شائبہ تک نہیں

ہوتا کہ ان کے پیچھے محرک کیا ہے۔ کسی ماورائی قوت کا کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ کوئی مافوق الفطرت چیزیں ہر روز دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ ہاں کبھی کبھار کوئی بات سامنے آتی ہے وہ بھی شاید ہمیں ان کے حقیقی میدان اور اصل شخصیت یاد دلانے کی لئے۔

جیسے ایک دفعہ سیر کے لئے ہم نے ایک نئی وادی دریافت کی۔ آئے دن سیر کے لئے پہنچ جاتے۔ راستے میں ایک چھوٹی سی وادی میں کسی کا مزار تھا۔ جس کے پاس سے سڑک گزرتی تھی۔ لوگوں نے اس پر رنگ برنگے جھنڈے باندھ رکھے تھے۔ شاید منتیں بھی مانگتے ہوں گے۔

ایک دفعہ وہاں سے گزرے تو ابو نے کچھ ایسا کہا "واہ اللہ تیری شان تیرا اپنا نظام ہے" الفاظ شاید وہ نہ ہوں' مفہوم یہی تھا۔ ہمارے درمیان سفر میں یوں بھی سوال وجواب کے لمبے لمبے Sessions چلتے ہیں اس لئے فوراً پوچھا کیا ہوا؟ کونسی بات یاد آئی؟

بولے "میں جب بھی اس وادی سے گزرتا تھا اس قبر کی نحوست سے میرے سر میں درد شروع ہو جاتا۔ دل متلانے لگتا تھا۔ لیکن میرے بار بار یہاں سے گزرنے سے وہ نحوست چھٹ گئی ہے اور صاحب قبر عذاب سے افاقے میں ہے"۔

سوالوں کی تکرار شروع ہوگئی۔ یہ کیا سسٹم ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ اور جانے کیا کیا۔ جو جواب ملے ان کا ماحصل یہ تھا۔

"ہر مسلمان کے لئے عذاب کبھی دائمی نہیں ہوتا۔ اللہ کو اس شخص کے عذاب میں کمی کرنا مقصود تھی۔ سبب اس نے میرا یہاں سے گزرنا بنا دیا"۔

اسی طرح ایک دفعہ ابو کے گاڑی والے فون پہ سروس نہیں آرہی تھی۔ گاڑی سائڈ پہ لگا کر وہ بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جھڑک کر بولے۔ "تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ دور ہٹ جاؤ"

ہمیں سمجھ نہ آئی انہوں نے کس سے کہا ہے۔ مارے ڈر کے پوچھا بھی نہیں کیونکہ وہ فون کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے تھے۔

دوسری صبح انہوں نے بتایا۔ وہ ایک دیو طرح کا جن تھا۔ جو آسمانوں میں کہیں سے اڑتا ہوا آرہا تھا۔ زمین پہ اسے گاڑی کی جگہ پر روشنی کا پہاڑ نظر آیا وہ یہ دیکھنے نیچے اترا کہ اتنے اندھیرے میں یہ کیا چیز اتنی روشن ہے۔ وہ دور سے آیا تھا اسلئے مجھے جانتا نہیں تھا کہ اس وقت ابو غصے میں تھے تو انہوں نے پکڑ کر باندھ دیا۔ پوچھا باندھا کیسے وہ تو بہت طاقتور ہوتا ہے۔ بولے "رسے سے تھوڑا باندھا جاتا ہے نور سے باندھا جاتا ہے"۔

پھر کچھ روز بعد انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ بولے "اب جان گیا ہے کبھی نہیں بھولے گا"۔

یہ گزری سردیوں کی بات ہے۔ ہماری ہاں پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث سردیاں خوب سرد ہوتی ہیں۔ سردی کے اس عالم میں ہم فریزر میں برف جمایا کرتے کیونکہ بیٹھے بٹھائے کسی بھی وقت ابو کا جسم انگارے کی طرح دہک اٹھتا۔ سرخ اور گرم کہ ہاتھ لگانے سے ہاتھ جلیں۔

ہم سب بھاگم بھاگ بالٹیوں میں پانی بھرتے۔ برف ڈالتے اور تولیے لئے ان کی گرد ہو جاتے۔ ہمارے ہاتھ اس سردی میں ٹھنڈے پانی سے بھی ٹھنڈے نہیں ہوتے تھے بلکہ جلنے لگتے تھے جس کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے وہ ان کی آنکھوں اور چہرے پہ رکھتا۔

ابو صرف چادر باندھے ہوتے تھے اور ہم ٹھنڈے تولیے ان کے کندھوں پہ' ٹانگوں پیروں پہ بار بار دھرتے۔ اور میں نے خود ان کے جسم سے بھاپ کے بادل اڑتے دیکھے ہیں۔ وہ کہتے "اللہ کی محبت اسطرح جلا سکتی ہے تو اس کے غضب کی آگ کس قدر شدید ہو گی"۔ کبھی زیادہ کبھی کم وقفے کے بعد وہ نارمل ہو جاتے۔ ایسا کیوں

ہوتا تھا؟۔ میرے پاس اس کا یہی جواب ہے کہ ان کے روحانی منازل میں کوئی ایسا مقام ہوگا۔ جس سے وہ گزر رہے تھے جس کے باعث یہ ہوتا تھا۔

جلا سکتی ہے شمع کشت کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

یوں میں لکھنے بیٹھوں تو بے شمار واقعات ہیں۔ میں نہ تو ان کی ذات کا احاطہ کر سکتی ہوں نہ حالات واقعات کا جن کا تسلسل سالوں پہ محیط ہے اور تاحال جاری ہے۔ ہاں ہماری یہ خوش بختی ہے کہ ہم اس سب کے عینی شاہد ہیں اور کسی حد تک باقی لوگوں کے قرض دار اور امین بھی۔

میں سمجھتی ہوں دوسرے لوگوں تک یہ باتیں پہنچانے کے ہم مکلف ہیں کہ اگر کوئی اصلاح باطن کے لئے شیخ کامل کا متلاشی ہے تو آؤ' پرکھو' اور خود کو ان کے سپرد کردو۔ جن کا دعویٰ ہے۔

دل منور ہو تو محسوس کر سکتا ہے
کون کہتا ہے اللہ کو دیکھا بھی نہیں

ذکر اس کا جو رگ وپے میں سما جائے گا
ایسا شعلہ سا اٹھے گا جو بجھے گا بھی نہیں

ابو کے پاس ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ اچھے برے' نیک بد سبھی' لیکن وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"روک ٹوک مولوی کا کام ہے صوفی کا نہیں۔ صوفی سب کو ساتھ لے کر چلتا ہے اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے اور پھر اسکی صحبت سے ان میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنی شروع ہو جاتی ہے جو ان کے اندر سے

اٹھتی ہے۔ مولوی ظاہر کی اصلاح کرتا ہے اور صوفی
باطن کی۔ جس کے نتیجے میں ظاہر کی بھی اصلاح ہو
جاتی ہے"۔

ہر شخص ان کے لئے قیمتی ہے ان کا حکم ہے کسی کو دروازے سے نہ لوٹایا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔

"سب سے مشکل حساب کتاب یوم قیامت مشائخ کا ہوتا ہے۔ ہر شخص صرف اپنی ذات کا جولبدہ ہوتا ہے جبکہ مشائخ ہر اس بندے کے ساتھ مکلف ہوتے ہیں جس نے ان کے ہاتھ پہ بیعت کی۔ اور جب تک ان میں سے ہر ایک گزر نہیں جاتا وہ فارغ نہیں ہوتے"۔

وہ کہتے ہیں۔

"اللہ نے ہمیں برکات نبوی کا امین بنایا ہے۔ اس دور کے ہر بندے کے امانتدار ہیں ہم۔ اس تک ان برکات کو پہنچانے کے مکلف ہیں"۔

شاید اسی لئے وہ ہر آنے والے کو اتنا اہم جانتے ہیں اور اس پہ اتنی محنت کرتے ہیں۔

یہ مہر تاباں سے جا کے کہہ دو کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

میں نے بارہا یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ ان کے پاس آتے ہیں اور وہ شخص جو انہیں واصل باللہ کر سکتا ہے عشق رسول کی آگ بانٹتا پھرتا ہے کہ اپنے سینوں میں بھڑکا لو۔ وہ جو انہیں افلاک بخش سکتا ہے یہ لوگ اس سے دنیا مانگتے ہیں۔ جو کہیں سے بھی مل سکتی ہے۔

اس سے اپنے پاؤں کے کانٹے نکلواتے ہیں' سر درد کے لئے دوا کرواتے ہیں نوکری کے لئے دعا کرواتے ہیں' صحت کے لئے تعویز لکھواتے ہیں۔

کتنے سستے پہ راضی ہو جاتے ہیں یہ لوگ۔ کتنا گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ شاید وہ اس لئے لوگوں کے ہر طرح کے کام میں کام آتے ہیں کہ لوگ دنیا سے فارغ ہوں گے۔ تکلیفوں اور دنیا کے دھندوں سے چھٹکارا پائیں گے تو آخرت کی باری آئے گی۔ اور تب تک ساتھ لگائے رکھتے ہیں اور ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں ہم ان سے انہیں بتائے بغیر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور وہ سب جانتے ہوئے انھیں ایسا سمجھنے دیتے ہیں۔ اف کتنا بڑا ظرف درکار ہے اس کام کے لئے۔

کچھ لوگ ایسے آتے ہیں کہ شاید کوئی بھی جو انہیں کسی حوالے سے جانتا ہو۔ ان کی ذات سے 'ان کی پہنچ سے' ان کی اہلیت سے' شاطر دماغی اور چرب زبانی سے خائف ہو جائے لیکن ابو سدا کی طرح مطمئن رہتے ہیں۔ جیسے شطرنج کا کھلاڑی بادشاہ' وزیر' پیادے سب کی طاقتوں سے، اہلیتوں سے واقف ہوتا ہے اور ان سے خائف ہونے کے بجائے انہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ایسے میں وہ مجھے کوئی ماہر کھلاڑی لگتے ہیں۔ لیکن یہ مثال ان کی سادگی' نیک نیتی اور اعلیٰ مقصد کے پیش نظر مکمل طور پر صادق نظر نہیں آتی۔ وہ سوائے رب العزت کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ کبھی خائف نہیں ہوتے۔

بے خوف زندہ لہجے میں کرتا ہوں گفتگو
خود ساختہ خداؤں سے ڈرتا نہیں ہوں میں
وہ نقطہ شعور ہوں قرطاس زیست پر
پھیلوں اگر کبھی تو سمٹتا نہیں ہوں میں

وہ بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کی میرے نزدیک خاص بات اس کا انوکھا پن ہے۔ منفرد اسلوب' نئے نئے خیالات اور انوکھی باتیں۔ جنہیں لگتا ہے اس انداز میں پہلی دفعہ کہا گیا ہے۔

زیادہ تر شاعری حالت سفر میں کرتے ہیں۔ ہم گاڑی میں ساتھ ہوں تو تانک جھانک بالکل نہیں کرتے کیونکہ وہ غزل' نعت جو بھی ہو مکمل ہونے پہ خود ہی سنا دیتے ہیں بعض اوقات چلتے پھرتے باتوں باتوں میں غزل ہو جاتی ہے۔

اپنا کمال شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

تصور کوئے جاناں سے مدینے جا نکلتا ہے
غزل سے بھی ہزاروں نعت کے پہلو نکلتے ہیں

میرے نزدیک یہی ان کی شاعری ہے :۔

ان کی زندگی ہمہ جہت ہے۔ سب باتوں کا احاطہ ممکن نہیں۔ میں نے اسی لیے آج تک ان کی ذات پہ قلم اٹھانے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ کیونکہ مجھے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ جیسے وہ ہیں' جو کچھ وہ ہیں۔ میرے نزدیک جو ان کا مقام ہے یا جتنی وابستگی ہماری دلوں' جذبوں اور سوچوں کو ان سے ہے میں کبھی بھی اس طرح بیان نہیں کر پاؤں گی جس طرح حقیقت میں وہ ہے۔

اور ایسا ہی ہوا ہے میں غلط نہیں تھی۔ مجھے میری لکھی ہوئی ہر بات ادھوری لگ رہی ہے اور اگر میں لکھنے نہ لکھنے میں آزاد ہوتی تو شاید میں کبھی نہ لکھتی یہ مجھ سے لکھوایا گیا ہے۔ تاحال میں نہیں جانتی باقی مضمون نگاروں نے کیا لکھا کیا نہیں۔ اس لئے کچھ باتیں شاید یکساں ہوں۔ جس کے chances کم ہی ہیں کیونکہ :۔

ہر نظر بس اپنی اپنی روشنی تک جا سکی
ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پایا مجھے

O..........O..........O

میں اور میرے ابو

عبدالقدیر اکرم اعوان

چونکہ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ اپنے ابو جی کی شخصیت کو بیان کریں۔ سو اس مضمون کا نام یہی سمجھ میں آتا ہے۔ ایک بات ' دوسری بات Practical Life' میں ' میں پہلی دفعہ مضمون لکھنے کی کوشش کرنے جا رہا ہوں۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر مضمون پڑھا جائے یا پرکھا جائے۔

یاداشتیں :

بہت پہلے ایک ننھے ذہن میں جو کچھ تھا اسکو On paper آپ کی نظر کرتا ہوں۔

میں چونکہ بچپن میں بہت شرارتیں کرتا اور گھر والوں کو تنگ کرتا تھا سو کبھی کبھی ابو جی سے جھاڑیں کھاتا اور کبھی کبھار تھوڑی بہت سزا بھی، مگر یہ ان کی فطرت تھی اور ہے بھی کہ جب کبھی غصے ہوئے تو ہم انتظار کرتے کہ ابھی راضی کرنے اور بہلانے کی خاطر کوئی نہ کوئی چیز گفٹ کریں گے اور ہمیشہ وہی ہوتا انہیں جو اچھا ملتا وہ

دے دیتے۔

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ باہر ان کی کیا مصروفیات ہیں۔ کتنے تھکے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے دماغ میں کتنی Tentions ہیں۔ بس جب بھی وہ گھر آتے ہم اس انتظار میں ہوتے کہ جونہی وہ گھر میں داخل ہوں گے ہم بہن بھائیوں سے سوال کریں گے۔ ''دیکھو میرے پاس کیا ہے؟'' اور پھر کیا، آگے آگے وہ بھاگتے کبھی کسی کمرے میں اور کبھی کسی کمرے میں اور ہم ایک دوسرے سے تیز بھاگ بھاگ کے انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے کہ ان کے پاس کیا ہے۔

یاداشت کی سکرین پہ یہ بات بھی نمایاں نظر آتی ہے کہ ابو جی ہمیں لے کے بڑے حضرت جی (حضرت مولانا اللہ یار) کے گاؤں جاتے اور وہ بھی ہمارے گھر تشریف لاتے اور ابو جی کو دیکھ کر میں بھی کوشش کرتا کہ اس ہستی کی محفل میں ادب سے داخل ہوں اور ان کے احترام میں جھک جاؤں۔

کبھی کبھی رات کو چھوٹے دونوں بہن بھائی کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے بیڈ پر اپنے ساتھ لٹا لیتے اور کوئی نہ کوئی مزے کی کہانی سنانا شروع کر دیتے۔ میں اور دوسری بہن بھی ارد گرد کہیں نہ کہیں جگہ ڈھونڈ کے بیٹھ جاتے اور کہانیاں سنتے رہتے۔ اور کسی دن ابو جی کہانی ختم کر کے تھوڑا سا وقت ذکر الٰہی بھی کرا دیتے۔

تھوڑی سی یاداشت بچپن کی لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ابو جی کی شخصیت کا وہ پہلو جو کہ گھر کی چار دیواری میں ایک بچے نے دیکھا بیان ہو جائے۔ یعنی وہ جتنے بھی تھکے ہوئے آتے انہوں نے اپنے بچوں کو خاص وقت دیا اور ان سے اتنا پیار کیا کہ جو وقت وہ کاروبار زندگی میں صرف کرتے تھے اس کا یا گھر سے غیر حاضر ہونا پڑتا تھا کا ازالہ ہو جاتا۔ آج بھی پوتے پوتیوں کیساتھ اسی طرح کھیلتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔

رشتہ داروں کے ساتھ رشتہ داری:

یہ وہ کام ہے جو دنیاوی چند بڑی مشکلات میں سے ایک ہے اور اس میں سرخرو ہونا بہت مشکل ہے۔ مگر ابو جی کی طبیعت کا یہ پہلو بھی بہت صاف اور کھرا ہے کئی دفعہ عزیز ناراض ہوئے مگر جب بھی ان کے ساتھ مشکل پیش آئی انہوں نے ابو جی کو اپنے ہم رکاب پایا۔ بلکہ انہیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس اللہ کے بندے کے ساتھ زیادتی کر لو۔ ہماری دفعہ یہ لحاظ کر جائے گا۔ بلکہ ایک قریبی رشتہ دار اڈے پہ بیٹھ کر برملا برا بھلا کہتا رہتا ہے اور جب کبھی مسئلہ بنے چاہے معاشی ہی کیوں نہ ہو ابو جی کے پاس آتا ہے اور یہ اسکی مدد کر دیتے ہیں اور ہماری سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں اور فقط اتنا کہتے ہیں۔ "خدا تو دیکھ رہا ہے"۔

یعنی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو ٹھیک مگر گزند نہ پہنچے۔

گھر:۔

ابو جی نے دو شادیاں کی ہوئی ہیں۔ یہ کہانی مجھے نہیں معلوم کہ کن حالات میں دوسری شادی کی۔ بہر حال جو کچھ میرے علم میں ہے وہ یہ کہ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں تین بھائی اور ایک بہن پہلی شادی سے اور دو بھائی اور دو بہنیں دوسری شادی سے، بڑے بہن بھائی سیکھی جبکہ ہم منارہ میں رہتے ہیں۔ ہمارے گھر میں وہ روایتی سوتیلے پن کی بو نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں بہن اور بھائی کے رشتے کے ساتھ سگا یا سوتیلا لگانے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے خود پرائمری That means five years سیکھی سے پاس کی ہے۔ Weekend پر منارہ جاتا تھا۔

یہ سب روٹین میں ہی ٹھیک نہیں چلتا بلکہ کسی کی محبت اور کوشش کارفرما ہوتی ہے اس رہن سہن کی روح ابو جی کی طبیعت ہے۔

ذات :

یہ وہ پوائنٹ ہے کہ جہاں پر قلم کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔اور Writer کو ڈھونڈے سے وہ الفاظ نہیں ملتے جو کہ ترجمانی کر سکیں بہر کیف ایک ناتواں کوشش ہے جو کہ ظاہری حالات پر مبنی ہے۔ابو جی کا تعلق ایک متوسط زمیندار گھرانے سے ہے۔اس لئے شروع سے محنت کے عادی ہیں اور ہمارے علاقے کا رہن سہن مشکل اور مزاج سخت ہے اور علاقے میں پھر سیٹھی سب سے پہلے نمبر پر اکھڑ گاؤں۔بلکہ ایک میراثی مثال دیا کرتا تھا کہ جب اللہ نے انسان بنانا شروع کئے تو ایک وقت میں انسان ہی بناتا گیا اور پھر جب ارواح بنانا شروع کیں تو روحیں ہی بناتا چلا گیا۔جب جسم اور ارواح بنا چکا تو پھر بہت ساری روزی بنائی اور یہ عمل شروع کر دیا کہ جسم میں روح ڈالی اور ساتھ کچھ حساب سے روزی لکھی اور زمین پر بھیج دیا۔آخر میں کچھ روح معہ جسم بچ گئے جن کے لئے روزی کم پڑ گئی تو اللہ نے فیصلہ کیا جو چلے گئے وہی کافی ہیں تم باقی ادھر ہی رہو ورنہ روزی کا مسئلہ بنے گا۔تو آگے میراثی کہتا ہے کہ بچے ہوئے لوگوں نے عرض کی۔اے اللہ تو ہمیں دنیا میں بھیج۔روزی قسمت میں نہیں رہی تو نہ سہی جن کے پاس ہو گی ہم ان سے حصہ لے لیں گے۔وہ میراثی کہتا تھا کہ یہاں وہ لوگ ہیں جو کہ روزی کے بغیر آئے تھے۔

اس مثال سے مراد یہ ہے کہ حالات اتنے سخت، دشمنیاں اور اتنی Ten-tions کہ ابو جی اس Process سے گزر کر اعصابی طور پر بہت مضبوط ہو گئے۔اور رہا دین کا سلسلہ تو ہمارے آباؤ اجداد میں کچھ نہ کچھ مذہبی رجحان رہا ہے سو وہ طلب بھی ابھر آئی۔جب سے ابو جی کی زندگی نے تصوف کی طرف کروٹ لی اور ایک اللہ کے کامل بندے کی محفل کا حصہ بنی تو تمام انسانی عظمتوں کے کمال کو پہنچے۔

یہیں آ کے وہ مقام آجاتا ہے کہ جس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ الفاظ کی محتاجی سے نکل جاتا ہے۔ تصوف کے سلسلے کو عرصہ دراز تک پورے انہماک سے Practice کرنے سے ان کی طبیعت میں بہت زیادہ نکھار آ گیا۔ طبیعت میں ایسی بذلہ سنجی آئی کہ شاعر سے لے کر مفسر قرآن تک کہلانے لگے۔ دنیا بھر میں اسلام کی تبلیغ کی اور اس جہاں گردی کو سفر ناموں کی شکل دے کر منظر عام پر لائے۔

آپ کے دفتر میں دنیا بھر کے ڈاک ٹکٹ دنیا بھر کے سکے اور ڈائینو سار کے جبڑے سے لے کر سیپ کے فاسل تک ملتے ہیں۔ خود پہاڑوں پر پھر کے نوادرات اکٹھے کرتے ہیں اور مردانہ کھیل یعنی شکار کے بہت شوقین ہیں۔ پرندوں سے لے کر Snow leopard تک شکار کیا ہے۔ یعنی اس شوق میں صحراؤں سے لے کر برف پوش چٹانوں تک گئے ہیں۔ کھڑے ہو کر بغیر سہارے کے رائفل کا جتنا نشانہ آپ کا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی اور کا نہیں دیکھا بلکہ کئی دفعہ مقابلہ بھی کیا ہے مگر ہار جاتا ہوں۔ جانوروں کے بھی شوقین ہیں' ابھی بھی تین گھوڑے سواری کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔

زمیں داری سے لے کر کول مائننگ تک بزنس کیا اور جب معاشرے کی طرف مڑے تو نادرن ایریاز کی فلاح کے لئے الفلاح کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جو کہ مختلف طریقوں سے نادرن ایریاز میں لوگوں کی مدد کرتی ہے۔

تعلیم کے سسٹم میں مایہ ناز کام کیا۔ صقارہ اکادمی کے نام سے ایسا تعلیمی نظام مرتب کیا کہ جس میں بچے سائنس کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات بھی حاصل کرتے ہیں۔

اپنی زیر نگرانی بلا سود بینکاری سسٹم بنایا اور یہ بنک بفضل خدا بڑے احسن طریقے سے چل رہا ہے۔

تنظیم الاخوان کے جلسے میں



لڑکوں کے ساتھ جنگل میں

عدلیہ کے سلسلے میں بھی ایک سسٹم جو کہ اسلامی اقدار کے مطابق بنایا جس کے مختلف جج حضرات ہیں۔ لوگ اپنا موقف بیان کر کے انصاف حاصل کرتے ہیں۔

بس ایک چیز کی کمی تھی کہ اب نہیں رہی یعنی سیاسی میدان۔ ایک دفعہ تقریر میں فرمایا کہ یار اگر ثواب ثواب اکٹھا کروں تو بڑے پہاڑ بنتے یعنی جب سے تصوف میں آیا ہوں کوئی نماز نہیں چھوڑی، تہجد نہیں چھوڑی۔ کتنے لوگوں کو اللہ اللہ کرنا سکھایا اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کو کلمہ پڑھایا۔ جانے کتنے سال ہو گئے ہیں اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے اگر ثواب اکٹھا کروں ہمالہ پہاڑ سے بڑا لگتا ہے مگر جب روز محشر کا خیال کرتا ہوں تو کچھ اس طرح لگتا ہے کہ اللہ رب العزت کا دربار ہے اور میں ثواب کے پہاڑ گھسیٹے چلا آ رہا ہوں کہ ابھی جنت کا ٹکٹ لیتا ہوں اور سیدھا جنت میں جا کے رکوں گا۔ بالکل اسی لمحے یہ خیال آتا ہے کہ کوئی غریب نادار چی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اللہ پاک کے تخت کا پایہ پکڑ کر گڑگڑا رہی ہے روتی ہے واویلا کرتی ہے کہ یاالٰہی تو نے اپنے اس بندے کو دنیا میں مقام دیا، اسلام سے وابستگی دی، ماننے والے لوگ دیئے اور تیرا یہ بندہ حجروں میں بیٹھا رہا اور میرا نہ مال بچا اور نہ عزت آبرو۔ سب کچھ لٹتا رہا۔ یارب تیرے اس بندے کا تیری مخلوق کو کیا حاصل۔

تو فرمایا کہ اللہ کی ذات بڑی غیور ہے۔ وہ نیکیوں کے پہاڑ اٹھا کے منہ پر مارے گا کہ لے جاؤ ان کی ہمیں ضرورت نہیں۔

یہ سوچ کر انہوں نے سیاسی نظام کی اصلاح کے لئے الاخوان کے نام سے سیاسی پلیٹ فارم بنایا۔

سودو ستو اتنی سمندر کی سی طبیعت میرے علم میں اور کہیں نہیں ہے۔

مصنفہ کا سوال ہے کہ اپنے ابو کے مشن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

ان کے مشن اور ان کے کام کو میں اس قدر ٹھیک اور Positive سمجھتا ہوں کہ

"میں اپنے ابو جی کے مشن کو اپنے خون سے سینچوں گا انشاء اللہ"۔ آپ گواہ رہنا۔ آپ کے کہنے پر میں نے اپنی استطاعت کے مطابق حضرت جی (یہ بتاتا چلوں کہ میں نے باقاعدہ بیعت کی ہوئی ہے اس لحاظ سے وہ میرے حضرت بھی ہیں)۔ پر مضمون تو لکھ دیا ہے مگر آپ سے سوال یہ ہے کہ آیا آپ اس سمندر کو کوزے میں بند کر سکیں گی؟

میری رائے

مجھ سے ایک سوال یہ بھی کہ کوئی ایسی بات جسے کرامت کہا جا سکے تو محترمہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس ضمن میں آتی ہیں مگر میں جو بیان کروں گا وہ میرے اپنے متعلق ہے۔ میرے تقریباً چھ موہرے ریڑھ کی ہڈی کے خراب ہیں۔ اس کا دنیا میں تاحال کوئی علاج نہیں۔ تمام ٹیسٹ کروانے اور ڈاکٹروں کو دکھانے کے بعد جو نتیجہ آیا وہ یہ ہے کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ آہستہ آہستہ چارپائی پہ آجاؤ گے اور بس۔ مگر صرف ابو جی کے نقش استعمال کئے ہیں اور کر رہا ہوں۔ پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ ابھی ڈاکٹر اس Condition کو نہیں مانتے۔

O...........O...........O

حضرت جی

ثمینہ افتخار اعوان

لفظ "بیان" سے میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ہی خاکہ ابھرا کرتا تھا کہ کوئی مولوی یا مولانا مائیک کے آگے کھڑے گانا گانے کے انداز میں لہک لہک کر تقریر کر رہے ہیں اور یک بیک یوں محسوس ہوتا کہ مائیک پہ دھرے ان کے ہاتھ کو کرنٹ چھو گیا ہو یا شاید قریب ہی کہیں بھڑوں کا چھتہ بھی موجود تھا کہ "لہکتے" لہجے میں قیامت کی شدت و تندہی جنگ و جدل کا سماں پیدا کر دیتی۔ اسی لئے جب والد صاحب کے دوست محمد خاں جنجوعہ صاحب نے ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی کہ ان کے شیخ گوجرانوالہ تشریف لا رہے ہیں ان کا بیان سننے ضرور آئیں تو مجھے ہنسی آگئی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کالج میں اسلامیات کی قابل ترین معلمہ بہترین لیکچر دیتی ہیں اور پھر بھلا ہم خود بھی کیا نہیں جانتے لہٰذا ایک مولوی کا بیان ایسا ضروری کہاں کہ اس پہ کالج لائف کا ایک سنہری دن قربان کیا جائے۔ وہ یہی کہیں گے نا کہ نماز پڑھو اور

روزہ رکھو تو ہمیں معلوم ہے کہ نمازیں پڑھنی چاہئیں' روزے رکھنے چاہئیں۔
کالج کا دن تو ہم سے قربان نہ ہو سکا لیکن جنجوعہ صاحب کی شفقت بھری ناراضگی ضرور مول لے لی۔ وہ ہفتہ بھر کی غیر حاضری کے بعد آئے تو ہم نے بیسیوں بہانے گھڑتے ہوئے محض تلافی کی خاطر پوچھ لیا کہ "آپ کے شیخ صاحب نے کوئی کتاب وغیرہ نہیں لکھی۔ ہم پڑھنا چاہتے ہیں"۔ وہ دام میں آ گئے۔ یہ ہمارا خیال تھا ورنہ تو اگلے دن دام ان کے ہاتھ میں تھا" دیار حبیب میں چند روز" اور "ارشاد السالکین" کے روپ میں۔ میں نے ہمیشہ مذہبی کتب کا دل سے احترام کیا تھا (اپنے طور) سوان کتب کو بھی چوم کر الماری کی سب سے اوپر والی شیلف میں سنبھال کر رکھ دیا اور جنجوعہ صاحب کے اگلی دفعہ آنے پر بغیر پڑھے دونوں کتب کے انداز بیان و حسن بیاں کے قصیدے پڑھ دیئے کہ آخر پطرس بخاری بھی ہمی میں سے تھا۔
امتحانات سر پر آئے تو نصاب کے علاوہ ہر کتاب حسین لگنے لگی اور یوں رات کے بارہ بجے "ارشاد السالکین" حصہ اول پہ نظر پڑ گئی۔ جھٹ پکڑ لی کہ مسلمان ہونے کے ناطے دینی علم حاصل کرنا نہایت ضروری محسوس ہوا۔ "ارشاد السالکین" کھولی مگر۔۔۔۔۔ مگر یہ محض کتاب نہ تھی' سمندر تھا' کیفیات کا' برکات کا' معلومات کا' رات بھیگ گئی۔ کتاب ختم ہو گئی اور میں گم سم بیٹھی تھی۔ میں! جو کہ علم نفسیات کی طالبہ ہوتے ہوئے فرائڈ کے کچھ نظریات سے چڑ سی گئی تھی اور Brief Introduction of Muslim Psychotherapy پڑھ کر جان چکی تھی کہ علم نفسیات کی روح فقط مسلمان ہی جانتے ہیں۔ روح کے اس معالج' استاد کی کتاب گود میں دھرے اس دن کے زیاں پہ ملول تھی ان کی بات سننے کا موقع گنوا دیا تھا۔ ادراک کیا ہوتا ہے؟ میں نے اس دن جانا۔ تیقن کسے کہتے ہیں؟ مجھے اس رات خبر ہوئی۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ یہ میں جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے کرسی پہ بیٹھے

نجانے کتنا وقت گزرا فجر کی اذان بلکہ اذانیں شروع ہو گئیں۔ اٹھ کر وضو کیا۔ وضو جسے محض نماز کے لئے لازم سمجھتی تھی آج بدن کی طہارت کا ذریعہ محسوس ہو رہا تھا۔ جاء نماز دوست سے ملاقات کے لئے طے شدہ جگہ دکھائی دے رہی تھی اور صلوٰۃ واقعی صلوٰۃ لگ رہی تھی۔

صبح جنجوعہ صاحب کو پیغام بھیجا کہ اب آپ کے شیخ آئیں تو ہمیں بتائیے گا۔ مگر اب کے انتظار اتنا طویل ہو گیا کہ "ارشاد السالکین" ذہن میں دھندلانے لگی۔ بالآخر مہینوں بعد ایک دن اچانک پیغام ملا کہ "شیخ المکرم تشریف لا رہے ہیں"۔ مقررہ وقت پہ پہنچ گئی۔ اصل پروگرام غالباً مردوں کے لئے تھا کہ انہیں ہال میں بٹھا کر ہمیں چقوں کے اس طرف برآمدے میں جگہ دی گئی تھی۔ آج میں پھر لفظ "بیان" کے زیر اثر ذہنی طور پر کسی دھواں دھار تقریر کے لئے تیار تھی۔ جس میں جنت کی حوروں پر حریصانہ تبصرہ اور دوزخ کے عذاب کا خوفناک تذکرہ تو ضرور شامل ہو گا۔ مگر بیان شروع ہوا تو عجب ٹھنڈا میٹھا انداز تھا۔ جیسے کوئی جھرنا وادیوں کو غیر محسوس طریقے سے سیراب کر رہا ہو۔ پس پردہ کہے جانے والے الفاظ دل میں اترتے ہوئے نگاہ سے کئی پردے ہٹا رہے تھے' بار ہا سنی اور پڑھی ہوئی باتوں کو ایک نیا رخ دے رہے تھے۔ وہ اللہ جس سے زندگی میں شاکی بھی ہوئے اور شاکر بھی آج اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ خبر تک نہ ہوئی کہ خبر ہونے لگی ہے۔

لیکچر ختم ہوا تو دل پہ دلنشیں کیفیت تھی۔ "کیسا رہا بیان؟" جنجوعہ صاحب نے ملتے ہی پوچھا۔ "بیان کہاں وہ تو لیکچر تھا"۔ ہم بے اختیار کہہ اٹھے۔ ملنا چاہا تو پتہ چلا کہ آج خواتین کو وقت نہ مل سکے گا۔ سخت رنجیدہ و کبیدہ خاطر ہوئے کہ اتنے اچھے انسان بھی یہاں ہمارے معاملے میں ڈنڈی مار گئے گویا خواتین کی کوئی حیثیت ہی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو بعد میں خبر ہوئی کہ انھیں گوجرانوالہ سے لاہور' لاہور سے

سر گودھا اور سر گودھا سے دارالعرفان ضلع چکوال پہنچنا تھا۔ ایک ہی دن میں تین لیکچر! سخت حیرت ہوئی۔ یہ تو کوئی میکانکی انداز ہوا۔

بہر کیف اگلی مرتبہ چوہدری فقیر اللہ صاحب کے ہاں ملاقات میسر آگئی۔ عجب ملاقات تھی۔ چھوٹی چھوٹی عام فہم سی باتیں تھیں مگر ہر کوئی حسب استعداد انہیں اندر اتار رہا تھا۔

ہم کہ اس دور میں آنکھ کھولنے والے نجانے یہ بدبختی رکھتے ہیں یا خوش بختی کہ جانے پر کھے بغیر عقیدت وابستہ نہیں کر پاتے اور ہمارا یہ جانا پر کھنا بھی محض جاننا پر کھنا نہیں ہوتا بلکہ ہم اگلے کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں' ایک ایک پہلو' ایک ایک بات' ایک ایک اشارہ ہماری خوردبینی نظر میں ہوتا ہے۔ ہم اپنی اصلاح کر پائیں یا نہیں لیکن اگلا کتنا مصلح ہے! یہ فیصلہ کرتے ہوئے ظالمانہ حد تک نکتہ چین ہو جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ہمارے نصاب تعلیم و طرز تعلیم اور کچھ سکھا پائے یا نہیں یہ احساس ضرورت دلاتا ہے کہ

ہم سا ہو تو سامنے آئے

یا یہ کہ

ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

وغیرہ وغیرہ۔

اور اس دن ہم نے بھی ان تمام وظائف و اوصاف سمیت اس ہستی کو دیکھا پر کھا۔ دل میں آنے والا ہر سوال بے دھڑک کیا' عقل میں نہ آنے والی ہر بات بلا جھجھک پوچھی اور پھر۔۔۔۔پھر۔۔۔۔اس علم کے سمندر کے سامنے یہ سر نگوں ہو گیا' نظر جھک گئی' عقل خاموش ہو گئی اور دل۔۔۔۔دل عقیدت' احترام اور محبت کے ایسے جذبات سے معمور ہو گیا جن پر دماغ بھی مطمئن و آسودہ تھا'

لفظ 'حضرت جی' جو پہلی دفعہ سننے پہ عجیب سا محسوس ہوا تھا خوبصورت لگنے لگا۔ جیسے دنیا بھر کی محبت اور جہان بھر کا احترام اس ایک لفظ میں سمٹ آیا ہو اور ------ اور میں نے حضرت جی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

بیعت ہوئے بمشکل تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ میں نے ایک خواب دیکھا جیسے بہت بڑا میدان ہے جہاں نبی اکرمؐ تشریف فرما ہیں۔ تمام انبیاء کرامؑ و اولیاء کرام قطار در قطار سامنے کھڑے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ صرف انبیاء اس میدان میں موجود رہیں باقی سب لوگ چلے جائیں۔ (آپؐ کے الفاظ کی ترتیب ممکن ہے فرق ہو مگر مفہوم یہی تھا)۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ آپؐ انبیاء کرام سے الگ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ قطار در قطار کھڑے لوگ چھٹنے لگتے ہیں اور اس مقدس ہجوم میں میں نبی اکرمؐ کی طرف بڑھتی ہوں۔ میرے ہاتھ میں رول کیا ہوا سفید کاغذ ہے۔ میں اسے نبی اکرمؐ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتی ہوں کہ "یہ میری جائیداد کے کاغذات ہیں۔ آپؐ کسی ادارے کو دے دیجئے"۔ (یہاں میرے دل میں ادارے سے مراد دارالعرفان ہے)۔ آپ نہایت شفقت سے، جیسے کسی بچے سے بات کی جاتی ہے میرے ہی انداز میں فرماتے ہیں "کس ادارے کو؟" میں کہتی ہوں۔ "کسی بھی ادارے کو" (لیکن اب کے بھی دل میں میری مراد دارالعرفان ہی ہے)۔ اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس وقت تو میں نہیں سمجھ پائی لیکن اسکے پانچ سال بعد جب میں اپنے زمیں دارانہ اور "چودھرانہ" خاندانی پس منظر کے باوجود دارالعرفان پہنچ گئی اور دو سال بعد حضرت جی کے آفس ریکارڈ سے مجھے اس خواب کے سلسلے میں لکھا ہوا اپنا ہی خط حضرت جی نے دکھایا تو جیسے تعبیر میرے سامنے آ گئی۔

دارالعرفان باقاعدہ رہائش سے پہلے بھی میں یہاں بارہا آتی رہی، حضرت جی کی

زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا' جانا' ان کے خاندان سے ملی اور پھر یہاں آکر ۹ سال تک انہیں نہایت قریب سے دیکھنے کے بعد میں برملا یہ کہہ سکتی ہوں کہ ان کی زندگی کا جو پہلو' جس انداز سے پہلی دفعہ میرے سامنے آیا تھا۔ ۹ سالوں پہ محیط عرصہ نہایت قریب رہ کر گزارنے پہ آج بھی وہ پہلو اسی انداز میں میرے سامنے ہے اور کسی شخص کی تکلفات سے پاک' سیدھی اور سادہ طرز زندگی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی۔

اس تمام تر عرصہ کے دوران میں نے ان کی زندگی کا ہر رنگ دیکھا۔ غصے کا بھی اور شفقت کا بھی' پیار کا بھی اور درد کا بھی' سختی کا بھی' بشاشت کا بھی اور اداسی کا بھی۔ ہاں اگر میں نے کوئی رنگ نہیں دیکھا تو وہ ہے نفرت کا رنگ۔ سخت غصے اور ناراضگی میں بھی میں نے انہیں ہمیشہ مخاطب کے لئے ایک نرم گوشے کے ساتھ پایا کہ سخت گرجدار آواز کے پیچھے ان کے دل سے نکلنے والی شفقت بھری دعائیں میرے دل نے سنی ہیں۔ کسی سے بہت زچ ہوئے تو بے نیاز ہو گئے لیکن یہ بہت بڑی کمزوری ہے ان میں کہ اس بے نیازی میں بھی ان کے ہاتھ اس کی بھلائی کے لئے' فلاح کے لئے اٹھے بغیر نہیں رہ پائے۔ ہاں یہاں تذکرہ چل نکلا ہے تو یہ بھی بتاتی چلوں کہ ان کی غصہ بھری ڈانٹ ان کی ناراضگی نہیں ہے۔ یہ تو ایک مالی کی محبت بھری تراش خراش ہے اصل ناراضگی کا رنگ بھی عجیب ہے وہ ڈانٹ رہے ہوں' ڈپٹ رہے ہوں تو یہ ناراضگی نہیں اصلی والی ناراضگی میں وہ کچھ بھی نہیں کہتے بلکہ جس سے ناراض ہوں وہ سامنے آ بھی جائے تو ان کی نظر اس پہ یوں پڑتی ہے گویا ہنا سپتی گھی کا ڈبہ پڑا ہو۔ ان کے لئے اس شخص کا موجود ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے اور ایسا وہ محض ظاہر نہیں کرتے کہ محض ظاہر کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں۔ دراصل وہ قطعی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی انتہائی غلط کام کرنے کے باوجود سچے دل سے

پلٹ آیا ہو تو یہی بے نیازی ایسے التفات میں بدلتی ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن لازم یہ ہے کہ آنے والا سچے دل سے لوٹ آیا ہو۔

ایک دفعہ میں نے ایک صاحب کو ایسی غلطی کر کے پلٹتے دیکھا جو محض غلطی نہیں انتہا درجے کی کمینگی بھی تھی اور حضرت جی ہیں کہ گویا اس نے کچھ کیا ہی نہیں میرے سامنے اس کے لئے دعا کی تو میں مطمئن ہو گئی اور بالآخر کہہ اٹھی "جی تسلی ہو گئی" فرمانے لگے "کس بات کی؟" عرض کیا "یہی کہ کل کلاں اپنے ہاتھوں بھی کچھ برا بھلا ہو گیا تو آپ درگزر کی آخر حدوں کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے"۔

حضرت جی کی زندگی ہمہ جہت پہلوؤں سے مزین ہے۔ وہ اگر شیخ کی حیثیت سے خلق خدا کو باطنی علوم سے فیض یاب کر رہے ہیں تو عالم دین کی حیثیت سے دین کے ظاہری علوم بھی بہم پہنچا رہے ہیں وہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ ہونے کی حیثیت سے دین کی راہ دکھانے کے ساتھ ساتھ 'الاخوان' کے امیر ہو کر دنیا میں دین پہ چلنے کا بھی رستہ و سلیقہ سکھانے کے لئے شب و روز کوشاں ہیں۔

وہ شیخ بھی ہیں اور امیر بھی' مفسر بھی ہیں اور مقرر بھی' عالم دین بھی ہیں اور بزنس مین بھی' شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی' مزاح نگار بھی ہیں اور حقیقت نگار بھی' مفکر بھی ہیں اور کالم نویس بھی' سیاح بھی ہیں اور شکاری بھی اور اس سب کے ساتھ ساتھ باپ بھی ہیں اور بیٹا بھی' بھائی بھی ہیں اور خاوند بھی' دوست بھی ہیں اور رفیق بھی' اگر ان کی زندگی کے ہر پہلو پہ لکھنے بیٹھوں تو یہ ایک الگ کتاب بن جائے کہ بلاشبہ وہ منزل بھی ہیں اور نشان منزل بھی لہذا میں یہاں ان تجربات پہ بات کروں گی جن سے میں اپنی مختلف حیثیتوں سے گزری۔

دارالعرفان میں' میں محض صقارہ گرلز ہائی سکول کی پرنسپل کی حیثیت ہی سے نہیں رہ رہی بلکہ مجھے حضرت جی کی ذاتی لائبریری سلسلہ کے شعبہ خواتین کی

ذمہ داری کی ساتھ ساتھ ان کا ذاتی کھانا بنانے کا شرف بھی حاصل ہے کہ ذیابیطس اور کولسٹرول کے مسئلہ کی وجہ سے انہیں پرہیزی کھانا دیا جاتا ہے۔ اور مجھے ان چاروں شعبوں میں الگ الگ حیرت انگیز تجربات ہوئے۔ جن میں سے سب سے حیرت انگیز تجربہ مجھے باورچی خانے کا ہے۔ گزشتہ تمام تر عرصہ میں، میں نے بارہا آزمایا ہے کہ ان کا کھانا بناتے وقت اگر بے معنی فضول گفتگو کر بیٹھیں تو کھانا کتنا ہی لذیذ کیوں نہ بنے وہ نہیں کھاتے 'کھا ہی نہیں پاتے۔ اس صورت میں یا تو کسی سبب وہ سرے سے کھانا کھاتے ہی نہیں اور اگر میز پر آبھی جائیں تو انہیں اس وقت کا وہ کھانا سخت بے مزہ لگتا ہے خواہ سبھی کہتے رہ جائیں کہ سالن مزیدار ہے وہ پہلے لقمے کے بعد دوسرا لقمہ ہرگز نہیں لیں گے۔ ایسے میں وہ چھلے ہوئے پیاز کو میز پر رکھ کر مکہ مار کر توڑلیں گے اور اس کے ساتھ یا پھر محض لسی کے ساتھ روٹی کھا لیتے ہیں یہ تجربہ اتنی دفعہ ہو چکا ہے کہ اب میں ان کے لئے کھانا بناتے وقت سبزی کاٹنے سے لے کر ڈونگے میں سالن نکالنے تک مسلسل درود شریف پڑھتی رہتی ہوں۔

دوسری بات جس نے مجھے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ ان کی مردم شناسی ہے۔ اس معاملے میں مجھے بارہا فرمان خداوندی یاد آیا ہے کہ

مومن کی فراست سے ڈرو تحقیق وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے

وہ انسان کو اتنا جان لیتے ہیں جتنا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں جان رہا ہوتا۔ انسانوں کے بارے میں ان کی رائے اس حد تک صائب ثابت ہوتی ہے کہ کبھی کبھی بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ان سے جا کر اپنے بارے میں ان کی رائے پوچھوں کہ خود شناسی کا لاکھ دعویٰ رکھنے کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ہاں یہ عجیب بات ہے کہ اگر کوئی اپنے طور پر انہیں دھوکا دینے کی کوشش کرے (جی ہاں لوگ انہیں بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں) تو وہ خاموشی سے

اس کی بات سنے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب ان سے بات کر رہے تھے اور وہ مسکرا مسکرا کر سنے جا رہے تھے۔ جب وہ اٹھ کر گئے تو میں بے اختیار کہہ اٹھی "حضرت جی یہ شخص جھوٹ بول رہا تھا' مسکرا کر بولے "جانتا ہوں"۔ عرض کیا" مجھے سخت حیرت ہو رہی تھی کہ آپ کی معیت نے مجھے یہ شناخت دے دی ہے تو کیسے ہو سکتا ہے آپ نہ جانتے ہوں؟ مگر پھر آپ چپ کیوں رہتے ہیں؟" فرمانے لگے "مجھے حیا آجاتی ہے"۔ "خواہ اسے شرم نہ آئے" میں نے احتجاج کیا۔ اطمینان سے بولے "وہ اس کا کردار ہے"

وہ غضب کے مردم شناس ہیں جبھی تو انسانی جذبات و احساسات کو جاننے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ وہ ایک عورت کے احساسات یوں جان رہے ہوتے ہیں جس طرح کسی عورت کو جاننا چاہئیں۔ وہ بچے کے جذبات اس طرح تسلیم کرتے ہیں جیسے اسی کے دور میں جی رہے ہوں۔ وہ نوجوانوں کی کیفیات یوں جان لیتے ہیں گویا انھیں کے ہم عمر ہوں اور جوانوں کی خواہشات کو اس طرح مانتے ہیں جیسے اپنی خواہشات کو مانا اور جانا جاتا ہے۔ جبھی تو کسی بھی عمر کے بندے کو ان سے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ وہ دل کے جہاں کو دل کی نظر سے دیکھ لیتے ہیں جبھی تو آپ خوش ہوں یا اداس' مغموم ہوں یا بشاش ہر حال میں انھیں بہترین ساتھی' خیر خواہ' دوست اور راہنما پاتے ہیں۔

ان کی معیت میں گزرے ۹ سالوں میں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی انہیں کچھ بتانا پڑا ہو۔ انہوں نے ہر کیفیت کو چہرے سے پڑھ لیا ہے۔ انہوں نے میرے دیگر رہائشی سٹاف ممبرز سمیت ہماری ہر ضرورت اور خواہش کو اسی وقت اور اسی لمحے پورا کیا ہے جس وقت اور جس لمحے وہ زبان سے بھی پہلے ہمارے چہرے پہ آتی ہے۔

حیثیت پرنسپل صقارہ گرلز ہائی سکول میں نے انہیں بہترین سرپرست اعلیٰ اور باس پایا ہے انہوں نے ادارے کے کسی کام میں نہ تو خود کوئی بے جا بات مجھ پر مسلط کی

ہے اور نہ ہی اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار (خواہ وہ اولاد ہی کیوں نہ ہو) کو مسلط کرنے دی
ہے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ میں نے ان کی سگی بھتیجی کو نویں کلاس میں داخلہ کے
لئے ناموزوں قرار دے دیا اور مجھ سے کسی نے بھی کسی قسم کی باز پرس نہیں کی۔ ہاں
انہیں مجھ سے بہترین رزلٹ دینے کی توقع ہوتی ہے اور سالانہ نتائج میں ایک بھی بچہ
فیل ہو تو میں اس کے لئے جوابدہ ہوں کہ سال بھر میرے پاس رہ کر بھی بچہ فیل کیوں
ہوا؟ انہیں لائق 'پر اعتماد' حاضر جواب ذہین اور بشاش بچے بے حد پسند ہیں۔ ان کی
دلی خواہش ہوتی ہے کہ ادارے کے طلبہ و طالبات بورڈ میں پوزیشنز حاصل کریں'
تقریری مقابلوں میں پیش پیش ہوں اور اپنی کلاس کے لحاظ سے وہ دینی علوم سے بہرہ
ور ہوں۔ بہترین اخلاق رکھتے ہوں۔ جہاں تک ان کی ذاتی لائبریری کا تعلق ہے۔
ان کے پاس کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ ہے جس میں تفسیر 'فقہ تصوف' طب 'منطق'
صرف و نحو 'ادب' تاریخ 'سیرت' رد فرقہ باطلہ ' رد قادیانیت' ملفوظات و مکتوبات'
کتب شیعہ 'انگریزی کتب' انسائیکلو پیڈیا اور متفرقات کے شعبہ جات شامل ہیں۔

میں نے کتاب کو ان کی بہت بڑی کمزوری پایا ہے۔ وہ کتاب کا ورق موڑنے یا
الٹا رکھنے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں سے پڑھتے ہوئے چھوڑنا
پڑے اس کا صفحہ نمبر یاد رکھو یا پھر وہاں کوئی نشانی رکھ جاؤ لیکن کتاب کو بند کر کے رکھو
کتابوں سے بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ یا بے مقصد ' ورق گردانی بھی انہیں پسند نہیں۔ خود
انھیں اردو' فارسی' عربی' پشتو' انگریزی اور پنجابی پہ دسترس حاصل ہے لہٰذا ان کے
پاس ان میں سے ہر زبان کی کتاب موجود ہے جن میں سے اکثریت عربی اور فارسی کی
کتب پہ مشتمل ہے۔

وہ علم کا ایک سمندر ہیں اور برکات کا بحر بیکراں۔ میں نے اس در پہ جہاں قلوب
کو سیراب اور اذہان کو بیدار ہوتے پایا ہے وہاں اجسام کو صحتیاب ہوتے بھی دیکھا ہے۔

اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ شیخ سے محض دنیا کی بات کرنا سنار سے مولیوں گاجروں کے بھاؤ پوچھنے کے مترادف ہے لیکن پھر بھی بشری کمزوری کے تحت 'دکھوں سے مغلوب بہت سے لوگ بے شمار مسائل اور بیماریوں کے لئے تعویذ لینے پہنچ جاتے ہیں۔

شعبہ خواتین میں یہ تعویز میں نے اپنے ہاتھوں بہت سی عورتوں کو لا کر دیئے ہیں اور خود اپنی آنکھوں سے کینسر تک کے مریض شفایاب ہوتے دیکھے ہیں۔ لیکن یہاں دوسروں کے بجائے میں اپنا ذاتی تجربہ سنانا پسند کروں گی۔ ایک دفعہ مجھے پٹھوں کے شدید کھچاؤ کی تکلیف کچھ اس حد تک ہوئی کہ اپنے ہاتھوں کھانا پینا بھی محال ہو گیا۔ ہر طرح سے علاج کر دیکھا کسی نے نروز (Nerves) کا مسئلہ بتایا اور کسی نے Muscles کا۔ حتیٰ کہ آرتھوپیڈک سرجن اس نتیجے پہ پہنچا کہ ریڑھ کی ہڈی کے مہرے میں نقص ہے۔ یہ سن کر میں زیادہ گھبرائی اور بالآخر حضرت جی سے بات کی۔ انہوں نے ایک مٹیالہ اور کچھ کچھ سفید سا پتھر دم کر کے دیا کہ تکلیف کی جگہ پر پھیرتی رہوں۔ میں جوں جوں پتھر پھیرتی گئی تکلیف رفع ہوتی چلی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ پتھر حیرت انگیز طور پر سرخ ہوتا چلا گیا اور بالآخر اس کی رنگت بہشتی میں تادیر تپنے والے پتھر کی سی ہو گئی۔ ہاں اس دوران وہ وقتی طور پر گرم بھی ہو جاتا رہا۔ وہ پتھر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اسے تندرست عضو پہ پھیرو تو جوں کا توں رہتا ہے لیکن تکلیف کی جگہ پر پھیرو تو سرخ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس حد تک افاقہ ہوا اس حد تک اس کی رنگت بدل جاتی ہے۔

شعبہ خواتین کے حوالے سے یوں تو مجھے بے شمار دلچسپ اور سبق آموز تجربات ہوئے لیکن ان میں سے دو ایسے ہیں جو تادم مرگ بھلانا مشکل ہیں۔ ایک دفعہ ایک بی بی اپنی ایم۔ اے اسلامیات کی طالبہ بیٹی کو لے کر آئیں۔ اُسے جنوں

کی شکایت تھی۔ حضرت جی کا اصرار تھا کہ تعویزوں کے ساتھ ساتھ ذکر الٰہی کا معمول جاری رکھو لیکن وہ نہ تو تعویز باقاعدگی سے پیتی تھی اور نہ ہی ذکر کرنے پر آمادہ تھی۔ اس پر ایک روز حضرت سخت خفا ہوئے کہ خدا کے لئے نہ سہی اپنے لئے ہی اسے یاد کر لیا کرو۔ وہ واپس گئیں اور اگلے ہی دن انہوں نے میرا دروازہ آن کھٹکھٹایا۔ دسمبر کی صبح کے چھے بجے کا وقت تھا۔ میں گھبرا کر اٹھی تو آگے خاتون کو سخت پریشان کھڑے پایا۔ کہنے لگیں۔ "میری بچی کو جن اٹھا کر لے گئے ہیں"۔ میرے لئے یہ ناقابل یقین اور ناقابل فہم قسم کی بات تھی۔ اس نے قسمیں کھا کر کہا کہ بچی غسلخانے میں نہانے گئی۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد دروازہ توڑ کر دیکھا تو غائب تھی۔ وہ غریب بری طرح رو رہی تھی کہ خاندان، محلے اور علاقے میں کون مانے گا کہ بچی اس طرح غائب ہوئی ہے! بہر کیف حضرت جی کو اطلاع کی۔ فرمانے لگے۔ گھر جاؤ وہ چھوڑ جائیں گے لیکن پھر فوراً یہاں آنا کہ اس چار دیواری میں انسان جنوں تک سے محفوظ رہتا ہے اور اس کا ہفتہ بھر یہاں رہنا ضروری ہو گا۔ اگلے دن وہ ماں بیٹی آگئیں۔ بیٹی سے تو بات کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی لیکن ماں نے بتایا کہ اسکے گھر جانے پہ کال بیل بجی۔ دروازہ کھولا تو ایک بڑی سی چادر میں لڑکی کو گٹھڑی کی صورت بندھا ہوا پایا۔ اسکے بعد انہوں نے ذکر اور تعویزوں میں ناغہ نہ کیا اور ٹھیک ہو گئی۔

دوسرا واقعہ نوعیت کے لحاظ سے کچھ عجیب سا ہے۔ سالانہ اجتماع تھا میں خواتین کا پیریڈ لے کر اٹھی تو ایک تقریباً ساٹھ سالہ خاتون نے مجھے روک لیا اور حضرت جی سے کچھ وقت لے کر دینے کی درخواست کی۔ میں نے کہا کہ اجتماع پہ وہ وقت ہرگز نہ دیں گے کہ یہ مکمل طور پر روحانی تربیتی کورس ہے۔ اس میں وہ دنیوی مسائل نہیں سنتے۔ وہ خاتون مجھے ایک طرف لے گئیں اور 1200 روپے

دے کر بولیں "یہ فنڈ کے لئے حضرت جی کو دینا اور وقت کی بات ضرور کرنا"۔ عرض کیا "جی رقم تو پہنچادوں گی لیکن وقت ملنا محال ہے"۔ کہنے لگیں "آپ یہ پیسے دے کر بات تو کریں"۔ مفہوم یہ تھا کہ وہ خوش ہو کر بلا لیں گے او رمسئلہ سن لیں گے۔ ایک لمحے کو تو مجھے آگ سی لگ گئی اور دل چاہا کہ کچھ سناڈالوں۔ لیکن انہوں نے بات واضح نہ کی تھی لہذا یہ بڑا سا گھونٹ بھر کر پلٹ آئی۔ میں نے وہ رقم دینے سے پہلے خاتون کا نام لینا چاہا تو حضرت نے بے نیازی سے فرمایا "جس کسی نے بھی دیئے ہیں اللہ کی راہ میں دیئے ہیں تعارف کی ضرورت نہیں"۔ میں نے رقم تھمانا چاہی تو فرمایا "میرے آفس میں احمد نواز کو دے آؤ"۔ اس کے بعد خاتون کے لئے وقت مانگا توانہوں نے ایک سنجیدہ سی نظر مجھ پر ڈالی' عرض کیا کہ "میں نے تو خاصا سمجھانا چاہا کہ اجتماع میں وقت نہیں مل سکتا لیکن انہیں شاید کچھ شدید نوعیت کی پریشانی ہے"۔

فرمانے لگے "میرے دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ یہ خواتین فضول دنیوی مسائل میں خود کو الجھا کر اپنا اور میرا وقت بھی ضائع کرتی ہیں۔ ان سے کہو گھر جا کر خط لکھ دیں"۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ پورا ہفتہ خواتین کو اجتماعی طور پر حضرت کو سلام کرنے کا موقع بھی ملا تو وہ خاتون اس وقت پر یا تو اتفاقاً باتھ روم میں تھی یا پھر باہر۔ وہ ملنا تو دور کی بات حضرت جی کو دیکھ بھی نہ پائی اور اجتماع کے کچھ عرصہ بعد ان کی وفات کی خبر سن لی گویا مرتے دم تک انہیں حضرت کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

اس سب کے باوجود میں ایک بات ضرور کہوں گی کہ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ اتنے عرصہ سے شیخ المکرم کے پاس ہیں ان کی کوئی کرامت سنائیے تو میں یہ کہتی ہوں کہ میرے شیخ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ میں نے یہاں لوگ بدلتے دیکھے ہیں آج سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں جو امیر جماعت یا صاحب مجاز کی حیثیت سے لوگوں کی راہنمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کی گزشتہ زندگیاں دیکھیں

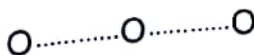
تو پتہ چلتا ہے کہ میرے شیخ نے لوگوں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں بٹھادیا ہے۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے رہبر بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

تصوف جسے خود میں بھی مافوق الفطرت اور پر اسراریت سے بھرپور شعبہ سمجھا کرتی تھی اپنے اللہ کو جاننے' اسکے قریب جانے کا سب سے آسان' سیدھا اور سچا راستہ دکھائی دینے لگا ہے۔ زندگی جو محض پیدا ہو کر کھا' پی کر مر جانے کے تصور سے عبارت تھی' کسی کو کھوجنے' ڈھونڈنے' پانے اور پھر اسی کے نام پہ مر جانے کا نام دکھائی دینے لگی ہے۔ سانسیں! جو محض آکسیجن و کاربن ڈائی آکسائیڈ کے دخول و خروج کا نام تھیں کسی کی یاد کی خوشبو میں رچنے لگی ہیں۔ دل محض' پمپنگ مشین ہی نہیں کسی کا مسکن لگنے لگا ہے۔

''اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے'' قسم کے احساسات ''بھیجے اور پھر پاس بلانے جانے'' کے فخر میں بدل گئے ہیں۔ روح کا گہرائیوں اور قلوب کا پنہائیوں تک بدل جانا اور بدل ڈالنا ہی تو اصل کرامت ہے

اس سے بڑی کرامت اور کیا ہو گی؟



بابِ عمل

تنظیم الاخوان

سب سے پہلے اپنی ذات پر نفاذ اسلام اور اسے ایسی
اسلامی ریاست بنانا جس پر اسلام کی حکومت ہو!

پھر اس حکومت کی سرحدیں اپنے خاندان، دوست
احباب اور اپنے متعلقین تک وسیع کرنا!

پھر وطن عزیز پر غلبہ اسلام کے لئے میدان عمل میں
اترنا اور تن، من، دھن کی بازی لگا دینا:

پھر اسلام کو روئے زمین پر غالب کرنے کی جدوجہد
میں "غازی یا شہید" کے جذبہ سے کود پڑنا!

تنظیم الاخوان کا تعارف!

امیر الاخوان کے اپنے الفاظ میں! (سلسلہ کے ساتھیوں سے خطاب)

حقیقت میں تو اس تحریک کی بنیاد ۱۹۵۲ء میں اس وقت پڑی جب اللہ کے ایک برگزیدہ بندے نے پہلے شخص کو یوں دعوت دی کہ "آؤ! میں تمہارے قلب کا تزکیہ کروں" اور جب حلقہ احباب بڑھنے لگا تو اپنی رائے کا یوں اظہار فرمایا "میں سنگریزے اکٹھے کر رہا ہوں۔ ان ہی سنگریزوں میں سے لعل و جواہر نکلیں گے جو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیر بدل کر رکھ دیں گے۔

اس وقت سے تزکیہ و تربیت کا عمل جاری ہے۔ ان کے اکٹھے کئے ہوئے سنگریزے تربیت کی بھٹی سے نکل کر، ہزاروں کی تعداد میں لعل و جواہر بن کر میدان عمل میں آگئے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟

محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے جاں نثاروں کی جس جماعت کی تشکیل فرما کر کفر کو اسلام میں بدلا اور اللہ تعالیٰ کے نظام کو قائم کیا، یہ گروہ ان ہی کے نقش قدم پر چلنے، وہی جذبات، وہی عشق رسول، اسلام سے وہی والہانہ وابستگی کے ساتھ، کفر کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے نظام کو خدا کی زمین پر دوبارہ قائم کرنے کی دیوانگی سے سرشار صوفیاء کا ہے، یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جن کو

اپنی ذات کے لئے کسی دھن ودولت 'یا شہرت کی تمنا نہیں۔ کسی اقتدار 'کسی کرسی کی خواہش نہیں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اتنی چھوٹی' معمولی اور وقتی خواہشوں سے بہت بالاتر ہیں۔ اسلام کو قائم کرنا' اسلام کو قائم رکھنا اور اسلام کو اس کرہ ارض پر غالب کرنا ان کا مقصد حیات ہے۔ اس کے سوا کسی اور مقصد کے لئے زندہ رہنا ان کی لغت میں نہیں۔

تنظیم الاخوان دوسری تنظیموں اور تحریکوں کے مقابلے میں کئی منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔ اس میں ہر مکتب فکر کے علماء صوفیاء اور دانشوروں کے علاوہ دنیاوی علوم وفنون کے ہر شعبے کے ماہرین' صنعت و تجارت سے وابستہ افراد اور زندگی کے ہر کام اور شعبے سے وابستہ ہر درجے کے لوگ جو رزق حلال کماتے ہیں۔ شامل ہیں۔

الاخوان کے تمام ذمہ دار ارکان' موجودہ دور کے ہر سیاسی نظریئے' جماعتوں سماجی اور معاشرتی اور مذہبی فرقہ بندیوں سے آزاد ہیں۔ اللہ اور اس کی وحدانیت پر' محمد الرسول اللہ ﷺ کی نبوت' ان کے اسوۂ حسنہ سے' ان سے جاری برکات اور فیوضات پر' قرآن' قرآن کے تمام احکامات پر اور قرآن کے دیئے نظام حیات پر' باعمل ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی حکمرانی کو اس کرہ ارض پر قائم کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کئے ہوئے ہیں۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ روئے زمین پر بے شمار وسائل کے باوجود مسلمانوں کے پاس ایک گاؤں بھی ایسا نہیں جہاں اسلام نافذ ہو۔ اس تحریک کی بنیاد ہی یہ ہے کہ جہاں بے شمار کفرستان نظر آتے ہیں۔ وہاں کم از کم ایک "اسلامستان" بھی ہونا چاہئے جو مخلوق عالم کے لئے ایک مثال کی حیثیت رکھے کہ وہ خواہ چند افراد ہوں' ایک گاؤں ہو' ایک شہر' ایک بہت بڑا ملک ہو۔ یا ساری دنیا ہو۔ سب سے پہلے ہمیں

مسلمانوں کے ذہن سے اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے، اسلام کو کسی نوعِ انسان سے کوئی خطرہ نہیں۔ ہم جو خود کو مسلمان کہتے ہیں اس وقت ہماری بقا خطرے میں ہے اور ہم اسلام کی پناہ کے محتاج ہیں۔ اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ "وہ اپنے دین کو رسوا نہیں کرتا۔ جو لوگ رسوائی قبول کر لیتے ہیں اللہ ان سے اپنا دین ضبط کر لیتا ہے۔ مسلمانوں نے یہی طرزِ تغافل اپنایا تو تمام مسلمان ریاستیں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئیں۔" ایک بار پھر جب مسلمان اسی طرزِ تغافل کا شکار ہوئے تو انگریز نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کی مرکزیت' ان کی خلافت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ "ہم جو صدیوں سے مسلمانی کے دعوے دار ہیں لیکن اسلام کے بجائے کافروں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ تو کافروں کے دامن میں پناہ لینے والوں کو اللہ اپنی سرزمین پر پناہ نہیں دے گا۔ اسے ایک بار پھر کفار کے ہاتھوں تباہ کر دے گا۔ اس لئے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنے اس رویئے پر نظرِ ثانی کرنا ہو گی۔ یہ ہمارا فریضۂ دین ہے کہ ہم دنیا بھر کے مسلمانوں کو بیدار کریں اور اس رویہ کو تبدیل کرنے کے لئے تیار کریں۔

مسلمانوں کو ایک بہت بڑا مغالطہ دے دیا گیا ہے کہ مذہبی اور دین دار لوگوں کی جگہ صرف مسجد ہے ان کو دنیا کے معاملات' سیاسیات اور حکومت سے کیا واسطہ........ رسول اللہ ﷺ نے ریاست بنائی۔ قانون نافذ کئے۔ بادشاہوں سے معاملات کئے' صلح و جنگ کے معاہدے لکھے۔ بنفسِ نفیس جہاد کئے۔ پوری بھرپور سیاسی زندگی گزار کر معاشرے کو اسلامی ریاست دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا دین دار کون ہو سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ سے ہٹ کر مذہب اور دینداری کا دعویٰ کیسا؟ مسلمان کے ذہن سے دین کے جامد اور محدود مذہبی تصور کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اور اسے اسلام کے حقیقی' جامع' عملی اور متحرک

تصور میں بدلنا ہے۔

" یہ ہمارا فریضہ دین ہے۔ اور ہماری دینی زندگی کا مدار اسی پر ہے کہ ہم کم از کم اس ملک خداداد کو اسلامی ریاست بنائیں۔ حکومت ہمارا مقصد نہیں کہ کس فرد کو ملے۔ آپ کو ملے اس سے ہماری غرض نہیں۔" ہم ایک اسلامی ریاست کا قیام چاہتے ہیں۔ جہاں اسلامی قوانین پر عمل ہو اور اسلام کو عملی طور پر اس زمین پر رائج کریں۔

اسلام کو مغرب والوں کی نظر سے مت دیکھئے۔ یہود کی نظر سے مت دیکھئے۔ انسان کی نظر سے دیکھئے۔ اپنی نظر سے دیکھئے۔ لاؤڈ سپیکر کی گونج میں تلاش کرنے کے جائے اپنے دل میں جھانک کر تلاش کیجئے۔ دور حاضر کے خطیب کے من پسند موضوعات 'قہر و غضب جہنم کے شعلوں میں جلتے جسم اور 'ایسے اور خوفناک مناظر' میں اللہ کو ڈھونڈنے کی جائے مسلمان کے قلب کی گہرائیوں میں ڈھونڈیئے۔ اسلام کا اللہ تو بہت ہی رحیم ہے۔ بہت ہی کریم ہے۔ سراپا محبت ہے۔ پیار کرنے والا ہے۔ انسان اس کی ایک شاہکار تخلیق ہے وہ اپنی اس تخلیق کو پھولتا پھلتا' ہنستا کھیلتا اور خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اللہ نے اپنی مخلوق کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنا بہترین اور پسندیدہ نظام "اسلام" دیا۔

اللہ ہمیں اس کی توفیق دے ہم نے اس جہاد کی ابتدا کر دی ہے۔ اب ہم ہی وہ لوگ ہیں جن کو نہ صرف اللہ کے نزدیک سربلندی نصیب ہوگی' بلکہ تاریخ بھی مدتوں یاد رکھے گی۔ کہ کچھ لوگوں نے کفر کی تباہی کی طرف کدال اٹھائی تھی اور بالآخر ظلم کا بہت بڑا مسمار ہو کر رہا۔ اب میں آپ کو حضرتؒ کے حوالے سے جماعت اور تنظیم الاخوان کے باقاعدہ آغاز کے بارے میں بتانا چاہوں گا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ امت مسلمہ کے پاس یہ کمال ہمیشہ رہا ہے کہ ان

کا اپنے نبیؐ سے رابطہ کبھی منقطع نہیں رہا۔ ہر عہد میں ایسے لوگ رہے جنہوں نے قرآن کا معانی اور ترجمہ نبی کریمؐ سے پڑھا' ایسے لوگ رہے جنہوں نے احادیث کی شرح خود نبی کریم سے حاصل کی اور بااجماع امت اولیاء اللہ کا کشف بر حق ہے۔ نبی اور ولی کے کشف میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نبی کو غلطی نہیں لگتی ولی کو غلطی لگ سکتی ہے۔ اس لئے ولی کا کشف محتاج ہوتا ہے' نبی کے ارشادات کی حدود کا۔ اگر آپؐ کے حکم کے مطابق ان حدود کے اندر آپ ہی کے کسی حکم کی وضاحت ملتی ہے تو صاحب کشف مکلف ہے اس کشف کو ماننے کا دوسرا نہیں۔ لیکن خود صاحب کشف نہ مانے تو نہ صرف گناہگار ہوگا بلکہ اس پر عذاب بھی وارد ہوگا۔ نبی کا کشف جو ہوتا ہے وہ وحی الٰہی ہوتا ہے پوری امت مکلف ہوتی ہے اس کو ماننے کی اور نہ ماننے والا فاسق و فاجر کہلاتا ہے، ولی کا کشف الٰہی اپنی صحت کے لئے نبی کے ارشادات کا محتاج ہوتا ہے صاحب کشف کے کشف پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نہ مانیں تو اس پر دنیا میں عذاب آجاتا ہے دنیاوی مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں دنیاوی نقصانات ہوتے ہیں آخرت کا معاملہ رب کریم کے پاس ہے لیکن دوسرے لوگوں کی پسند پر ہوتا ہے کہ وہ اس کیساتھ تعاون کرتے ہیں اس کے کشف کو مانتے ہیں یا نہیں مانتے مگر۔ نبی (کے کشف) کی طرح ولی کے کشف کو ماننے کے محتاج نہیں ہوتے ہیں۔

نبی اکرمؐ جب کسی کو پسند فرماتے ہیں تو ان حدود شریعہ کے اندر جو متعین وطے شدہ ہیں کسی کام کو کرنے کا حکم اپنے امتیوں کو اب بھی دیتے ہیں امتی اسی پر عمل بھی کرتے ہیں اور اس پر عمل کرنا ضروری بھی ہوتا ہے۔

اس ضمن میں مصر کے حکمران نور الدین زنگی کا واقعہ کون نہیں جانتا۔ جسے آپؐ نے خواب میں اپنی زیارت سے مشرف فرما کر ان دو عیسائی مشرکوں کی نشاندہی کی جو آپؐ کی قبر کھودنے کا شیطانی منصوبہ لے کر مدینہ آئے تھے' آپؐ نے نور الدین

زنگی کو نہ صرف ان کی نشاندہی کی 'بلحہ حکم دیا کہ فوراً جاؤ اور انہیں کیفر کردار تک پہنچاؤ۔ تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپؐ کسی کام کرنے کا حکم اب بھی اپنے امتیوں کو دیتے ہیں اور اسے پسند بھی فرماتے ہیں۔

حضرت شیخ نے اپنی تعلیم بڑے کٹر قسم کے دیوبندی استاد سے مکمل فرمائی اور بڑے سخت قسم کے مفتیان کرام تھے، حتیٰ کہ آپ کے اساتذہ میں مفتی کفایت اللہ دہلوی مرحوم شامل ہیں جو پورے برصغیر کے مانے ہوئے مفتی تھے۔ اور بڑے سخت قسم کے لوگ تھے اور بڑے سخت مواحد اور رسومات اور بدعات کے خلاف 'ان کا رویہ اتنا سخت تھا کہ جو خود صوفی نہیں تھے اور صاحب کشف نہیں تھے وہ تصوف کے خلاف کام کرتے تھے، تصوف کو بھی ایک رواج یا ایک خرابی کا سبب سمجھتے تھے اس لئے کہ تصوف کے نام پر جعلسازی بہت ہو گئی تھی اور حضرتؒ بھی ان متشددین میں سے تھے جو صوفیوں اور تصوف کے خلاف رہے۔ کسی کام کے سلسلے میں آپ ایک جگہ تشریف لے گئے وہاں حضرت خواجہ عبدالرحیمؒ سے آپ کی ملاقات ہو گئی انہوں نے فرمایا کہ میں عالم تو ہوں نہیں لیکن بات چل رہی تھی فرمایا برزخ کی حیات کی، اور اہل قبور سے بات کرنے کی تو انہوں نے کہا بیٹھئے مولانا آپ (حضرتؒ) اس موضوع پر دلیلیں دے رہے تھے کہ یہ ممکن نہیں ہے، برزخ ایک الگ جہان ہے الگ دنیا۔ دنیا والوں کا برزخ والوں کے ساتھ کیا تعلق انہوں نے کہا یار میں مولوی تو ہوں نہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے شیخ جو ہیں وہ دفن ہیں میں دنیا میں زندہ ہوں میں تو ساری باتیں ان سے پوچھ کر، کرتا ہوں اور وہ سارے معاملات میں رہنمائی فرماتے ہیں مجھے سبق بھی پڑھاتے ہیں مجھے اللہ اللہ بھی سکھاتے ہیں مجھے مراقبات بھی کرواتے ہیں آپ کہتے ہیں ایسا ہو نہیں سکتا اب جو ہو رہا ہے میرے ساتھ اس کا انکار میں آپ کی دلیلیں سن کر کیسے کروں، یہ اتنی وزنی دلیل تھی

کہ اس نے حضرتؒ جیسے عظیم اور مضبوط انسان کو ہلا کر رکھ دیا کہ بندہ جھوٹ بولنے والا نہیں ہے اور یہ جس سادگی سے اور جو کچھ کہہ رہا ہے اسے رد کرنا آسان نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ باباجی اگر آپ کو ہو سکتا ہے تو پھر مجھے بھی ہونا چاہئے میں بھی تو امتی ہوں اس نے کہا کہ مولانا آپ بھی آجائیں آپ بھی کریں اللہ' اللہ آپ کو بھی ہو سکتا ہے، یہ تھی آپؒ کی ذکر الٰہی کی ابتدا اور پھر جیسا کسی کا مزاج ہوتا ہے سخت مزاج لوگ کسی کام کی طرف جب لگتے ہیں پوری سختی سے لگتے ہیں آپ نے جب شروع کیا تو پندرہ سال تک سوائے ذکر اذکار کے آپ نے کوئی کام نہیں کیا رات رات بھر دن دن بھر شیخ کے پاس رہنا تین تین مہینے چھ چھ مہینے رہنا خود تین مہینے بعد گھر کا چکر لگا لیا زمین دار تھے زمین سے آمدن آجاتی تھی دال روٹی چلتی تھی پھر چلے گئے۔ ۱۵ سال اس حال میں گزر گئے آپؒ صاحب حال ہو گئے صاحب مشاہدات ہو گئے مکاشفات ہو گئے ۱۵ سال بعد آپ اپنے گھر اپنی مسجد میں آئے 'لیکن وہاں بھی رویہ وہی تھا جیسے شیخ کے پاس رہنے میں تھا۔ تب آپؒ فرماتے ہیں بارگاہ نبویؐ میں شام کے ذکر کے بعد میں حاضر ہوا دربار نبویؐ لگا ہوا تھا، فنافی الرسول کی جیسے معمول کی حاضری ہوتی ہے نبیؐ نے مجھے مخاطب نہیں فرمایا لیکن میں حاضر کھڑا تھا میں سن رہا تھا اور حضورؐ شکایتاً فرما رہے تھے اور یہ آپ کی عادت مبارکہ دنیاوی حیات میں بھی تھی کہ جب کوئی بات کسی کی پسند نہیں آتی تو عموماً ساری مجلس سے خطاب فرما کر بات کرتے تھے کہ یار یہ بات اچھی نہیں کسی ایک آدمی کو حضورؐ نامزد نہیں فرماتے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا یہ آپؐ کا مزاج عالی تھا یہ کرم تھا آپ کے مزاج میں عفو و در گزر تھی کہ ایک بندہ شرمندہ نہ ہو یا اس پر بوجھ نہ آئے، تو ایک اجتماعی صورت میں آپ ارشاد فرماتے ہیں اور وہ بندہ محسوس کر لیتا تھا کہ قصور مجھ سے ہوا ہے، تو حضورؐ فرما رہے ہیں تب ملک تقسیم ہو گیا تھا اور بڑا زور تھا شیعیت کا یہ ملکی تاریخ کا حصہ ہے میں

اس میں پڑنا نہیں چاہتا لمبی بات ہو جائے گی، تو شیعہ کے بڑے مقالے بڑے نامور علماء بڑے جلسے بڑی اخبار یں بڑا سب کچھ ہو رہا تھا اور اہل سنت کی طرف مقابلے کے کوئی خاص لوگ نہیں تھے، سستی تھی تساہل تھا سیٹلمنٹ ہو رہی تھی، مہاجر آرہے تھے کہیں جگہ مل رہی تھی کوئی اپنے کام میں لگے ہوئے تھے تو آپ فرماتے ہیں میں بارگاہ نبویؐ میں حاضر تھا اور حضورؐ فرمارہے ہیں کہ یہ جو اسلام ہے اگر یہ ایک عمارت ہے تو اس میں اینٹیں پتھر نہیں لگے بلکہ میرے صحابہ کی ہڈیاں ہیں اس میں مٹی اور پانی کا گارا نہیں لگا بلکہ میرے صحابہ کا گوشت اور ان کا خون جو ہے اس کا گارا لگا ہے تب یہ عمارت جا کر بنی ہے آج لوگ سر عام میرے صحابہ پر طعن کرتے ہیں ان کی توہین کرتے ہیں انہیں مرتد بتاتے ہیں انہیں کافر کہتے ہیں اور علماء گوشہ نشین ہیں اور ذکر اور مراقبے کرتے ہیں کہ ہمارا کشف خراب نہ ہو لیکن یہ یاد رکھیں کہ کل میدان حشر میں انہیں میرے سامنے بھی آنا ہے مجھے اپنے صحابہ کی عزت سے کسی کا کشف زیادہ عزیز نہیں ہے، یہ وہ دن تھا جب ایک عالم جو سارا میدان چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا تھا وہ اپنا گوشہ چھوڑ کر میدان میں اتر آیا اور پھر پوری زندگی آپ نے وصال تک ۸۷ برس کی عمر تک وہیل چیئر پر بیٹھ کر بھی کام کیا، لوگوں سے ملے مناظرے کئے مقابلے کئے جلسے کئے ساری ساری رات معمولات ہوتے تھے ذکر اذکار ہوتے تھے سارا سارا دن جلسے ہوتے تھے سفر ہوتا تھا ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری سے تیسری جگہ اور زمانہ ایسا تھا ہر جگہ کو نیئس نہیں ہوتی تھی پیدل جایا کرتے تھے ہم، پھر لڑائیاں ہوتی تھیں مقابلے ہوتے تھے تحفظ نہیں ہوتا تھا آج کل کی طرح اپنا حفاظت کا ذمہ اللہ کے سپرد اور خود کرنا پڑتا تھا، غریب لوگ ہوتے تھے اہل سنت جو بلاتے تھے اور کھانے کو نہیں دے سکتے تھے کرایہ نہیں دے سکتے تھے ان حالات میں بلکہ ایک دن ایک مناظرے میں حضرت اور میں صرف ہم دو بندے گئے

ان کے پاس دو مددوں کے لئے کھانا دینے کا انتظام نہیں تھا انہوں نے کہا حضرت آئے تو ہم انتظام کر لیں گے اور آپ کیلئے گاؤں سے مانگ لیں گے کوئی دال دے جائے گا تو ہو جائے گا گزارا اور نہ بستر تھا نہ چارپائی تھی کچے فرش پر میں نے رات گزاری اور حضرتؒ کو ایک چارپائی مہیا ہوئی صبح بہت بڑا معرکے کا جلسہ تھا وہ جلسہ کیا فارغ ہوئے جب باہر نکلے تو بس کے اڈے پر کرایہ کے لیے گاؤں کے لوگوں نے مل کر بیس روپے ہمیں دیئے حالانکہ وہاں آنے جانے کا کرایہ خرچہ اس سے زیادہ تھا انہوں نے پکڑائے میں نے لے تو لئے خاموشی سے لیکن مجھے پسند نہیں آئی بات کہ یار بھوکے بھی رہے سونے کو بھی جگہ نہیں ملی کرایہ بھی پلے سے دو کیسے گزارا ہوگا، تو جب بس چل پڑی اور وہ لوگ چلے گئے تو حضرتؒ نے مجھے فرمایا کہ تیرے چہرے سے ناگواری نظر آتی ہے لیکن ان کا احسان ہے کہ وہ بیس روپے دے گئے ہم نے ان کے باپ کا کام نہیں کیا یہ کام ہماری ذمہ داری ہے یہ ہمارے ذمہ لگا ہوا ہے یہ نبی کریمؐ کے حکم سے ہم کر رہے ہیں یہ کام ہمیں کرنا ہے اگر وہ بیس ہمیں نہ بھی دیتے تو بھی ہمیں کرنا تھا، تو بیوقوف ہے شکر کر بیس روپے تو دے دیئے کچھ تو کام ہو گیا کچھ تو مدد کر دی انہوں نے۔ ہمارا یہ طریق کار تھا، بارگاہ نبویؐ سے یہ سلسلہ چلنے کے بعد یہ ارشاد ہوا کہ لوگ اب باتوں سے تحریروں سے اور تقریروں سے گزر چکے ہیں اب اعلان کر دیجئے اور جو آئے اسے اللہ اللہ سکھایئے شاید یہ لوگوں کی اصلاح کا سبب بن جائے۔

لوگ اللہ اللہ کرتے تھے لیکن ان میں تبدیلی نہیں آئی، تب یہ اذن عام ہوا حضرت نے جلسوں میں اعلان فرمایا جماعت کی تشکیل ہوئی پھر سالانہ اجتماعات شروع ہوئے تب سے لیکر اب تک کے حالات ساتھیوں کے مشاہدے میں ہیں سب کے علم میں ہیں اور جتنے اہم فیصلے ہوئے مثلاً بیعت ظاہری نہیں ہوتی تھی 78

کے آخر میں یا 79' میں یہ بات پیش کی گئی کہ لوگ جاہلوں بدکاروں اور رواجی پیروں کی بیعت کر لیتے ہیں پھر اس میں پھنسے رہتے ہیں تو ظاہری بیعت بھی کرانی چاہیے خود ہم لوگ جو ۳۰' ۴۰ برس سے خدمت میں موجود تھے اس زمانے میں ظاہری بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو بیعت ہوئے۔

حضرت جب دنیا سے سفر آخرت کی تیاری فرما رہے تھے تو جو دوست موجود تھے لنگر مخدوم کے اجتماع میں انہیں یاد ہوگا حضرت نے بڑے واضح الفاظ میں فرمادیا تھا کہ میری اور آپ کی یہ آخری ملاقات ہے پھر ہم یہاں جمع نہیں ہوں گے اور میرے بعد جماعت کا نظام اور آپ نے فرمایا تھا کہ (تقریر کی کاپی موجود ہوگی) کہ مشائخ کے حکم کے مطابق جماعت کا نظام ایسے ایسے چلایا جائے گا، اس کے بعد حضرت کا وصال ایک بہت بڑا حادثہ تھا جماعت کے لئے اس تنظیم کے لئے اس سلسلے کے لئے اور آپ کے وصال کے بعد ہمیں بہت سے حادثات کا سامنا کرنا پڑا بہت سے نامساعد حالات میں سے گزرنا پڑا لیکن الحمد اللہ رب کریم کا احسان ہے اس نے توفیق بخشی اللہ نے ہمیں ہمت دی ہمارے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی مصیبتیں تکلیفیں اور حادثے ایک ایک کر کے نامراد موجوں کی طرح ہمارے قدموں سے ٹکرا کر واپس جاتے رہے اور الحمد اللہ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ روئے زمین پر ایک منظم سلسلہ ذکر موجود ہے دنیا کے ہر گوشے میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اللہ کا نام لے ہی رہا ہے ان سب واقعات میں ایک واقعہ میں خصوصاً عرض کرنا چاہوں گا مسجد نبوی کے مراقبے سے جب ہم فارغ ہوئے دعا ہوئی میں نے عرض کی حضرت مجھے آج جو کچھ مشاہدہ ہوا اسکی وضاحت سمجھ نہیں آئی۔ آپ نے پوچھا کیا نہیں سمجھ آیا آپ کو۔ میں نے کہا ایک جوان آدمی تھا بڑا خوبصورت اور بڑا قیمتی لباس تھا اس کا اور وہ بڑا شور کر رہا تھا اور اجازت لے رہا تھا کہ یا رسول اللہؐ میری بڑی توہین ہوگئی ہے اور

مجھے بدار سوا کیا جاتا ہے مجھے ذلیل کیا جاتا ہے میری مخالفت ہوتی ہے میری اہمیت نہیں رہی آپ مجھے اجازت دیں میں اس ملک سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ تو وہ کون تھا حضرت نے فرمایا کہ آپ کا مشاہدہ صحیح ہے۔ لیکن آپ کو سمجھ نہیں آئی وہ کوئی انسان نہیں تھا وہ اسلام تھا۔ وہ اللہ کا دین تھا جو اس سر زمین سے نکل جانا چاہتا ہے کہ جہاں ایک عام آدمی بھی میری تذلیل کرتا ہے میرے مخالف۔ مجھ پر پھبتیاں کستے ہیں تو میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ لیکن آپؒ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ تم انتظار کرو تمہیں یہیں رہنا ہوگا یہ وہ وقت تھا جب جماعت کی تشکیل کے لئے اور ہر آنے والے کو ذکر الٰہی سکھانے کے لئے حکم ہوا۔ کہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہو جائیں جن کے دل میں اس جانے والے کا واقعی احترام ہو اور اس کو یہاں رہنے کے لئے کچھ دل کچھ سینے کچھ افراد تو میسر آجائیں یہ تھی جماعت کی تشکیل کی بنیاد اور یہ بھی حضرتؒ کے اس مشاہدے پر مبنی تھی اسی سلسلے میں پھر بیعت ظاہری آئی اور اسکے بعد سارے حالات کے آپ بھی گواہ ہیں میرے ساتھ۔ اب جماعت کا جو دائرہ کار ہے وہ اس سے وسیع ہو گیا ہے اور جماعت محض مراقبات اور ذکر اذکار سے نکل کر میدان عمل کی طرف چل پڑی ہے۔ آخر کیوں؟ کیا کسی کے دل میں یہ خیال آ گیا کہ وہ اس سے سیاسی فائدہ اٹھائے یا کسی کے دل میں یہ خیال آ گیا کہ اس طرح حکومت سے کوئی چندہ یا پیسے وصول کئے جائیں یا اقتدار میں شراکت کی جائے کیا بات ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ اللہ کے رسولؐ نے یہ پسند فرمایا کہ تم لوگ اب اپنی ابتدائی تربیت سے نکل کر میدان عمل میں حصہ لو اور اس مسافر کو جسے یہاں قیام کی اجازت دی گئی اسے اس ملک کا سلطان بناؤ اس کا حق ہے اسے یہ زیب دیتا ہے وہ حاکم بن کر رہتا ہے محکوم بن کر نہیں رہتا۔ نہ رہ سکتا ہے۔ دین اللہ کے ارشادات کا نام ہے اور ارشادات الٰہیہ کا کام حکومت کرنا ہے اپنے آپ کو منوانا ہے کسی کے ساتھ سمجھوتا کر کے رہنا نہیں ہے۔ یہ وہ موڑ تھا

جب جماعت کو الاخوان کے سانچے میں ڈھالا گیا میں حرم بیت اللہ شریف میں حاضر تھا ہم طواف کے بعد سعی کر رہے تھے۔ صفا پر کھڑے ہو کر بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے دعا کی جاتی ہے جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میں نے دیکھا حالانکہ آگے برآمدوں کی ڈاٹیں ہیں ستونوں کے درمیان سے کوئی جھلک نظر آجاتی ہے بیت اللہ شریف کی۔ لیکن مشاہدات میں مادی چیزیں درمیان سے ہٹ جاتی ہیں۔ ایک نور کی تجلی جو بیت اللہ سے اٹھی ایک شعلہ لپکا جس نے باب فتح پر۔ باب فتح وہ دروازہ ہے کہ جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا تھا تو جس دروازے سے نبیؐ حرم میں داخل ہوئے تھے اس کا نام آج بھی باب الفتح ہے۔ باب الفتح کے اوپر جا کر وہ شعلہ جو چھوٹا سا لپکا تھا ایسے پھیلتا گیا ایسے پھیلتا گیا۔ کہ اسکے اوپر جا کر پورا گلوب بن گیا۔ روئے زمین کا پورا نقشہ بن گیا اس پر۔ اور کسی پُر نور ہاتھ نے سبز جھنڈا لے کر اسکے اوپر گاڑ دیا۔ جس کے اوپر مہر نبوت تھی جھنڈے کے درمیان میں مہر تھی جس پر لکھا ہوا تھا محمد الرسول اللہ میں نے اس سے یہ اخذ کیا۔ یہ جھنڈا ہرا جھنڈا اور اس میں مہر نبوت اس جھنڈے کو اٹھا کر روئے زمین پر اسلام کی عظمت کو منوانے کا حکم دیا جا رہا ہے یہ میری سمجھ تھی اسکا شعور رب کریم نے مجھے دیا اور میں نے یہ سمجھا میرا چونکہ یہ مشاہدہ ذاتی تھا اور صاحب کشف اپنے کشف کے ماننے کا مکلّف ہوتا ہے جب کہ وہ حدود شریعہ کے اندر ہو اگر حدود شریعہ سے متصادم ہو تو اتباع شریعت کا کیا جائے گا اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسے مشاہدے میں غلطی لگی لیکن حدود شریعہ کے اندر ہی نہیں یہ زمانے کی ضرورت کے بھی مطابق تھا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دور میں ایسے لوگ جنہیں براہ راست کوئی حکم دینا محمد الرسول اللہ پسند فرمالیں تاریخ ساز لوگ ہیں۔ وہ ایسے افراد ہوں گے کہ جنہیں بعد میں آنے والوں کی آنکھیں ترسا کریں گی کہ کاش اس بندے سے ملاقات ممکن ہوتی کاش یہ زمانہ ہم نے دیکھا ہوتا یہ معمولی

بات نہیں ہے کہ اس دور کے کسی بندے کسی فرد کو محمد الرسول اللہ اتنا شرف بخشیں کہ انقلاب زمانہ پر اس سے بات کرنا پسند فرمائیں وہ شخص کیا سمجھتا ہے۔ زمانے کے سلاطین کو، امراء کو، حکومتوں، نظاموں کو، اس کے لئے کیا ہے سپر پاور کون امریکہ ہے' یار شیاہے دنیا کی کوئی طاغوتی طاقت اسکے قدموں کی دھول کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی اور نہ ایسا شخص کسی کو پرکاہ کی حیثیت دینے کے لئے تیار ہوتا ہے آپ روئے زمین کی سلطنت ایسے شخص کے قدموں میں ڈھیر کر دیں اسے وہ خاک عزیز ہوتی ہے جو محمد الرسول اللہ کے جوتے کے تلوؤں کے ساتھ ہوتی ہے اس کے مقابلے میں اسے دنیا کی سلطنت کی ضرورت نہیں ہوتی اور جن ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے فنافی الرسول کے مراقبات سے نوازا ہے ان کے دل سے پوچھئے کہ بارگاہ نبویؐ کی ایک لمحے کی حاضری سارے جہاں کی نعمتوں پر کتنی بھاری اور کتنی قیمتی ہے میرا اپنا ایمان ہے یہ کہ یہ مہر نبوت والا سبز جھنڈا انشاء اللہ اس ملک پر اس ملک سے باہر عالم اسلام پر اور عالم اسلام سے ہوتا ہوا پوری دنیا پر شان و شوکت سے لہرائے گا اسے کوئی نہیں روک سکتا یہ کسی فرد کی حکومت کے لئے نہیں ہے کسی شخص کے اقتدار کے لئے نہیں ہے کسی ایک جماعت کو چندہ دینے کے لئے نہیں ہے یہ اللہ کی عظمت کے لئے ہے یہ رسول اللہ کے لائے ہوئے ضابطہ حیات کے لئے ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ بڑے صاحب قسمت ہیں وہ لوگ، جو اسکی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے یہ ان کی سعادت ہے اور یہ یاد رکھیئے جب کسی کام کو کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے......... جب طے ہو جاتا ہے بارگاہ باری میں کہ یہ کام ہو گا تو پھر صرف اللہ حکم دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے یہ اس کا احسان ہے کہ اپنے کسی بندے کو موقع بخشے اور اسے یہ موقع بخشے کہ وہ زندگی کے گناہوں کی تلافی کرنا چاہے تو وہاں اپنی زندگی کو اپنے وسائل کو، اپنی ذات کو، اپنے علوم اور اپنی کوششوں کو قربان کرے

ورنہ وہ قادر ہے۔ یہ کام انشاء اللہ ہوگا خدانخواستہ ہم نہیں کریں گے تو کسی اور کو توفیق دے دے گا۔ وہ قادر ہے وہ چاہے تو کسی اور قوم کو توفیق دے دے گا اور وہ دیوانہ ہو جائے گی اللہ کی محبت میں.......... کسی طعنے دینے والوں کے طعنوں کی پرواہ نہیں کرے گی بلکہ دیوانوں کی طرح نفاذ اسلام کا کام کر گزرے گی۔ موقع ہے مت جانے دو۔ خوش نصیب ہیں آپ لوگ کہ اس زمانے میں منشاء نبویؐ آپ تک پہنچانے کے وسائل آپ کو اللہ نے میسر فرما دیئے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اللہ کا کوئی مدہ اللہ کے رسولؐ پر جھوٹ بول سکتا ہے جو کچھ میں نے کہا ہے پوری ذمہ داری سے کہا ہے کسی کو سمجھ آئے یا نہ آئے کسی کا کوئی علمی اعتراض اس پر وارد ہوتا ہو تو اسے اجازت ہے اس کی اپنی پسند ہے۔ اس تاریخی حقیقت پر میں جب خود بھی سوچتا ہوں کہ وصال نبویؐ کے بعد ۱۴۰۰ سال بعد یہ خوش نصیب جماعت ہے جسے دربار نبویؐ سے مہر نبوت کا پرچم عطا ہوا ہے بڑے بڑے نیک بڑے بڑے بہادر بڑے بڑے جرنیل بڑے بڑے سلطان گزر گئے لیکن مہر نبوت کا پرچم صرف ہمارے حصے میں آیا۔ وصال نبویؐ کے بعد آج تک کسی کو خیال بھی نہیں گزرا کسی کے ذہن میں بھی بات نہیں آئی کیا یہ ایک منفرد حقیقت نہیں ہے کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ قافلہ کوئی نرالا قافلہ ہے یہ کوئی انوکھی بات ہے یہ کوئی بالکل الگ سی داستان ہے یہ کوئی عام تحریک نہیں ہے عام موومنٹ نہیں ہے کسی بندے کے خلاف کسی حکومت کے خلاف کسی ادارے کے خلاف کسی مولوی کسی عالم کسی پیر کسی رئیس کے خلاف نہیں۔ یہ غیر اسلامی تہذیب کے خلاف اسلام کے جانثاروں کا قافلہ ہے اگر غیر مسلم کو اپنی تہذیب رکھنے کا حق حاصل ہے تو مومن کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ تہذیب کو اپنا کر اس کے دائرہ کار کے اندر زندہ رہے یہ ہمارا حق ہے یہ کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں ہے کسی سے کچھ چھیننا نہیں

ہے۔ بلکہ یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اس طرح سے جیئیں جس طرح حضورؐ نے سکھایا وہ سیاسی عمل اپنائیں جو خلفائے راشدین نے دیا۔ حضورؐ سے حاصل کر کے ہم وہ طریق معیشت اپنائیں جو محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کو دیا تھا ہماری فوج ہماری عدلیہ ہماری پولیس کا کردار وہ ہو جو خلافت راشدہ میں پولیس کا فوج کا عدالت کا کردار تھا جو اللہ کے رسول نے تعلیم فرمایا جو اللہ کی کتاب میں موجود ہے۔ کیوں نہ ہو کیا دلیل ہے اس کی کہ ہمیں اس سے محروم رکھا جائے کیوں اسکا مطالبہ ہم نہ کریں اگر یہ نہیں ہوگا تو پھر ہمارے ہونے کا مقصد کیا ہے اگر نہیں ہوتا تو پھر ہم نہیں ہوں گے۔ یہ ضرور ہوگا انشاء اللہ۔ یہ تھا وہ تعارف جو بعض سنجیدہ ذہنوں میں اور بعض مخلص ساتھیوں کے ذہنوں میں ایک مخمصہ سا ہے کہ شاید ایک تصوف کی جماعت کو ہم نے سیاست کی راہ پر ڈال دیا ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ جماعت ہماری جاگیر نہیں ہے ہم جماعت کے مالک نہیں ہیں جماعت انہیں کی ہے جنہوں نے یہ ہوائی ہے جنہوں نے اسے ترتیب دیا اور جو آج تک اس کے امور کی نگہداشت فرما رہے ہیں انہی نے اس کو الاخوان میں ڈھالا ہے میں نے نہیں۔

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں
زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں
چراغ میرا ہے رات ان کی
انہی کا مطلب نکل رہا ہے
انہی کا مضمون انہی کا کاغذ
قلم انہی کا دوات ان کی

ہم تو محض ایک نمونہ ہیں آپ کے سامنے ایک چپڑاسی ایک چوکیدار ایک

ہرکارہ جوایک بارگاہ سے چٹھی یا حکم لے کر اس کے متعلقین تک پہنچادیتا ہے اور بات ختم۔ کسی کو مراقبات نصیب ہوتے ہیں کسی کو فنائی الرسول نصیب ہوتا ہے کسی کو فنا بقا نصیب ہوتا ہے کسی کو بیعت نبویؐ روحانی نصیب ہوتی ہے تو اس میں میرا کوئی احسان نہیں میں اپنے پلے سے کسی کو کچھ نہیں دیتا اور نہ میرے پاس دینے کو کچھ ہے دینے والا اللہ اور اللہ کا رسولؐ خود ہیں، لینے والے اللہ کے بندے اور رسولؐ کے امتی ہیں۔ ہم تو ایک ڈاک گھر ہیں درمیان میں، ہم تو ایک چوکیدار یا چپڑاسی یا ایک میسنجر ہیں اور جو وہاں سے آتا ہے وہ آپ کو پہنچادیا جاتا ہے۔ آپؐ کی طرف سے آتا ہے وہ اللہ وہاں پہنچاتا رہتا ہوگا ہم نے کبھی کسی کی بات نہیں کی کوئی ناخوش گوار بات آئے یا خوش گوار۔

ہمیں یہ خبر ہے کہ سرکاری ہرکاروں کو سارے لوگ اچھا بھی نہیں کہتے اور سارے لوگ برا بھی نہیں کہتے۔ جس کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے وہ دعائیں دیتا ہے جس کے خلاف ہو جاتا ہے وہ ناراض ہوتا رہتا ہے لیکن ہرکارہ اس کی ناراضگی میں ناراض نہیں ہوتا ہے اسے اپنی نوکری سے کام ہوتا ہے وہ اپنی ملازمت کا بندھا ہوا ہوتا ہے وہ اپنے مالکوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے کہ وہاں خیریت رہے باقی سب خیریت ہے۔ سو اپنا اپنا کام ہے سب اپنی ذات کے مکلّف ہیں آپ اپنے کام کے مکلّف ہیں آپ نے بھی جانا ہے وہیں ہم بھی ہوں گے ہر ایک نے اپنا اپنا پیش کرنا ہے کہ اے اللہ کے نبیؐ میں نے کیا سمجھا کیا سوچا اور کیا کیا۔ میرے پاس یہ آپ سب کی امانت تھی میں نے آپ کو پہنچادی۔

الاخوان

الاخوان سلسلہ عالیہ ہے جو کہ بنیادی سلسلہ ہے باقی سب سلسلے اسی سلسلے سے بنے ہیں اور تنظیم الاخوان کا بنیادی مقصد نفاذ اسلام ہے جس کی اپنی شوریٰ ہے حضرت صاحب نے الاخوان کو Establish کیا کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا۔ نصف صدی ہونے کو ہے (اب تک یہاں اسلام کا نفاذ نہ ہوا) ملک میں اسلام کا نفاذ کیسے ہو یہ اس کا بنیادی مقصد ہے۔

پہلے گھر پھر شہر اور ملک میں اسلامی نظام کے بعد پوری دنیا میں نفاذ اسلام 26 اگست 1993ء کو حضرت صاحب نے عمرے سے واپسی پر لاہور میں اس کی بنیاد رکھی، حضرت عمرے پر گئے اور انہوں نے مہر نبوت کو دنیا کے نقشے پر دیکھا اور انہوں نے واپسی پر الاخوان کی بنیاد رکھی پہلے اجلاس میں تنظیم کا جھنڈا فائنل ہوا اور حضرت کو تنظیم کا امیر مقرر کیا گیا۔ اب پوری دنیا میں اس کی شاخیں ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ الاخوان میں شمولیت کے لئے بیعت ہونا ضروری ہے مگر ایسا نہیں ہے الاخوان کا ممبر ہونے کے لئے حضرت کا بیعت ہونا

ضروری نہیں ہے۔باقی دنیا میں جہاں جہاں اللہ اللہ کرنے والے ہیں وہاں وہاں الاخوان کی شاخیں ہیں پاکستان میں اس کا صدر مقام ہے اس طرح صوبائی سطح پر بھی حضرت صاحب کی اپنی ایک شوریٰ ہے جس میں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مثلاً Economist ہیں Politician ہیں پاکستان کے تین Zone ہیں۔

i- Zone سرحد جس میں شمالی علاقہ جات اور جہلم کا علاقہ۔

ii- Zone پنجاب اور کشمیر۔

iii- Zone سندھ میں اور بلوچستان میں۔

الاخوان نے بہت محنت کی ہے جگہ جگہ جلسے کئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اسے پاکستان میں نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے ہم حکومت نہیں چاہتے یہ الاخوان کا دعویٰ ہے۔

حضرت صاحب نے مختلف اوقات میں نواز شریف شہباز شریف لغاری بے نظیر گورنرز وغیرہ سے ملاقاتیں کی ہیں تاکہ اپنا پیغام انہیں پہنچادیں۔

بلکہ یہاں تک کہ راجہ ظفر الحق سود کے بارے میں نظام بنانا چاہتے تھے تو الاخوان نے انہیں اسلامی معیشت کا ماڈل بھی بھیجا تھا لیکن ابھی تک نتائج نہیں آئے لیکن الحمد اللہ اتنے مختصر عرصہ میں الاخوان کو پورے پاکستان میں پہچانا جاتا ہے۔ حضرت کی ذات اور الاخوان ایک ہی بات ہے۔اس کا تعلق سلسلہ عالیہ سے ہے اور اس سلسلے کے لوگ تمام پاکستان میں موجود ہیں اس لئے وہ الاخوان کے پلیٹ فارم سے جوبات بھی کرتے ہیں وہ پورے ملک میں پہنچ جاتی ہے۔

پیغام تو لوگوں تک پہنچ چکا ہے اب صرف اسے...... موبالائیز کرنے کی ضرورت ہے لوگوں کا ردعمل مثبت ہے پیغام عوام کو سمجھ آچکا ہے اور وہ اسے تسلیم کرتے ہیں۔

الاخوان

سیاسی مقاصد

امیر محمد اکرم اعوان نے 93ء میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ان کا سیاسی نظریہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کو اپنی ذات پر نافذ کیا جائے اور پھر اس کو سب نظاموں پر حکمران بنادیا جائے۔ چونکہ بطور مسلمان ہم مکمل اسلام کو اپنانے کے مکلف ہیں، تو پھر اس بات کے بھی مکلف ہیں کہ اسلام کو تمام نظاموں پر حاکم بنادیا جائے۔

اسی ایک مقصد کے تحت انہوں نے الاخوان کے نام سے سیاسی تحریک کی بنیاد رکھی، جس نے بہت تھوڑے عرصہ میں واضع طور پر لوگوں میں اس بات کا شعور پیدا کر دیا ہے کہ صرف عبادات کے سر انجام دینے سے نجات نہیں ہو گی بلکہ اصل نجات تب ہو گی جب تمام نظاموں پر اسلام کو حکمران بنایا جائے گا۔ اب لوگوں میں بہت حد تک اس بات کا شعور پیدا ہو چکا ہے کہ صرف کوڑے کھانا اسلام نہیں ہے

صرف عبادات کا نام اسلام نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں رائج کرنا اصل اسلام ہے۔

کیونکہ دین اسلام اپنے اندر ایک واضح افادی پہلو رکھتا ہے' اور اسلام کا افادی پہلو کائنات پر موجود ہر انسان کی بنیادی ضرورت بن چکا ہے۔ اسی لئے الاخوان کی تحریک کو بین الاقوامی تحریک کے طور پر مانا جارہا ہے۔ یہود و ہنود اسکی صرف اس وجہ سے مخالفت کرتے ہیں کہ ان ممالک کے عوام اسلام کے اس افادی پہلو سے متاثر ہو کر کہیں جمہوریت کے ذریعے ان ممالک میں اسلام نافذ نہ کر دیں۔ چونکہ الاخوان کا مقصد ہی نفاذ اسلام ہے' تو اسی کے حصول کے لئے اسلامی پارٹیوں سے الاخوان اتحاد کی مقتضی ہے اور صرف اسلام کے نفاذ کے نکتہ پر تمام جماعتوں سے اتحاد کے لئے کوشاں ہے کیونکہ الاخوان کسی حاکم سے دوستی یا دشمنی کی قائل نہیں بلکہ الاخوان ہر اس شخص کو امداد دینے کے لئے تیار ہے جو نفاذ اسلام میں دلچسپی رکھتا ہے۔

.... مولانا محمد اکرام اعوان فرماتے ہیں!!

تحریک تبدیلی نظام کا مقصد صرف یہ ہے کہ وطن عزیز پر نظام اسلام نافذ کیا جائے اور فرسودہ اور ظالمانہ نظام سے اس ملک کی جان چھڑائی جائے۔ تحریک تبدیلی نظام صرف یہ چاہتی ہے کہ اس ملک کو فرعونی طرز حکومت سے نجات دلائی جائے۔ جب ہمارا پیدا ہونے سے مرنے تک سارا نظام اسلامی ہے تو جو نظام سلطنت ہم پر مسلط ہے وہ کیوں نہ اسلامی ہو۔ ہم دنیا بھر کے نظام آزما چکے ہیں۔ ہم نے سوشلزم اپنا کے دیکھ لیا۔ ہم نے جمہوریت کے مختلف روپ اپنائے تو کیا اب ہمارے حکمرانوں کو تجربے کے طور پر اسلامی نظام نہیں اپنانا چاہئے۔ کیا ان کی نظر میں اسلام اس قابل بھی نہیں کہ ایک مسلمان ریاست کے کروڑوں مسلمانوں پر اس کا تجربہ ہی

کرلیں۔ ہم نے حکمرانوں کو بارہا بتایا ہے کہ تحریک تبدیلی نظام وہ پرانا نظام لانا چاہتی ہے جو آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ نے دیا۔

عدالتی نظام معاشرتی نظام تعلیمی نظام اور معاشی نظام!!!

الاخوان کا منشور!!

تنظیم الاخوان پاکستان نے خالق اور مخلوق کی طرف اپنی ذمہ داریوں اور قومی یک جہتی کے مکمل احساس کے ساتھ عصر حاضر کے چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے یہ عزم کیا ہے کہ تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے موجودہ سیاسی' معاشی' عدالتی' تعلیمی معاشرتی' زرعی' صنعتی' دفاعی' انتظامی' اور خارجی نظام ہا کی اصلاح کی جائے اور اس نو آبادیاتی نظام یا اس کی باقیات کو اپنی قومی زندگی کے رگ و ریشہ سے اکھاڑ پھینکا جائے!

یوں تو منشور میں بہت سے نکات پر وضاحت سے بات کی گئی ہے جو اپنے اپنے موضوعات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ طوالت کے ڈر سے انہیں مختصراً پیش کر رہی ہوں۔

سیاسی نظام!

اسلام کو دیگر تمام نظاموں کے مقابلے میں جو انسانوں نے اب تک وضع کیئے ہیں'ایک اعلیٰ ترین اور جامع طور پر ایک آفاقی نظام کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔اس مقصد کے لئے اطلاعات ونشریات اور اشاعت کا ایک وسیع اور جامع پروگرام تشکیل دیا جائے۔ جو ایک طرف انسان اور خالق اور دوسری طرف انسانوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں لوگوں کی تعلیم وتربیت کرے'ملک اور بیرون ملک ایسی تمام تنظیموں کے ساتھ روابط کرے جو ان مقاصد کے حصول کے لئے کام کر رہی ہیں۔

معاشی نظام!!

غیر ملکی قرضوں سے جلد از جلد نجات حاصل کرنے'بالخصوص غیر مسلم ممالک کے قرضوں کی ادائیگی کے لئے' قومی فنڈ برائے ادائیگی قرضہ جات کا قیام عمل میں لایا جائے۔ قومی معیشت کی بہتری کے لئے اشیائے صرف کی درآمد کو کم از کم سطح پر لانے'غیر ترقیاتی اخراجات کو محدود کرنے'اوپر سے نیچے تک ہر سطح پر سادگی کو رواج دینے' ٹیکس چوری کو روکنے اور اسکا سراغ لگانے' پبلک سیکٹر میں بھاری انتظامی معارف وتشہیر پر پابندیاں لگانے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

عدالتی نظام!

ایک مکمل آزاد'منصف اور مستعد عدلیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔جو صرف قرآن وسنت کے تابع ہو۔ قاضی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جامعۃ الفقۃ الاسلامیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔جو روزمرہ قوانین کی تشکیل میں حکومت کی مدد کرنے کے علاوہ قرآن وسنت کی ترویج کے کام میں معاونت کر سکے۔ علاوہ ازیں

ایسے افراد کی تربیت کرے جو قضا کے معاملات میں عدالتوں کی رہنمائی کر سکیں۔ نیز یہ ادارہ عدالتوں کے لئے تربیت یافتہ افراد مہیا کر سکے!!

قرآن وسنت کی روشنی میں عصری مسائل کے حل کی طرف رہنمائی کے لئے ایک دارالاجتہاد کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مقدمات کے پیچیدہ اور طویل طریق کار کو آسان تر بنانے اور عدالتوں کو فوری سماعت کے ذریعے عدل فراہم کرنے کے اختیارات دیئے جائیں!!!

تعلیمی نظام!

قومی سطح پر تعلیمی نصاب کی تیاری کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے جو ایک سال کے اندر نظریہ پاکستان کے مطابق تعلیمی نصاب مرتب کرے اور جو پورے ملک میں بلا تخصیص نافذ العمل ہو۔ مساجد سکول کو جدید خطوط پر استوار کر کے اور دوسرے ممکنہ ذرائع استعمال کر کے سو فیصد خواندگی کا معیار حاصل کیا جائے۔ اساتذہ کو معاشرے میں اعلیٰ مقام دیا جائے اور ان کے حالات کار کو بہتر بنایا جائے۔ موجودہ نظام امتحانات کی جائے ایسا نظام وضع کیا جائے جس میں طلبہ کی استعداد کو صحیح طور پر جانچا جا سکے اور جس میں کسی قسم کی بدعنوانیوں کی گنجائش نہ ہو۔

امیر تنظیم الاخوان حضرت محمد اکرام اعوان کے مختلف خطابات سے مختصر اقتباسات!!

الاخوان! منزل کی طرف

ہم سب کی بنیادی اور آخری محنت صرف اسلام کے لئے ہے۔اس سے کسی فرد یا جماعت کی مخالفت مقصود ہے نہ کسی فرد یا جماعت سے تعاون مقصود ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں، کسی پارٹی کی حکومت جائے، کسی پارٹی کی حکومت آئے۔ ہماری ساری محنت اس لئے ہے کہ یہ ملک اللہ کے دین کے نام پر حاصل کیا گیا اور اس پر دین کے مطابق سلوک کیا جانا چاہئے، خواہ وہ کسی کو سزائے موت ہی دے لیکن شریعت اسلامیہ کے مطابق دے۔ کسی کو اقتدار دے، اختیار دے، ظالم کا ہاتھ روکے، مظلوم کی دلجوئی، شریعت اسلامیہ کے مطابق ہو اور یہ بات کرنے میں ہمیں کسی سے کوئی ڈر نہیں، یہ بات کوئی زیر زمین نہیں ہے، کسی کے خلاف کوئی سازش نہیں ہے اور اگر کسی کو یہ بات ناپسند ہے، تو ہوا کرے، اس لئے کہ یہ بات کسی ذاتی منافع کے لئے نہیں ہے، دنیاوی اقتدار کی نہیں ہے۔ یہ اللہ اور اللہ کے حبیبؐ

نے تعلق کی بات ہے۔ ایمان کی' عقیدے کی' آخرت کی اور قبر کی بات ہے۔ جس نے لاالہ اللہ محمد رسول اللہ کہا' اس نے یہ عہد کر لیا کہ اب یہ جسم کٹ تو سکتا ہے آقا کے پیغام سے ہٹ نہیں سکتا۔

غزوۃ الہند!

لوگو! سن لو' الصدق الصاد قین آنخضرتؐ کا ارشاد پاک ہے' میری امت کے آخری زمانے میں دو جماعتیں ایسی ہوں گی جو بلا حساب جنت میں جائیں گی۔ ایک وہ جو غزوۃ الہند میں حصہ لے گی' آپؐ نے یہاں "الہند" فرمایا ہے۔ الہند کابل سے لیکر برما تک اور ہمالہ سے لیکر دکن تک برصغیر کا نام ہے' جس کا مطلب ہے جہاد ہو گا اور نہ صرف پاکستان میں اسلام نافذ ہو گا بلکہ اسکی سرحدیں وسیع ہوں گی اور پورا برصغیر پاکستان ہو گا' اس پر اسلام کی حکومت ہو گی اور پھر پوری دنیا پر اسلام نافذ ہو گا۔ دوسری وہ جماعت' فرمایا عیسیٰ کا ساتھ دے گی اور جہاد کرے گی۔

اگر ہم ثواب کی حقیقت سمجھیں!

اسلام ثواب کے حصول کا مذہب نہیں ہے' ہمیں ثواب نہیں چاہئے' ہمیں اللہ کی رضا مندی چاہئے اور اللہ کی رضا مندی عمل میں ہے' اس عمل میں جو اللہ کی حاکیت قائم کرنے کے لئے کیا جائے' یہ نماز' یہ روزہ' یہ ذکر اذکار' یہ تبلیغ یہ تلاوت' یہ معنی' یہ تفسیر' یہ حدیث۔ یہ سب بندے کو اس کام کے لئے تیار کرنے کی محنت ہے کہ وہ زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرے۔ اور اگر ہم ثواب کی حقیقت کو سمجھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بدر میں شریک تھے

ان پر جنت واجب ہو گئی۔ شارحین حدیث اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ بدر میں شرکت کا انہیں جو ثواب ملا وہ یہ تھا کہ آئندہ وہ وہی کریں گے جو اللہ کو پسند ہو گا۔ یہ ثواب ہے 'یعنی مزاج بدل گیا' عملی زندگی تبدیل ہو گئی' توفیق عمل نصیب ہو گئی۔

یار ایک کام کرو!

یار ایک کام کرو! اللہ کو اللہ تو آپ مانتے ہو' الحمد للہ۔ آپ نبی کو تو مانتے ہو' الحمد للہ۔ دین کو دین تو مانتے ہو۔ اللہ قائم رکھے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑی سی یاری بنالو' اس کے بغیر بات نہیں بنے گی۔ میں نے بدمعاشوں کو' چوروں کو دیکھا ہے یاری پر جان دیتے ہوئے۔

اسلام پر ایمان ہے' عقیدہ ہے' اعتبار ہے' یاری نہیں ہے۔ جب تک وہ یاری نہ لگے گی کہ...... حضورؐ فرماتے ہیں مجھے مکے کے وہ پتھر یاد ہیں کہ کفار انکار کرتے تھے تو وہ پتھر مجھ پر سلام پڑھتے تھے' مجھے وہ درخت یاد ہیں جنہوں نے میری رسالت کا اقرار کیا' ابو جہل نے کہا بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے تو پتھروں نے کہا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ' یہ کیوں بتائیں مٹھی میں کیا ہے' ہم بتاتے ہیں ہم کون ہیں۔ یار! اس پتھر جتنا درد بھی کسی مسلمان میں نہیں رہا جو یہ کہہ دے کہ میں نافذ کروں گا اللہ کا دین' اللہ کے حبیبؐ کا دین۔ تھک گئے ہیں ان دانشمندوں سے' دیکھ لیا عقلمندوں کو'۔ ۵۰ برس ہو گئے پڑھے لکھوں کے پیچھے گھومتے ہوئے یار! خدا کے لیے اب پاگلوں اور بیوقوفوں کی باری ہے' جسے کفر پاگل کہے گا اللہ کا حبیبؐ اسے اپنا خادم قبول کرے گا جسے عقل والے نادان کہیں گے۔

قیمت پڑے گی اسلام کی، اور اس کے لئے تیار ہو جاؤ!

اب انشاء اللہ باری ہے دین کی، اسلام کی، لیکن یاد رکھو کہ یہ لقمۂ تر کی طرح نہیں ملے گا، یہ اللہ کا قانون نہیں ہے۔ اسلام تب ہی نافذ ہو گا جب ہم اپنی جانیں بھی پیش کر دیں۔ آج پوری دنیا کو دیکھ لیں روئے زمین پر ہمیں دو ہی طبقے نظر آتے ہیں۔ ایک ظالم، دوسرا مظلوم، جب کوئی قوم، کوئی طبقہ، کوئی ملک دو حصوں میں مٹ جاتا ہے، درمیان میں کوئی نہیں بچتا، جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت رکھتا ہو۔ تو پھر قدرت کا نظام حرکت میں آتا ہے اور اس کے اپنے طریقے، اپنے قاعدے ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔ میں کوئی پیش گوئی نہیں کر رہا ہوں، یہ سائنٹیفک بات ہے اور مغرب کا کافر اس پر یقین رکھتا ہے اور اسے سمجھ چکا ہے، جس طرح دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر میں اقوام عالم کی تاریخ ہے، زمانے کے نشیب و فراز ہیں اور جن لوگوں کو تجزیہ کرنے کی اللہ نے استعداد دی ہے وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اب معاملہ کہاں پہنچ گیا ہے۔۔

امیر تنظیم الاخوان

جناب ملک محمد اکرم اعوان سے ایک ایسا انٹرویو' جو ان کے
سیاسی' قومی اور مذہبی افکار پر روشنی ڈالتا ہے!!

س :۔ حضرت 'گزارش یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ تصوف کے کئی سلسلے بھی اپنا کردار ادا کرنے کے دعویدار ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں آپ کو ایک نئی تنظیم بنانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی' آپ اسے دوسری جماعتوں سے مختلف کس طرح قرار دیتے ہیں؟

ج :۔ آپ کا سوال بڑا اہم ہے' لیکن جو شخص ہمارے کام سے واقف ہے' اور ہمارے انداز و طریق کار پر نظر رکھتا ہے اس کے سامنے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم نے "تنظیم الاخوان" کیوں قائم کی۔ اس وقت جو دینی گروہ یا جماعتیں کام میں مصروف ہیں' ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو موجودہ سیاسی نظام کا حصہ ہیں اور اپنے مذہبی تشخص اور نام پر اصرار کرتے ہوئے ایک خالص سیاسی جماعت کا کردار ادا کر



صفارہ اکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر صدر جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ



سنو لیپرڈ کا شکار چین کے بارڈر کے ساتھ

رہی ہیں۔ انتخابات میں حصہ لیتی ہیں' اسمبلیوں میں بھی ان کا کوئی نہ کوئی امیدوار جا پہنچتا ہے اور وہ کسی نہ کسی رنگ میں اس نظام سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔ دوسری طرف وہ دینی مدارس جماعتیں یا سلاسل تصوف ہیں جو انتخابی سیاست سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ موجودہ نظام سے الگ تھلگ' اسے چھوڑ چھاڑ کر انفرادی زندگیوں کی تطہیر اور تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے نزدیک انفرادی تزکیہ بھی ضروری ہے اور اجتماعی زندگی کو بھی درست بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ فرد کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے نہ نظام کو۔ فروعی اصلاح کے لئے ہمارا پروگرام وہی ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے ہمارا بنیادی طور پر تصوف کا سلسلہ ہے اویسیہ نقشبندیہ' ہم ذکر اور تعلیم و تربیت کے ذریعے بندے کا تعلق اپنے رب سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے سلسلے کے مرشد اول حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں' اس لئے ہم کسی نئی بات کے موجد اور کسی نئے دعوے کے علمبردار نہیں ہیں۔

حضرت مولانا اللہ یار خاں ہمارے سلسلے کے شیخ تھے' انہوں نے برسوں لوگوں کے احوال باطن کی اصلاح کے لئے صرف کئے وہ ایک عالم باعمل تھے۔ ایک دیہاتی۔ قصباتی' لیکن علم کا بحر بیکراں' ان کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اس سلسلے کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ ہم موجودہ نظام کو تسلیم نہیں کرتے! موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد کرنے کی غرض سے اس کا حصہ نہیں بنتے' ہم معروف معنوں میں کوئی انتخاب لڑنے والی جماعت نہیں ہیں۔ ہمارا موقف اصلی ہے' اور ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

اس وقت جو سیاسی' سماجی اور معاشی ڈھانچہ ہماری مملکت کا ہے یہ وہ نہیں جس کے لئے لاکھوں جانوں کی قربانیاں دی گئی تھیں۔ جس کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا

تھا۔اس طرح کے سیکرٹریٹ' اس طرح کے دفاتر بھارت میں بھی موجود ہیں' پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے پاکستان کو کیوں بنایا تھا؟ کیا محض اس لئے کہ وہاں جو کچھ غیر مسلموں کے ہاتھوں ہوتا ہے' یہاں مسلمانوں کے ہاتھوں ہوتا رہے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی ہے' اور یہی سوال ہم اٹھا رہے ہیں اور اسکا جواب اپنے عمل سے دینے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔

س :- آپ کی تنظیم میں کیا آپ کے سلسلہ اویسیہ نقشبندیہ کے لوگ ہی شامل ہو سکتے ہیں؟

ج :- اس وقت تو تنظیم کے افراد کی بڑی تعداد اس سلسلے ہی سے تعلق رکھتی ہے' لیکن اس میں شامل ہونے کے لئے کسی فرقے' رنگ' نسل یا جماعت کی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر وہ مسلمان جو ہمارے منشور سے متفق ہے' ہمارا رکن بن سکتا ہے۔ ہمارا تعلق کسی فرد یا کسی گروہ سے نہیں۔ ہم معاشرے کو متحد اور منظم کرنا چاہتے ہیں غلط تقسیم کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمارے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں۔ اس حوالے سے بھی آپ دیکھیں تو دوسروں کے اور ہمارے درمیان ایک بنیادی فرق ہے ہماری دعوت کسی شخصیت سے کسی فرقے کی طرف سے نہیں۔ ہم نہ کوئی بت بناتے ہیں' نہ کسی دوسرے کے بنائے بت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہماری کوشش اور کاوش یہ ہے کہ بتوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جاؤ۔ ہم کسی سے نہیں کہتے کہ تم درود شریف آہستہ پڑھو یا بلند آواز سے۔ رفع یدین کرو یا نہ کرو۔ آمین بالجہر کہو یا نہ کہو۔ ہم ان تمام فروعی اختلافات سے اوپر اٹھنے کی بات کرتے ہیں۔ ہوس اقتدار کو بھی پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہیں۔ ہمارا پیغام یہی ہے کہ شمع رسالتؐ کے پروانوں' شمع رسالتؐ کے گرد جمع ہو جاؤ۔

س :- آپ بنیادی طور پر ایک "صوفی" ہیں۔ ایک سلسلہ تصوف کے شیخ ہیں۔ کیا

صوفیا نے کبھی یوں تنظیمیں بنائی ہیں کیا آپ کے شیخ نے اس طرح کی کوئی تنظیم بنائی تھی؟

ج :- آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں' جب بھی مثبت تبدیلی آئی ہے۔ صوفیا نے اس میں بھر پور حصہ لیا ہے۔ مجدد ثانی صوفی تھے' شاہ ولی اللہ کا پورا خاندان صوفیا کا تھا۔ ہم تک کلمہ توحید' کیا ان اور ان جیسے دوسرے بزرگوں کے ذریعے نہیں پہنچا۔ صوفیا کا اسلام کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ ہمارا ابتدائی مطالبہ یہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں تو اسلام کو "اون" کریں۔ یہ آپ کے والدین کا' دادا جان کا' یا بزرگوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کا اور ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہم پر یہ لازم ہے کہ پہلے خود معلوم کریں' سیکھیں۔ رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر انسانی حقوق کا جو چارٹر دیا' اس پر خود عمل پیرا ہوں اور پھر اسے اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کے لئے جدو جہد کریں۔ ہمارے ہاں شخصی تربیت کا نظام سارا سال چلتا ہے۔ ہم نے دینی تعلیم کے کورسز ترتیب دیئے ہیں۔ جو دنیا بھر میں بذریعہ ڈاک بھیجے جاتے ہیں۔ جو ہمارے ساتھ منسلک ہوتا ہے' اس کو چند روز کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ اس طرح بتدریج اسے مسلمان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

س :- آپ نے اپنی تنظیم کن خطوط پر قائم کی ہے؟

ج :- ہم نے اپنی تنظیم کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ اس نظام میں داخل نہ ہوا جائے بلکہ نظام کو بدلا جائے۔ اس کی جگہ ایک دوسرا نظام دیا جائے۔ ایک متبادل اور ظلم و زیادتی سے پاک نظام۔

س :- آپ کے خیال میں تنظیم الاخوان کیا ہے' اس کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے؟

ج :- تنظیم الاخوان محض مذہبی سیاسی یا فلاحی تنظیم نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تنظیم الاخوان کی نظر میں مذہب سیاست اور فلاح ایک ہی کام کے مختلف معنی

ہیں۔ اگر کوئی محض مذہبی تنظیم ہے تو اس کے پاس دین اسلامی کا جو مکمل ضابطہ حیات ہے' صرف ایک پہلو ہے اگر کوئی محض سیاسی تنظیم ہے تو اسکی مثال ایسے ہے جیسے بغیر بنیادوں کے گھر تعمیر کیا گیا ہو۔ بغیر کسی نظریئے کے کوئی سیاسی سٹرکچر دیرپا نہیں ہو سکتا۔ یا پھر مادر پدر آزاد جنگل کا قانون ہو گا۔ بقول شاعر مشرق :۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پھر اگر کوئی محض فلاحی تنظیم ہے تو فلاح کے لئے سب کے اپنے اپنے اسالیب ہیں۔ خصوصاً آج کل فلاح انسانیت کے نام سے Humanism باقاعدہ ایک مذہب کو جنم دیا جا رہا ہے کہ جی اصل چیز تو انسانیت ہے۔ یہ مذہب وغیرہ' یہ آدمی کا ذاتی معاملہ ہے جبکہ حقیقت میں یہ ساری باتیں دین اسلام کے نظریہ حیات سے بالکل ناواقفیت کی دلیل ہیں۔

تنظیم الاخوان جامع خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ تنظیم نبی رحمتؐ کے حکم کے مطابق کتاب اللہ کی روشنی میں ہر شعبے میں ہر کام کو تدبر' تفکر اور فلاحی نقطہ نظر سے سر انجام دینے کی قائل ہے کیونکہ دین اسلام ہی در حقیقت کامل اور اکمل ضابطہ حیات ہے۔ تنظیم الاخوان محض دوسری تنظیموں کی طرح جذباتی خیالات پسند نہیں کرتی۔ بلکہ ٹھوس دلائل کے ساتھ موجودہ مادی ترقی کے دور کی تمام تر ضروریات کو پیش نظر رکھتی ہے۔

س :۔ آپ کا سلسلہ کتنے واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ تک پہنچتا ہے ؟

ج :۔ ہمارا نقشبندیہ سلسلہ حضرت مجددؒ کے سلسلے سے الگ ہے' یہ نقشبندیہ اویسیہ سلسلہ ہے۔ یہ دوسرے تمام سلسلوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں شیخ کا مرید سے تعلق "ون ٹو ون" نہیں چلتا۔ دوسرے سلسلوں میں مرید' شیخ سے براہ راست اکتساب فیض کرتا ہے ہمارے ہاں فیض حاصل کرنے کے لئے جسمانی طور پر

ملنا ضروری نہیں ہے یہاں روح روح سے فیض حاصل کر لیتی ہے۔ جس طرح حضرت اویس قرنیؒ تک رسول اکرمؐ کی صحبت سے جسمانی فیض اٹھائے بغیر ان کی روح اطہر سے برکات پہنچ گئیں' اسی طرح ہمارے سلسلے میں بھی فیض پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے یہ سلسلہ صرف تیرہ واسطوں سے رسول اکرمؐ تک پہنچ جاتا ہے۔

ہمارے شیخ اول حضرت ابو بکرؓ صدیق ہیں۔ ان کے بارے میں رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ "ابو بکرؓ ظاہری اعمال کی وجہ سے تم پر سبقت نہیں لے گئے۔ ان کی اصل سبقت وہ نعمت ہے جو میرے سینے سے ان کے سینے میں انڈیلی گئی۔"

س :- تو کیا حضرت ابو بکر بھی "صوفی" تھے؟ کیا وہ بھی تصوف کے قائل تھے؟

ج :- بھائی' یہ تصوف کا نام تو بعد میں متعارف ہوا۔ اصل چیز وہ ہے کہ جسے تزکیہ کہتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد قرآن کریم میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں' یعنی ان کے باطن کو جِلا بخشتے اور سوچ کو پاکیزہ انداز عطا کرتے ہیں۔

س :- دوسری جماعتوں اور الاخوان میں کیا فرق ہے؟

ج :- تنظیم الاخوان ہر طرح کے تعصب سے پاک ہے۔ ہم لوگوں کو گروہ بندیوں سے نکال کر صرف اور صرف محمد رسول اللہؐ کے بینر تلے جمع کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری بنیادی دعوت محمد رسول اللہؐ سے محبت ہے!!

س :- آپ کو اپنی کامیابی کا کس حد تک یقین ہے؟

ج :- یہ ٹھیک ہے' اب تک کچھ نہیں ہوا۔ ہم کافی عرصہ تک ان دینی تنظیموں کی معاونت کرتے رہے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اب ضرورت اس امر کی محسوس ہوتی ہے کہ ہمیں خود میدان میں نکلنا چاہئے۔ ہمارا ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ ہم کوئی تیر مار لیں گے لیکن کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم اللہ کی جواب دہی کے احساس سے میدان میں نکلے ہیں۔ اللہ کارساز ہے وہ چاہے تو ہم فقیروں سے کوئی کام

لے لے۔

گھر میں آرام سے بیٹھنے کی اجازت نہ تو اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور نہ ہم اسکا مشورہ دیں گے۔ اگر واقعی آپ کو کسی اور جماعت پر اعتماد نہیں ہے تو پھر خود نکلیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دیں اور یہ دعوت صرف زبانی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر آپ وطن عزیز میں اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں تو میرے اور آپ کے پاس بھی اس پاکستان کا ایک حصہ موجود ہے' ان بارہ کروڑ حصوں کو جوڑو گے تو پاکستان بنے گا۔ اگر ہر فرد اپنے حصے پر اسلام نافذ کرے تو ایک دن آئے گا کہ پورے پاکستان پر اسلام کا پرچم لہرائے گا۔

س :۔ پاکستان میں فرقہ واریت مستقل طور پر ایک مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ آپ کے خیال میں اس فرقہ واریت کے اسباب کیا ہیں؟

ج :۔ دراصل ہماری دینی جماعتوں کی کمزوری یہ ہے کہ ان کے پاس وسائل کوئی نہیں۔ وہ لوگوں کے عطیات اور زکوٰۃ پر ہی تکیہ کرتے ہیں اب جھگڑا نظریاتی مسائل پر نہیں ہوتا بلکہ وسائل پر ہوتا ہے۔ ہر جماعت کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے وسائل کم نہ ہوں۔ اس کے لئے اختلاف ضروری ہے۔ اگر اختلاف نہ ہو تو ان وسائل پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں فرقہ واریت عطیات کا جھگڑا ہے' نظریات کا نہیں عطیات کی تقسیم پر لڑائی ہوتی ہے۔

فرقہ واریت کا ہمارا گہرا مطالعہ ہے ہمارے شیخ مولانا اللہ یار خانؒ بڑی علمی شخصیت تھے۔ وہ برصغیر میں مانے ہوئے مناظر تھے۔ انہوں نے ہندو' سکھوں' اور عیسائی پادریوں سے کئی مناظرے کئے انہوں نے شیعیت پر بھی بہت تحقیق کی جس سے بعد میں مولانا منظور احمد نعمانی نے استفادہ کیا۔ لیکن ہماری مسجد میں کسی شیعہ کو نہیں روکا جاتا تھا۔ ہماری زمینوں میں بھی بڑی تعداد میں شیعہ تھے لیکن کبھی لڑائی

جھگڑے کی نوبت نہیں آئی۔ فقہی اختلافات کا مقصد تصادم نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن تصادم کے اپنے "فوائد" ہوتے ہیں۔ اس سے بڑی تعداد میں فنڈز جنریٹ ہوتے ہیں۔ سادہ لوح عقیدت مند سمجھتے ہیں کہ وہ دین کی خدمت کر رہے ہیں اس سے مختلف مراعات اور تحفظات کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ دین اسلام نے تو ہمیں لا اکراہ فی الدین کا اصول دے دیا کہ گن پوائنٹ پر کسی کا عقیدہ تبدیل نہیں کرایا جا سکتا۔ انسانوں کی لئے دو خدائی حقوق ایسے ہیں جنہیں کوئی نہیں چھین سکتا...... زندگی اور عقیدہ!

اسی لئے میں کہتا ہوں الاخوان مروجہ معنوں میں نہ سماجی تنظیم ہے اور نہ سیاسی جماعت ہے بلکہ ہم صوفیا کی جماعت ہیں۔ ہمارا اصل زور کردار سازی ذکر اذکار اور عبادات پر ہے۔ دینی جماعتیں اپنا کام کر رہی ہیں وہ سیاست میں بھی حصہ لیتی ہیں اور دو چار سیٹیں حاصل کر لیتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کسی نظام کا حصہ بن کر اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ جس نظام سے مراعات اور مفادات حاصل کریں اس کو تبدیل کرنے پر بھی تل جائیں۔ آپ نے کسی وسیع و عریض عمارت میں ایک کمرہ بھی لے لیا اور پھر اسے گرانے کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، مروجہ نظام میں اسلام کا پیوند لگانے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ دین ہمارا آپ کا یا کسی اور انسان کا بنایا ہوا نہیں۔ یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ۔

"دین میں پورے پورے داخل ہو جاؤ"۔ یہ حکم فرد اور ریاست دونوں کے لئے یکساں ہے۔ پھر آدھا تیتر آدھا بٹیر والا معاملہ کبھی نہیں چلا۔ اگر یہ کافی ہوتا تو یقیناً پھر سب مسلمانوں کے لئے کافی ہوتا۔ اور مکمل اسلامی ریاست کے تصور کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

س :- موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کی بات تو بہت سے لوگ کرتے ہیں، لیکن آپ

اس کی جگہ کونسا نظام لائیں گے 'کیا تبدیلی آپ کو مطلوب ہے۔ کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے آپ نے ؟

ج :-ہمارے منشور کا مطالعہ کریں۔آپ کے سامنے واضح ہو جائے گا۔ہم نے مختلف شعبوں کے ماہرین کو یک جا کر کے حالات کی اصلاح کے لئے ایک بنیادی دستاویز تیار کی ہے۔اگر آپ اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم تجویز کرنا چاہیں تو ہم اس پر بھی کھلے دل سے غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔

س :-اس کے بنیادی نکات کیا ہیں ؟

ج :-☆اسلام کا "شورائی" نظام بحال کیا جائے۔بالغ رائے دہی کے ذریعے مملکت کا سربراہ چنا جائے۔اس کی کابینہ پندرہ افراد سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔وہی صوبائی گورنروں کو بھی قائم کرے۔گورنروں اور کابینہ کے ارکان کے نام مشاورت کے لئے شوریٰ کے پاس بھجوائے جائیں۔

☆وفاقی اور صوبائی مجالس شوریٰ کے لئے مخصوص نشستوں پر زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو سامنے لایا جائے۔ یوں کسان' مزدور' صنعت کار' تاجر' وکیل' ڈاکٹر' انجینئرز اور استاد فیصلہ سازی میں شریک ہو سکیں گے۔

☆دستور میں موجود ارکان شوریٰ کی اہلیت کی شرائط کو نافذ کیا جائے۔

☆۱۸ سال سے زائد عمر کے شہریوں کو ووٹ کا حق دیا جائے۔

☆غیر ملکی قرضوں سے فوراً نجات حاصل کرنے کے لئے خصوصی قومی فنڈ قائم کیا جائے اور لوگوں سے عطیات کی وصولی کی جائے۔اندرون اور بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تعاون سے قرضوں سے نجات حاصل کرلی جائے۔

☆غیر ترقیاتی اخراجات محدود کئے جائیں اور ہر طرح کی فضول خرچی فوری

طور پر بند کر دی جائے۔

☆فوجی بیگاری نظام کی تنظیم نو ہو' سود ختم کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں' قرض اور قرض خواہوں کے کوائف باقاعدگی سے مشتہر کئے جائیں۔

☆محاسبے کا مؤثر انتظام کیا جائے اور عملاً رائج کرنے کے لئے پہلے ایجنسیوں کو ہر طرح کی غفلت اور بدعنوانی سے پاک کرنا چاہئے۔

☆ایک مکمل آزاد عدلیہ کا قیام عمل میں لایا جائے اس شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافہ کیا جائے کہ جو انہیں بہتر سے بہتر معیارِ زندگی کی ضمانت دے سکے۔

☆فوری اور جلد انصاف کے لئے اپیل کے مراحل کم کئے جائیں۔ مقدموں کو نپٹانے کے لئے وقت مقرر کیا جائے۔ گشتی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے اور کورٹ فیس ختم کر دی جائے۔

☆نظام تعلیم کی اصلاح کی جائے' اور ایک سال کے اندر اندر قومی سطح پر نصاب تیار کیا جائے۔ اساتذہ کو اعلیٰ مقام دیا جائے۔ نظام امتحانات کو یکسر تبدیل کر دیا جائے۔

☆ایک خاص مد سے زیادہ زرعی آمدنی پر مناسب شرح سے ٹیکس عائد کئے جائیں۔

☆ہر پاکستانی کو عسکری تربیت دی جائے۔

☆سرکاری ملازمین کی جائیداد اور اخراجات کے گوشوارے ہر سال عوام کی اطلاع کے لئے مشتہر کئے جائیں۔

س :- آپ کی تنظیم الاخوان کس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے؟

ج :- بہت تیز رفتاری سے

س :-اس وقت اس کے ارکان کی تعداد کتنی ہے ؟

ج :-ہزاروں میں۔

س :-انتخابات میں حصہ آپ نہیں لیں گے' مسلح جدوجہد پر آپ یقین نہیں کرتے' پھر تبدیلی کیسے آئے گی ؟

ج :-ہم انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن موجودہ نظام انتخاب کے تحت نہیں۔اس وقت کم وبیش ستر فی صد افراد ایسے ہیں جو ووٹ ڈالتے ہی نہیں۔ تیس فیصد کے لگ بھگ لوگوں نے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے گویا اقلیت جمہوریت کے نام پر قابض ہے۔یہ ستر فی صد افراد ہمارے مخاطب ہیں۔ان میں سے بیس فی صد بھی متحرک ہو گئے' انہوں نے سر پر کفن باندھ لیا' تو تبدیلی آجائے گی۔ موجودہ نظام کو اکثریت مسترد کر چکی ہے۔

س :-اعوان صاحب' آپ کی جنرل ضیاء الحق سے ملاقاتیں رہیں' کیا آپ نے ان کے ساتھ مل کر بھی کوئی منصوبہ بنایا تھا؟

ج :-جنرل ضیاء سے میری ملاقات رہی۔ بھٹو صاحب سے بھی ملنے کا موقع ملا۔سیاست سے الگ ہو کر بات یہ ہے کہ جنرل ضیاء ذاتی طور پر بڑی خوبیوں کے مالک تھے ان سے میں نے کہا کہ ہم نظام تعلیم پر کام کریں گے اور ایک ماڈل وضع کریں گے۔پاکستان کا نظام تعلیم اس کے مطابق استوار کیا جا سکے گا۔وہ منارہ آئے' انہوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی' لیکن جب ہمارا کام آگے بڑھا تو وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ہم نے اپنے "پائلٹ پروجیکٹ" کو دیکھنے کے لئے میاں نواز شریف اور ان کے وزارئے تعلیم کو دعوت دی کہ وہ اسے ملک بھر میں پھیلانے کے بارے میں سوچیں' لیکن ان حضرات کو فرصت نہیں تھی یا پھر اس طرف ان کا رجحان نہیں تھا۔انہوں نے اس طرف نہیں دیکھا۔ بہر حال ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

س :۔کیا ان حالات میں ضرورت نہیں ہے کہ پہلے اس طبقے کی اصلاح کا پروگرام بنایا جائے ؟

ج :۔ضروری ہے۔ہم یہ کام کر رہے ہیں۔اس طبقے سے ہم ناامید نہیں ہیں۔اس سے ہمارا رابطہ ہے اور تعلیمی نظام کا جو ماڈل تیار کر رہے ہیں۔یہ اس کی طرف آ بھی رہے ہیں۔

س :۔آپ کیا محسوس کرتے ہیں' آپ کی اس کاوش کے کیا اثرات مرتب ہوں گے ؟

ج :۔ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایک ٹپیکل (typical) اسلام سب پر مسلط کر دیا جائے ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو براہِ راست قرآن سکھایا جائے۔نبی کریمؐ کے ارشادات بتائے جائیں' ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق اس فریم ورک میں کچھ سیکھ سکے' اور پھر آگے سکھا سکے' وہ سب ٹھیک ہے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنی یا ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے ان معاملات میں الجھے بغیر اسلام پر عمل کیا جائے اسکی روح کو سمجھا جائے اور ہر شخص ایک خاص سانچے میں ڈھلتا جائے۔ہم جبراً ہر ایک کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنا نہیں چاہتے۔

س :۔خواتین ہماری آبادی کا تقریباً نصف سے بھی زیادہ حصہ ہیں۔آپ معاشرے میں خواتین کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں ؟

ج :۔جب ہم بات دین اسلام کی کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے تو پھر خواتین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کیوں نہیں کرتے۔اور اس پر عمل پیرانہ ہونے کے بہانے کیوں تلاش کرتے ہیں۔اسلام کے منصۂ شہود پر طلوع ہونے سے پہلے کی تاریخ انسانی میں ہمیں سب سے زیادہ مظلوم' حقیر اور رسوا کن جانوروں کے درجے سے بھی نیچے جو طبقہ نظر آتا ہے۔وہ خواتین کا

ہے اور عجیب بات ہے کہ باوجود بے شمار ترقی کے بے شمار علومِ جدیدہ کے اس دور میں بھی اگر اسلامی فلسفہ حیات کو نکال دیا جائے تو عورت کی حیثیت عورت کوئی اہمیت نہیں۔ آج تہذیب جدید نے بہت بڑا کارنامہ یہ کیا ہے کہ عورت پر آزادی اور برابری کے نام پر مرد کے کندھے کا سارا بوجھ لاد کر اسے میدان میں لا کھڑا کیا اور بغیر کسی عزت و احترام کے ماچس کی ڈبیا سے لے کر ایک قیمتی گاڑی تک بیچنے کے لئے اسے بطور اشتہار استعمال کیا۔ اور جو ذمے داریاں عورت کی تھیں وہ بہر حال عورت کے پاس رہی رہیں۔ ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ "عورت میدان میں آکر ہر وہ کام کر سکتی ہے جو مرد کرتا ہے، مگر وہ عورت نہیں رہتی۔"

اسلام نے آکر عورت کو ماں کی عزت دی، بہن کی عزت دی، بیٹی کی محبت دی، بیوی کے حقوق عطا کئے خاوند کی میراث میں حصہ دیا۔ باپ کی جائیداد کا وارث بنایا۔ بیٹے کی جائیداد کا وارث بنایا۔ حتیٰ کہ پہلی دفعہ صدیوں بعد گمراہ انسانیت میں عورت کو پسند اور ناپسند کا اختیار ملا اور اس کا حق مہر لازمی قرار دیا۔ جو آج صرف ایک رسم رہ گئی ہے جب کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ جس گھر میں عورت جاتی ہے اس گھر کا ہر فرد پہلے سے اس جائیداد کا مالک یا وارث ہوتا ہے تو نئی آنے والی خاتون کو بھی گھر والوں کی حیثیت کے مطابق حصہ دیا جائے تاکہ وہ بھی اس گھر میں کچھ حصے کی مالک کہلائے۔

اللہ کریم نے نسل انسانی کو اسطرح جہاں میں بسایا کہ یہاں کام کرنے والے اپنی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ننھی ننھی کونپلوں کے بیج بوتے اور انہیں پانی دیتے۔ سینچتے اور نیا گلشن سجاتے چلے جاتے ہیں۔ انسان ہونے میں تو دونوں برابر ہیں۔ ایک ہی میدان میں ایک ہی عظیم ترین ہستی کے سامنے جولیدہ ہیں۔ دنیا میں آج پھر ہم نے مرد اور عورت کو بہت دور کر دیا ہے ایک طبقے نے پھر دین کے نام پر

اسے عہد جاہلیت میں جا پھینکا۔ جہاں عورت کی کوئی رائے، اس کو کچھ کرنے یا نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ بھول گئے کہ کوئی نبیؑ بھی کسی خاتون کی گود کے بغیر دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ عورت اگر نبی نہیں ہے تو نبی کی ماں تو ہے۔ کسی خاتون ہی کے سینے سے لگ کر اس نے پرورش پائی۔ اور دوسرے طبقے نے بڑی دلفریب صداؤں سے عورت پر اپنے حصے کا بوجھ لاد دیا۔

اب آپ اندازہ کر لیں ہم خواتین کو کیا کردار دینا چاہتے ہیں۔ ہم خواتین کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کروانا چاہتے ہیں جو کہ بالکل ناپید ہے یہ خواتین کی ذمے داری بھی ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو پہچانیں۔ تنظیم الاخوان نے خواتین کے لئے "الاخوات" کے نام سے ایک شعبہ قائم کر دیا ہے جس کا مقصد خواتین کو قرآن وحدیث کا عام فہم درس مہیا کرنا ہے تاکہ خواتین کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ان کے گلشن میں اللہ تعالیٰ جو پھول کھلا رہا ہے اس میں وہ رنگ بھر دے کہ شناخت ہو جائے کہ یہ پھول محمد رسول اللہؐ کے دبستان کے پھول ہیں۔ یہ اسلام کے پھول ہیں۔

س :- کیا تنظیم الاخوان میں بھی خواتین کا کوئی عمل دخل ہے؟

ج :- تنظیم الاخوان خواتین کو میدان عمل سے بے دخل نہیں کر رہی ہے۔ اس لئے تنظیم میں خواتین کا شعبہ "الاخوات" قائم کر دیا گیا ہے۔ ہم نے صرف خواتین کے میدان عمل کا تعین موجودہ دور کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر قرآن وحدیث سے کیا ہے۔

خواتین کا اصل میدان بلا شبہ پہلے ان کا گھر اور پھر کوئی دوسری جگہ ہے تنظیم الاخوان مجاہدین کی تنظیم ہے اب اس میں موجود تمام حضرات گھر اور گھر سے باہر کام کر رہے ہیں ہماری دینی غیرت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم جانفشانی سے

س :۔بھٹو صاحب سے آپ کی ملاقات کیسے ہوئی؟

ج :۔یہ اللہ کا احسان ہے کہ میں جس شعبے میں بھی قدم رکھتا ہوں' مجھے کامیابیاں ملتی ہیں۔ایک وزن محسوس کیا جاتا ہے۔سیاسی شخصیات بھی ہماری ضرورت محسوس کرتی رہتی ہے' یہ اور بات کہ ان سے "ورکنگ ریلیشن شپ" قائم ہو سکے یا نہ۔تعلقات اسٹیبلش ہوتے رہتے ہیں'بات چلتی رہتی ہے۔بھٹو صاحب میں بھی کئی خوبیاں تھیں۔آخری زمانے میں ان کے اندر یہ خوشگوار تبدیلی آئی تھی کہ وہ موجودہ نظام سے مایوس ہو چکے تھے۔وہ مروجہ سیاست سے تھک چکے تھے'لیکن ان کے گرد جس حلقے نے دیوار بنادی تھی وہ انہیں آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔

س :۔مگر وہ تو دھن کے پکے تھے'آگے اپنے طور پر بڑھ سکتے تھے؟

ج :۔میں سمجھتا ہوں' ہمارے اسلامی طبقے نے ان کی افادیت کو محسوس نہ کیا۔ان لوگوں کا کہنا تھا کہ بھٹو فرشتہ بھی بن جائے تو اس پر اعتبار نہیں ہو سکتا'اس سے تعاون نہیں ہو سکتا۔

س :۔اسلامی طبقے میں سے تو کوئی جنرل ضیاء الحق کی بارے میں بھی یہی کہتے تھے؟

ج :۔یہ اصل میں بدنصیبی کی ابتدا ہے۔یہ لوگ "ون سائیڈڈ" ہو جاتے ہیں۔یہ مخلص'نیک اور اچھے لوگ تو ہیں لیکن حکمت سے کام نہیں لیتے۔دنیا کی کسی اور قوم کو ضیاء الحق جیسا نظریاتی بندہ مل جاتا تو وہ چند برسوں میں اس سے اتنا کام لے لیتی کہ صدیوں کے لئے کافی ہوتا۔مگر ہمارے دینی طبقے انہیں صحیح طور پر استعمال نہ کر سکے۔ان سے کام نہ لے سکے۔

س :۔مگر آپ نے خود بھرپور استفادہ کیوں نہ کیا؟

ج :۔ہم اس لئے نہ کر سکے کہ ثمرات اجتماعی سطح پر آگے جا سکتے تھے'انفرادی کوشش سے ان کا حصول ممکن نہ تھا۔

میدان عمل میں ہر جگہ کام کریں حتیٰ کہ کامیاب ہو جائیں۔

شعبہ "الاخوات" خواتین میں صحیح اسلامی اقدار کی روح پھونکے گا تاکہ ان کی کوکھ سے صالح اولاد پیدا ہو اور "الاخوان" کے ذریعے ان عام خواتین کو جو گھر سے باہر فیلڈ میں موجود ہیں انہیں ان کے حقیقی حقوق و فرائض سے آگاہ کرے۔ ان خواتین کے ذمے یہ بھی ہوگا کہ موجودہ دور کے وہ چیلنج جو خواتین کو درپیش ہیں ان میں ان کی راہنمائی کرے اور معاشرے میں دین ہر طرح سے ان کو تحفظ فراہم کرے۔

س :۔ آپ کے خیال میں اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

ج :۔ ہمارا مسئلہ آج بھی یہ ہے اور آج سے تب تک یہی رہے گا جب تک ہم واپس اپنی جگہ پر نہیں آتے کہ ہم ایک آزاد قوم ہیں' جو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ جھکے تو اس کا اپنا وقار یا تشخص باقی نہیں رہتا۔ قومی تشخص لباس ہوتا ہے وہ حوادث زمانہ سے بھی بچاتا ہے اور آبرو اور عزت بھی دیتا ہے۔ اگر کسی کو بے لباس کر کے چھوڑ دیا تو وہ کہاں عزت پائے گا کیسے عزت پائے گا کون اس کی توقیر کرے گا ہم جب اپنے قومی تشخص' اپنی آئیڈیالوجی' اپنے نظریہ کو چھوڑ کر دوسری طرف جاتے ہیں۔ تب گڑبڑ ہوتی ہے۔

میری نظر میں ہمارا مسئلہ صرف یہ ہے کہ نظام کو بدلا جائے۔ اپنا نظام اپنایا جائے۔ سارے مسائل کا حل اسی میں موجود ہے۔ دہشت گردی کا بھی ناانصافی کا بھی بیروزگاری کا بھی، بھوک اور افلاس کا بھی جتنے بھی مسائل ہیں ان کا حل صرف اسی ایک میں موجود ہے اور یہ کام کرنا میری ذمے داری بھی ہے اور آپ کی بھی پیر صاحب کی بھی اور استاد کی بھی ہم پر ویسے بھی جہاد فرض ہے جیسے آپ کشمیر میں لڑ رہے ہیں ہم کشمیر میں کیوں جہاد کر رہے ہیں میرے ساتھی بھی وہاں جانیں دے

رہے ہیں ہمارے دوست بھی وہاں کام کر رہے ہیں۔ مجبوری ہے ظلم ہو رہا ہے مسلمانوں پر اور جو ہو سکتا ہے کرنا چاہئیے۔ کیا کشمیریوں پر ظلم ہو رہا ہے اور یہاں نہیں ہو رہا ہے وہاں عزتیں لٹتی ہیں یہاں محفوظ ہیں۔ وہاں گھر جلتے ہیں یہاں کوئی نہیں جلتا۔ اگلے دن کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا آپ کیا بات کرتے ہیں یہاں مسلمانوں سے جہاد کیسے؟ میں نے کہا کون کہتا ہے مسلمانوں سے جہاد کرو۔ ہم کہتے ہیں اسلام نافذ کرو۔ اب جو اس کے نفاذ کو روکنا چاہے وہ کیا مسلمان ہے؟ ہمیں تو اسلام کے لئے لڑنا ہی پڑے گا۔ ہم اس کے خلاف تو نہیں لڑ رہے وہ غلط جگہ چلا گیا اسے یہاں ہونا چاہئے تھا۔ اگر وہ وہاں بیٹھا ہے جہاں ہم لڑ رہے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور۔

س:- آپ نے وزیر اعظم صاحب کو علماء کونسل قائم کرنے کی تجویز دی ہے کچھ اس کی تفصیلات بتائیں؟

ج:- میں نے حکومت کو تجویز پیش کی ہے کہ وہ علماء کی ایک کونسل قائم کرے جو وزیر اعظم کو مشورہ دے گی کہ کون سا حکم اسلامی شریعت کے مطابق ہے اور کون سا نہیں۔ اس کونسل میں ایسے علماء شامل کئے جائیں جنہوں نے اسلامی قانون میں خصوصی مہارت حاصل کی ہو۔ اس کونسل کے مشورے کے بعد وزیر اعظم جو حکم جاری کریں گے اس پر کوئی یہ اعتراض نہیں کر سکے گا کہ یہ وزیر اعظم نے ذاتی طور پر جاری کیا ہے۔

س:- کیا آپ کے خیال میں پارلیمنٹ کو علماء کی اس نامزد کونسل پر اعتراض نہیں ہوگا؟

ج:- پارلیمنٹ کیوں معترض ہوگی؟ اس شریعت بل کی منظوری پارلیمنٹ ہی نے دی ہے۔ پارلیمنٹ کی اتھارٹی سے ہی یہ کونسل وجود میں آئے گی۔ اس لئے علماء کونسل اور پارلیمنٹ میں بظاہر تصادم کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

س :-آپ نے علماء کونسل کی تجویز پیش کرنے کے لئے مختلف مکاتب فکر کے علماء سے مشورہ کیا؟

ج :- نہیں' میں نے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ ذاتی طور پر ہی یہ تجویز پیش کی ہے۔ میں نے یہ تجویز کوئی خفیہ طور پر پیش نہیں کی تھی بلکہ تقریباً ساڑھے تین ہزار علماء کی موجودگی میں پیش کی تھی۔ وزیر اعظم صاحب نے میری اس تجویز کو سراہا ہے۔

دراصل ہمارے علماء کرام کا مسئلہ یہ ہے کہ اب ان کا مزاج کچھ غصیلا ہو گیا ہے۔ وہ احتجاج پر یقین رکھنے لگے ہیں' رہنمائی میں نہیں' اگر وہ اپنے آپ کو صرف رہنمائی تک محدود کر لیں تو ان کے لئے بہت آسانی ہو جائے گی۔

اس کنونشن کے بعد ذاتی طور پر میرا وزیر اعظم سے کوئی رابطہ تو نہیں ہوا۔ کنونشن کے بعد وہ بیرون ملک چلے گئے۔ ویسے بھی مجھے سرکار دربار سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے میں ٹھیک سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان پر کیا اثر ہوا تھا۔ البتہ انہوں نے سٹیج پر کنونشن کے دوران ہی ایک چٹ لکھ کر مجھے بھیجی جس پر لکھا ہوا تھا' آپ کی تجویز عمدہ ہے' انشاء اللہ اس پر غور کریں گے۔

س :- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایرانی طرز پر خون خرابے کے بغیر کوئی تبدیلی ممکن نہیں؟

ج :- میرا خیال ہے خون خرابہ کسی مسئلے کا حل نہیں۔ ایران میں انقلاب امن سے اور سکون سے آیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جسے لوگ خون خرابہ کہتے ہیں' وہ ان کے عدالتی فیصلے کے ذریعے مارے گئے۔ ان کے عدالتی فیصلوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا' یہ خون خرابہ تھا وہ قتل وغارت تھی جو نظام نو سے بغاوت کرے گا' اسے اس کی سزا بھگتنا ہو گی۔

س :- اس وقت "رہنما سیاسی جماعتوں" میں جماعت اسلامی اور خالص دینی جماعتوں

میں تبلیغی جماعت اہم ہیں۔ آپ ان کی اب تک کی کارگردگی کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج :- میرے دل میں باقی دینی جماعتوں کی طرح ان جماعتوں کی بھی بہت قدر ہے۔ جماعت اسلامی کے حوالے سے میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ فرد کی تعمیر سیرت کے لئے یہ جماعت ایک عرصے سے کام کر رہی ہے لیکن اسے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ میں پوری دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ اگر جماعت اسلامی کے پاس "ذکر الٰہی" کا سرمایہ ہوتا تو انقلاب اسلامی کا کام بہت پہلے ہو چکا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جماعت اسلامی کو جو ذہن دیا۔ جو انسان دیا جس پائے کی قیادت اسے نصیب ہوئی اور جس طرح کی تنظیم بنانے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ ان میں کہیں کوئی کمی اور جھول نظر نہیں آتا۔ پھر کون سی کڑی ناپید ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک سرگرم عمل رہنے کے باوجود یہ کامیاب نہیں ہو سکی۔

میں سمجھتا ہوں ان کے عقل و دماغ نے تو حقیقت پائی لیکن دلوں کے اندر وہ جذب و کیف وہ طاقت و صلاحیت پیدا نہ ہو سکی جو صرف ذکر الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مولانا مودودی مرحوم نے ذکر کے فضائل اپنی تفسیر قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان تو کر دیئے لیکن جماعت کے اندر عملاً اس کا اہتمام نہیں ہو سکا۔ اگر جماعت اسلامی میں یہ وصف بھی پیدا ہو جاتا تو آج شاید کسی اور تنظیم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

تبلیغی جماعت کے متعلق عرض کروں گا یہ مخلص اور دین دار لوگوں کی جماعت ہے اور بہت فعال ہے۔ مسلمانوں کو برائیوں سے بچانے اور نیکی کی طرف راغب کرنے میں اس کا اہم کردار ہے۔ اس کے لئے اس کا طریقہ کار موثر اور عملی ہے۔ رائے ونڈ میں ان کے اجتماعات تعداد کے لحاظ سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ یہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ تسبیح کرتے ہیں چلے کاٹتے ہیں گلی گلی گھر گھر تبلیغ کرتے ہیں مگر شاید انہوں

نے معاشرے کی سماجی اور سیاسی برائیوں کو اجتماعی طریقے سے روکنا اپنے نصاب میں شامل ہی نہیں کیا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ ابھی سے اسلحہ اٹھالیں اور حکومتوں کو گرانے کے درپے ہو جائیں۔ میں سمجھتا ہوں رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع کے لوگ اگر تسبیح پڑھتے' اپنے بستر اور مصلے کندھوں پر اٹھائے اسلام آباد کی طرف چل پڑیں' تو جابر سے جابر حکمران بھی اطاعت دین پر مجبور ہو جائے۔

ایک مرتبہ جس وقت محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم تھیں تو وہ کہا کرتی تھیں کہ یہ جو اسلام کی سزائیں ہیں یہ تو وحشیانہ ہیں۔ یہ انفرادی باتیں ہیں ہم کہتے ہیں کہ اسلام نہ عبادات کا نام ہے اور نہ ہی سزاؤں کا نام۔ یہ تو حقوق و فرائض کا علمبردار ہے اسلام میں حقوق و فرائض متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر عمل ہونا چاہئے اور ہر سطح پر عمل ہونا چاہئے۔ عبادات کا تعلق اللہ سے ہے وہ اللہ اور فرد کا معاملہ ہے اسلام نے جو حقوق متعین کئے ہیں وہ فرد کے ساتھ فرد سے متعلق ہیں اور اسلام فرد کے ساتھ فرد کے تعلق پر بہت زور دیتا ہے اس کے اندر حقوق متعین ہیں۔ اب دیکھئے ناں ہر آدمی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے وہ مسلمان ہو یا کافر ہر آدمی کا جان و مال محفوظ ہونا چاہئے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ انسانی ضروریات غذا، تعلیم، رہائش ہر مسلمان اور کافر کا حق ہیں۔ ہمارے ہاں اس تصور کو نہیں ابھارا جاتا کہ انسانی حقوق کے معاملہ میں عیسائی ہندو سکھ اور مسلمان سب کے سب برابر ہیں۔ حضورؐ کے زمانے میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ جو لوگ قیدی ہو کر مدینے میں آتے تھے انہیں وہاں اپنے عقیدے کے مطابق عبادات کی اجازت تھی۔ کسی نے ان پر مذہب تبدیل کرنے کے لئے دباؤ نہیں ڈالا۔ اسلام کی غلط تعبیروں نے دراصل ہمیں الجھا کے رکھ دیا ہے اس الجھاؤ کی بدولت آج خانہ جنگی کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔

یہاں تو ہم نے تماشہ بنالیا ہے کہ وہ شیعہ ہے تو اسے گولی مار دو۔ وہ قادیانی ہے

تواسے گولی ماردو وہ بریلوی ہے تواسے گولی ماردواور کوئی دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھتا تواسے گولی مار دو۔ اسلام تو غیر مسلم کے ساتھ بھی اس سلوک کی اجازت نہیں دیتا۔ جو پاکستان کے اندر مسلمان اپنے بھائیوں کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے لوگوں کو الجھا دیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اگر کوئی ایمان لے آیا ہے تو وہ معاشرے کے افراد کے ساتھ اپنا تعلق اسلام کی بنیاد پر قائم رکھے اور معاشرے میں رہنے والے افراد کے حقوق کا خیال رکھے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی بھی مسلمان اپنے حقوق سے تجاوز نہ کرے بلکہ اگر ہو سکے تو دوسرے کے معاملے میں درگزر سے کام لے۔ الحمد للہ ہمیں اس سلسلہ میں خاصی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ جب ہم لوگوں کو ان کے حقوق کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر ایک بہت بڑی طاقت بنے گی جو اسلامی انقلاب لائے گی۔

س :- بعض سیاستدان فوج کو حکومت دینے کی بات کر رہے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج :- ہمارے جو سیاستدان ہیں میں انہیں نابالغ سمجھتا ہوں۔ فوج کو سیاست میں مداخلت کی اجازت دینا سیاسی عدم بلوغت کی نشانی ہے۔ کیونکہ فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے سیاست کرنا نہیں لیکن جب سیاستدان انہیں ملوث کر لیتے ہیں تو پھر خود ہی چلانے بھی لگتے ہیں۔

س :- آپ مختلف مواقع پر حکومت کے خاتمے کے دعوے کرتے ہوئے اس کے لئے باقاعدہ تاریخ بھی دیتے رہے ہیں ایسا آپ کس بنیاد پر کرتے ہیں؟

ج :- میں نے کبھی دعویٰ یا اعلان نہیں کیا البتہ مختلف موقعوں پر تجزیئے کرتا رہا ہوں جو اکثر اوقات درست بھی ثابت ہوئے ہیں میں نے جون سے پہلے حکومت کے اتحادیوں کی علیحدگی کے بارے میں بتایا اور جون میں حکومت کے بڑے بڑے اتحادی

ٹوٹ گئے۔ اب میں کہتا ہوں کہ حکومت کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ شریعت نافذ کر دے اور اس سلسلے میں خلوص سے کام لے اس طرح ان کی آخرت بھی بچ جائے گی اور دنیا بھی، ورنہ انہیں شاید دونوں جگہ پر مایوسی ہو گی جہاں تک حکومت کے خاتمے کی بات ہے تو ہم اسے فتح کرنے والے کون ہوتے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ کراچی میں پولیس کے بے شمار افراد مارے گئے اور انہوں نے ساٹھ ساٹھ لوگوں کے قاتل پکڑے جنہیں چھوڑ دیا گیا۔ عقوبت خانے پکڑے گئے الطاف پر کئی مقدمات ہیں 28 سال کی سزا ہو چکی ہے لیکن حکمران اسے ملتے ہیں یہ ظلم ہے اس میں نہ ہم حکومت کا ساتھ دیتے ہیں نہ حمایت کرتے ہیں۔

س :-پاکستانی معاشرے خصوصاً نظام تعلیم میں جدید اور قدیم کی تقسیم کے متعلق آپ کیا کہیں گے ؟

ج :-انگریز کی آمد سے قبل' جب تک بر صغیر میں مسلمان حکمران رہے' اس سر زمین پر یہ تقسیم نہیں تھی۔ ایک ہی قسم کے تعلیمی ادارے تھے جن میں جدید اور قدیم کی تقسیم نہیں تھی۔ انگریز نے بر صغیر پر قبضے کے بعد یہاں اپنے ادارے بنالئے۔ قیام پاکستان کے بعد اولین ضرورت جدید اور قدیم کی اس تقسیم کے خاتمے کی تھی لیکن بد قسمتی سے اس طرف توجہ نہ دی گئی۔ دینی ادارے اپنی قدامت پسندی کے اتنے اسیر ہو چکے ہیں اور جدید علم سے اتنے دور کہ انہوں نے ہر "جدت" کو کفر سمجھا۔ دوسری طرف جدید تعلیمی اداروں نے ہر "قدامت" کو مسترد کر دیا اور آج پچاس سال بعد بھی صورت حال یہ ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور پوری دیانتداری کے ساتھ ایک دوسرے کو موجودہ تباہی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ہم جدید اور قدیم کی اس خلیج کو کم کرنا چاہتے ہیں ان کے درمیان پل بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے ضیاء الحق دور میں انہیں ایک تعلیمی منصوبہ بنا کر دیا انہوں نے

اسے حکومتی ماہرین کے سپرد کر دیا جو خود "جدید اداروں" کے فارغ التحصیل تھے۔انہوں نے اسے نا قابل عمل قرار دے کر مسترد کر دیا۔ چنانچہ ہم نے اسے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے وسائل کی کمی کے باوجود سکول کی سطح تک ایک ماڈل نظام تعلیم قائم کیا۔

س :-نفاذ شریعت کے سلسلے میں کیا حکومت نے آپ کو اعتماد میں لیا ہے دوسری گزارش یہ ہے کہ اسلام میں قرآن پاک میں ہر چیز واضح ہے پھر کونسی نئی چیز کی وضاحت چاہتے ہیں۔اس کے علاوہ کیا دنیا کے کسی ملک میں اسلام نافذ ہے اگر ہے تو کہاں ؟

ج :-آپ کے تین سوال ہیں پہلے کا جواب یہ ہے کہ وزیر اعظم کی سربراہی میں جو اسلام آباد میں علماء کی کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی میں نے یہ گزارش کی تھی کہ علماء کا ایک پینل تشکیل دیں جو علمی اعتبار سے قرآن اور اس کے نزول کے اعتبار سے قرآن پاک پر صحابہ کرام کا عمل، صالحین کی آراء پھر مختلف ادوار میں اجتہاد اور ضروریات کے مطابق فیصلے، پھر عہد جدید یعنی ماڈرن دنیا کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر یہ رہنمائی کر سکیں کہ جب بھی کوئی کام سامنے آئے تو اس کے بارے میں قرآن وسنت کی رہنمائی کیا ہے۔ میری اس بات کو وزیر اعظم نے بھی پسند کیا۔اس کے بعد پھر رابطہ نہیں ہو سکا۔وزیر اعظم نے میری بات کو اپنی تقریر میں بھی سراہا اور میری طرف ایک پرچی بھی بھیجی کہ یہ اچھی بات ہے۔دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے فیصلے طے شدہ ہیں لیکن وہ صورت حال جس پر یہ فیصلے لاگو کرنے ہیں وہ طے کرنا ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے نزول سے لے کر قیامت تک کے لئے قابل عمل ہے۔جس زمانے میں اسلام کا نزول ہوا اس وقت دنیا کے کسی کونے میں بھی کوئی نظام نہیں تھا۔سب کچھ طاقت سے چلتا تھا

اسلام نے نظام حکومت کو عوامی سطح پر متعارف کرایا۔ دوسرے مذہب جو آسمانی بھی تھے لیکن وہ مختلف اقوام اور مختلف علاقوں کے لئے تھے لیکن نظام اسلام پوری انسانیت کے لئے ہے۔ ترکی میں اسلامی حکومت ختم کی گئی جس کے رد عمل کے طور پر تحریک خلافت وجود میں آئی۔ یہ مسلمان حکمران لا کر مسلط کئے گئے۔ مشرق وسطیٰ میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اپنے پاکستان میں دیکھ لیں ایک مخصوص طبقہ جو انگریز کے مفاد میں کام کرتا ہے وہی اوپر لایا گیا اور ابھی تک ہے۔ اگر کوئی حادثاتی طور پر اوپر آتا ہے تو اسے اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ اب ہمیں بیدار ہو جانا چاہئے اور میں سمجھتا ہوں کہ احساس بیداری پوری امت مسلمہ میں پیدا ہو گیا ہے۔

س :۔ ''الاخوان'' کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

ج :۔ تنظیم الاخوان کا نام قرآن مجید سے لیا گیا ہے اس کا مطلب ہے بھائی بھائی، بھائی بندی، بھائی چارہ۔

س :۔ الاخوان کو بیرون ملک سے سپورٹ ملتی ہے؟

ج :۔ تنظیم الاخوان کے ہر رکن کی جان مال اور وقت اسکے لیے حاضر ہے اور ویسے بھی کسی بھی ملک کی پشت پناہی کی ضرورت نہیں۔

س :۔ دوسری تنظیموں اور الاخوان میں کیا فرق ہے؟

ج :۔ ہماری تنظیم کی بنیادی دعوت محبت رسولؐ ہے ہم تمام فروعی اختلافات سے اور خصوصاً ہوس اقتدار کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہیں۔

س :۔ الاخوان کی بنیاد کب پڑی؟

ج :۔ حقیقت میں اس تحریک کی بنیاد 1952 میں اس وقت پڑی جب اللہ کے ایک برگزیدہ بندے مولانا اللہ یار خان نے پہلے شخص کو یوں دعوت دی کہ ''آؤ میں تمہارے قلب کا تزکیہ کروں۔

س:-اگر کل کلاں آپ کو لوگوں کی بھرپور تائید حاصل ہو جائے تو آپ کے پاس اس موجودہ سیٹ اپ کو تبدیل کرنے کا کیا طریقہ کار ہے؟

ج:-اگر عوام اپنی بے حسی کو دور نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کسی کے منتظر رہیں یا فقط دعاؤں پر اکتفا کرنے لگیں تو پھر تاریخ بتاتی ہے کہ ان سے زبردستی قربانی لی جاتی ہے ہر طرح کی قربانی جانی ومالی اور یوں کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان نے کہا کہ "اصل بات یہ ہے کہ ہم نے دین کو اپنا سمجھا ہی نہیں ہم نے اسے مولویوں کا، پیر صاحبان کا، بزرگوں کا سمجھا ہے اب اگر میرے پاس ایک بکس ہے جسے میں نے بڑا سنبھال کر رکھا ہے کہ یہ میرے والد صاحب کا ہے میرے بزرگوں کا ہے پیر صاحب کا ہے مولوی کا ہے اور مجھے اس سے بڑی عقیدت ہے اور میں نے اسے سینے سے لگا رکھا ہے تو جب مجھ سے کوئی پوچھے کہ میاں اس میں کیا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ جی یہ تو والد صاحب جانے ہوں گے کہ میں نے تو اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھا ہے میں نے تو اسے ابھی تک نہیں کھولا۔ مجھے کیا معلوم اس میں کیا ہے تو میرے پاس جو دین اللہ کی کتاب اور اور اس کے رسول کریمؐ کا اسوہ حسنہ ہے یہ ہمارا اپنا ہے ہی نہیں۔ یہ تو والد صاحب کا مولوی صاحب کا یا پیر صاحب کا ہے اور اس جہالت کا اندھیرا اس وقت تک دور نہیں ہوگا جب تک ہم اس بکس کو کھول کر نہیں دیکھیں گے جب تک ہم اللہ کی کتاب کو سمجھیں گے نہیں جب تک ہم رسول اللہؐ کے ارشادات کو پڑھیں گے نہیں یہ تو نام ہے مزے سے زندگی گزارنے کا مولانا محمد اکرم اعوان نے اپنے تفصیلی بیان میں کہا۔ یہ مراقبے یہ وعظ تسبیح یہ درود یہ تبلیغی چلے، یہ کیا ہے یہ سار ادرست جس طرح فوجیوں کو پریڈ کرائی جاتی ہے جس طرح انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے نتیجہ کیا ہوتا ہے ان کی پریڈوں کا۔ انہیں ٹریننگ دینے کا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کریں۔ یہ

ساری عبادات پریڈ ہیں مومن کی کہ وہ میدان میں آکر اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرے اب اگر ساری پریڈ سکھا کر اسلحہ لے کر دشمن کے پاؤں چاٹنے لگے اور دشمن جس طرح کہے وہ کرنے لگے تو آپ اس کا کیا انعام دیں گے کفر کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والوں کو بھی اتنا ہی انعام ملے گا جتنا اس فوج کو ملے گا۔

حضرت مولانا نے فرمایا اس دور کے مسلمانوں کو غلط فہمی ہے کہ ہمیں خصوصاً اس عہد کے مسلمانوں کو کہ رحمت الٰہی اخروی نجات ہے جنت ہے جنت کے انعامات ہیں رحمت الٰہی جنت ہے۔ لیکن ملے گی انہی کو جو دنیا میں رحمت الٰہی کا مظہر ہوتے ہیں وہ آخرت میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں گناہ سے سمجھوتہ اور دین سے بیزاری ہے تو وہ اس آس پر نہ بیٹھا رہے کہ آخرت کی سرخروئی اسکے حصے میں آئے گی۔ آخرت کی سرخروئی اس کے ہاتھ میں آئے گی جسے دنیا میں مدد الٰہی نصرتِ الٰہی کا احساس ہوگا۔ ہمارے مغرب کے دانشور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسلمان کہتے ہیں کہ "سچائی پر اسلام کی اجارہ داری ہے"۔ اسلام کی سچائی پر اجارہ داری نہیں، سچائی اسلام ہی میں ہے۔ اسلام سے باہر سچائی کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ ہماری صورتحال یہ ہے کہ ہماری عملی زندگی خلاف اسلام سمجھوتوں پر گزر رہی ہے دنیا کے بدترین عیاش شرابی لوگوں کو ہم اقتدار میں لاتے ہیں دنیا کے بدکردار لوگوں کو قیادت دیتے ہیں۔ دنیا کا بدترین نظام ہم نے گلے میں ڈالا ہوا ہے جو محض غلاموں کو مزید غلام رکھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو خود انگریز کے ملک میں نہیں سکا چل۔ یہ ان ممالک کے لئے تھا جن پر انگریز قابض تھا اور انہیں غلام رکھنا چاہتا تھا۔ رائی برابر بھی شرم ہو تو ہم روضہ رسول کی حاضری کے بھی قابل نہیں رہے ہیں کیا جا کر بتائیں گے۔ کہ ہم سود کھاتے ہیں یا ہماری بیٹیاں ڈانس کرتی ہیں ہمارے ہوٹلوں میں عصمت فروشی ہوتی ہے۔ کیا ملک کے بڑے نہیں جانتے جو

ہوٹلوں میں عیاشی کرنے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان نے فرمایا ہماری تنظیم جو عملی طرز پر اسلام کی داعی ہے ہم کہتے ہیں اسلام کو سیکھا جائے اپنایا جائے اپنے اوپر نافذ کیا جائے اور ملک اور معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ سیاست کا مطمع نظر اقتدار ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم غیر سیاسی ہیں ہم اقتدار کی خواہش نہیں رکھتے۔ نفاذ اسلام کے حامی ہیں جو اقتدار میں ہیں انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ نفاذ اسلام کے لئے ساعی ہوں انہیں عوام سے وہ سلوک روا رکھنا چاہئے جو اسلام کہتا ہے ہمیں چاہئے کہ ہائر اتھارٹی کو نفاذ اسلام کے لئے مجبور کر ڈالیں۔

س :- آپ کا فہم اسلام کیا ہے؟

ج :- "میں نے اپنے شیخ" کے ساتھ 25 برس گزارے حضرتؒ اپنے عہد کے گنے چنے علماء میں سے تھے میں نے جو کچھ سیکھا حضرت کی رفاقت سے سیکھا۔ اسلام کے دو شعبے ہیں پہلا فرد کا عبادت کے ذریعے اللہ سے اپنے تعلق کا اظہار کرنا اور دوسرا خلق خدا کے باہمی تعلقات۔ ان میں اسلام حقوق فرائض کی ایک تفصیل دیتا ہے پہلے حصے پر اسلام اتنا زور نہیں دیتا کہ اسے بزور شمشیر منوایا جائے اگر کوئی ماننا چاہے تو یہ اللہ کا پیغام ہے نہ ماننا چاہے تو زبردستی نہیں، دوسرے حصے کو جس میں فرد کے حقوق آتے ہیں اسے منوانے کے لئے اسلام جہاد کا راستہ دیتا ہے اگر ظلم کسی طرح نہ رکے کسی کے حقوق غصب ہوتے ہیں اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی رہے تو پھر اسے بزور شمشیر روکنا بھی جائز ہے، اسلام کا سب سے اہم حصہ یہ ہے کہ عام آدمی کا جو زمین پر رہتا ہے اس کا حق اس کو ملتا رہے اسی طرح اس کے ذمے جو فرائض ہیں وہ بھی ادا کرنے ضروری ہیں۔

س :- آپ کی تنظیم الاخوان کا مصر کی الاخوان سے کیا تعلق ہے؟

ج :- مصر کی اخوان المسلمون تنظیم تھی اور اب تک بھی ہے ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق اور رابطہ نہیں ہے۔ ان کے اپنے ملکی حالات اور ان کی اپنی ضروریات ہے۔ اخوان قرآن کریم کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے بھائی۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے مصر والوں نے اخوان المسلمون چنا ہم نے اس میں مسلمون کا اضافہ ضروری نہ سمجھا ہم نے الاخوان نام ہی چنا یعنی بھائی چارہ۔

س :- مصر کی الاخوان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سمبل سمجھا جاتا ہے کیا آپ اور ان کی سوچ وافکار میں کوئی ہم آہنگی ہے ؟

ج :- نہیں ہم آہنگی اس لئے نہیں ہے کہ وہاں کے سیاسی حالات مختلف تھے یہاں کے سیاسی حالات مختلف ہیں۔

س :- اگر ہم اندرون ملک سود ختم بھی کر لیں لیکن بیرونی قرضوں پر تو ہمیں پھر بھی سود دینا ہو گا ؟

ج :- میں سمجھتا ہوں کہ اگر داخلی طور پر سود ختم کر لیں تو ہمارے پاس اتنے وسائل آجائیں گے جن سے ہم آسانی سے اپنے غیر ملکی قرضے بھی ادا کر سکیں گے اور رفتہ رفتہ ہمیں بیرونی سودی قرضوں سے بھی نجات مل جائے گی۔ زکوٰۃ خیرات صدقات' عشر قربانی کی کھالیں' یہ سب چیزیں پسماندہ لوگوں کو اوپر اٹھانے کے لئے ہیں۔ ہم نے گوجرانوالہ ڈویژن میں زکوٰۃ و عشر کے اعداد و شمار جمع کئے تو اندازہ ہوا کہ یہ زکوٰۃ و عشر واقعی جمع ہو جائے تو یہ رقم اس ڈویژن کے سرکاری اخراجات سے دس گنا ہو گی۔ سیالکوٹ' لاہور' فیصل آباد وغیرہ گوجرانوالہ سے بہت آگے ہیں۔ بعض علاقے اس سے پیچھے بھی ہوں گے اور یوں نہایت محتاط اندازے کے مطابق پورے ملک سے اتنا زکوٰۃ و عشر جمع ہو جائے گا جو ملک بھر کے انتظامی اخراجات سے کم از کم پانچ گنا ضرور ہو گا۔

نوٹ:

یہ انٹرویو مختلف اخباروں اور جرائد سے لیا گیا ہے۔ نیچے ان کے نام درج ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت۔

روزنامہ خبریں

روزنامہ اساس

ہفت روزہ چکوال پوائنٹ

قومی ڈائجسٹ

ماہنامہ زندگی

صفارہ نظام تعلیم !!

انگریزوں نے اپنی آمد کے فوراً بعد جب بر صغیر کا جائزہ لیا تو ان پر اعداد و شمار اور عملی صورت حال کو دیکھ کر یہ واضح ہوا کہ بر صغیر کا مسلمان تعلیم یافتہ ہے۔ جس کا سبب مسلمانوں میں رائج تعلیمی نظام ہے۔ چونکہ اس تعلیمی نظام کو اسلامی حکمرانوں نے جاگیریں دے دے کر قائم کیا تھا اور ان اسلامی اداروں کے تعلیمی اخراجات ان جاگیروں کی آمدن سے پورے ہوتے تھے جو مسلمان حکمران اداروں کو دے دیا کرتے تھے تو انگریزوں نے فی الفور دو انقلابی فیصلے کئے۔

۱۔ تحریک بغاوت میں علماء کی حمایت پر بطور سزا ان مدارس کی جاگیریں ضبط کر لیں اور مسلمان طلباء کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا۔ جس سے عام لوگوں میں ان اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

۲۔ دوسرا اہم فیصلہ یہ کیا کہ انگریزی کو سرکاری و علمی زبان کے طور پر رائج کر دیا

اس ایک فیصلے سے ساری مسلمان قوم بیک جنبش قلم سرکاری طور پر ان پڑھ ہو گئی۔ اور اس طرح وہ مسلمان قوم جو برصغیر میں ہزار سال سے حکمران تھی، اسے تباہی کے گڑھے پر پہنچا دیا گیا۔

انگریزوں نے آتے ہی بڑے منظم طریقے سے ہمارے نظام تعلیم کو تباہ کر کے، ہم پر ترقی کے راستے بند کر دیئے۔ انہوں نے اسلامی نظام تعلیم کی جائے ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی' جو ہرگز سیکولر نہیں تھا۔ کیونکہ سیکولر کا مطلب تو یہ ہے کہ مذاہب سے بالاتر ہو کر انسانیت کے حوالے اور انسان کے حوالے سے بات کرنا۔ جبکہ جو نظام تعلیم ہمیں دیا گیا' اسکی بنیاد ہی مذہب دشمنی پر رکھی گئی اور یہ مذہب دشمنی بھی صرف اسلام تک ہی محدود رہی۔

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اور خواص دونوں مذاہب سے دور ہو گئے۔ اور اس طرح مروجہ نظام تعلیم مذہب دشمنی کے ساتھ ساتھ اقتصادی و علمی ترقی کا بھی دشمن بن گیا اور اب اس مروجہ نظام تعلیم کا واحد مقصد یہ رہ گیا ہے کہ ملک کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو کہ اصطلاحی طور پر تو عالم ہو' مگر کسی بھی فن میں اسے مہارت نصیب نہ ہو۔ بلکہ اب تو اس طریقہ تعلیم کا واحد مقصد حکومت میں بہتر ملازمت کا حصول رہ گیا ہے۔ اسی لئے اس کے بے شمار درجات بن گئے ہیں۔ مقتدرہ طبقوں کے لئے علیحدہ نظام تعلیم اور غریبوں کے لئے علیحدہ نظام تعلیم بنایا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرہ مکمل طور پر انتشار کا شکار ہو چکا ہے۔

امیر ملک محمد اکرم اعوان نے ان تمام مسائل کے پیش نظر' اپنے منفرد تعلیمی ڈھانچے کے تحت قابل عمل' سستا اور موثر نظام تعلیم پیش کیا ہے۔ جس کے دو اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ ہر بچے کی نہ صرف ذہنی نشو و نما اسلامی طرز پر کی جائے۔ بلکہ اس کو عملی طور پر

بھی ایک سچا مسلمان بنایا جائے۔

۲۔ صقارہ نظام تعلیم' ہر قسم کے پیش ورانہ' دینی اور ترقیاتی علوم سکھانے کے نظام کو متعارف کراتا ہے۔

اس کے تحت لاہور اور منارہ دارالعرفان میں تعلیمی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ 87ء میں صقارہ اکیڈیمی منارہ' دارالعرفان کا افتتاح' مرحوم صدر ضیاء الحق نے کیا۔ تو امیر ملک محمد اکرم اعوان نے مرحوم صدر کو صقارہ نظام تعلیم کے بارے میں مکمل رپورٹ پیش کی' جسے صدر نے یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لیا کہ میں کوشش کروں گا' اسے ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کو اس کی طرز پر چلا سکوں۔ مگر بعد میں مرحوم صدر کی جانب سے ایسے کسی اقدام کی خبر نہ موصول ہوئی۔

مگر دارالعرفان میں صقارہ اکیڈیمی نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس کے پہلے سال کے امتحانی نتائج نے ہی لوگوں کو چونکا دیا۔ اسکے بعد سے اب تک' ہر سال بورڈ ٹاپ کر رہے ہیں۔ صقارہ نیز پہلے اور دوسرے نمبر کی پوزیشنیں لے رہے ہیں۔

میں صقارہ اکیڈیمی کے بارے میں اخباری کالموں اور مختلف لوگوں سے کافی کچھ سن چکی تھی' اس کتاب کے دوران قریب سے اس ایجوکیشن سسٹم کا جائزہ لیا' تو معلوم ہوا کہ دینی اور دنیاوی تعلیم کا جو خوبصورت امتزاج یہاں ہے' شاید ہی کہیں اور ہو۔ بے اختیار سوچا کاش اپنا کوئی چھوٹا بچہ ہوتا جسے ایک اچھا انسان بننے کے لئے اکیڈیمی کے حوالے کر دیتی۔

صقارہ نظام تعلیم کیا ہے؟

اس کے مقاصد کیا ہیں اور اس کی ضرورت کیوں ہے؟

اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گی۔

۱۔ اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی خدوخال

۲۔ بیک وقت دین اور دنیا کی تعلیم

۳۔ غیر طبقاتی تعلیم۔

۴۔ تعلیم کے لئے پاکیزہ ماحول۔ یہ ہے صفارہ ایجوکیشن سسٹم۔

یہ نظام تعلیم انسان کو اپنے مقصد تخلیق سے آشنا کرتا ہے۔ کائنات میں اپنے مقام کو پہچاننا اور خالق کائنات سے قلبی رشتہ استوار کرنا اس طرح سکھاتا ہے کہ انسان اللہ کا عبد بن کر با مقصد دنیوی زندگی گزار سکے۔

پاکستان بنتے ہی ہم نے اس مفہوم کو پس پشت ڈال دیا اور ایک کافرانہ نظام تعلیم اپنایا جو سفید حکمرانوں نے اپنی حکومت چلانے کے لئے کلرکوں کی ایک فوج تیار کرنے کے لئے وضع کیا تھا۔ اور جس کا بانی لارڈ میکالے کہتا ہے کہ "برصغیر میں' میں ایک ایسا نظام تعلیم قائم کر آیا ہوں جو مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذہنی غلامی میں مبتلا رکھے گا"۔

تو ایک طرف انگریزوں کا دیا ہوا نظام تعلیم اور دوسری طرف دینی مدارس۔ اول الذکر کے طلباء عصری علوم سے آگاہ مگر دین سے نابلد' اور دینی اداروں سے فارغ التحصیل طلباء فیلڈ کے کام سے ناواقف۔ یہ ایسی عجیب و غریب پچویشن تھی۔ جس نے درد مند دل رکھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اور ایسی ہی درد مندی کی سوچ کے نتیجے میں صفارہ نظام تعلیم وجود میں آیا۔

صفارہ نظام تعلیم صرف ذریعہ معاش کے لئے تعلیم کا قائل نہیں ہے۔ یہ مسلم نوجوان کے شعور کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے۔ نہ تو یہاں فائلوں میں دفن ہونے والے کلرک پیدا کئے جاتے ہیں نہ چندوں کے محتاج مولوی۔ یہ نظام طلباء کے دلوں میں ایمان و یقین کی ایسی روشنی بھرتا ہے' جس سے وہ دنیا کی قیادت کے قابل ہو سکیں اور مسلم امہ میں نئی روح پھونک سکیں۔

اس نظام کا طرہ امتیاز طلباء کے ارادے ' ان کے قلوب اور ضمیر کو ایک آگہی دینا ہے ' جس سے وہ اللہ اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل کر سکیں۔اس لئے ذکر قلبی اور تعلیم تصوف اس نظام کا جزو لاینفک ہیں۔ تصوف حسن اسلام ہے۔شریعت مطہرہ کا نچوڑ ہے۔ جس کے بغیر انسان ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔

صقارہ نظام تعلیم

صقارہ اکیڈمی کے پرنسپل، لیفٹیننٹ کرنل محمد ابراہیم خلیل سے باتیں!!

ہم ایک تعلیمی پروگرام بنارہے ہیں، جس میں نرسری سے لے کر Gradua-tiona تک تعلیم دی جائے گی۔ اور اسلامی تعلیمات اس میں اس طرح شامل ہوں گی کہ گریجویشن کے بعد طالب علم کو اسلامی تعلیمات کے بارے میں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے، کیونکہ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"

ہم ان کو فرائض کا علم دینا چاہتے ہیں، واجبات کا علم، جائز و ناجائز کا علم دینا چاہتے ہیں، جس سے وہ اپنی چوبیس گھنٹے کی زندگی کو Regulate کر سکیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا ماڈل تیار کریں کہ اگر کل کو نظام اسلام کا احیاء ہو تو ہمیں نظام اسلام کے لئے بغلیں نہ جھانکنا پڑیں۔ حضرت جی کا مقصد 'ایک تعلیم ایک جیسے نصاب کا اجراء ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل تعلیم مفت تھی اور طالب علموں کی کفالت بھی کی جاتی تھی۔ دینی اور دنیاوی تعلیم ساتھ ساتھ

دی جاتی تھی تاکہ وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد امام مسجد ہی نہ بنیں' بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی کامیاب انسان ہوں' ساتھ عسکری تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ہمارے ہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتحان گاہ میں نگران عملہ جو کہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی نقل نہ کرے۔ وہ وقت ظہر ہمارے طالب علم کی امامت میں نماز ادا کرتا ہے۔ کلاس دہم کا ہمارا طالب علم کامران امتحان دے رہا تھا۔ سب لڑکے چلے گئے۔ لیکن وہ بیٹھا رہا۔ تو نگران عملہ اس کے پاس گیا کہ اگر کسی مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ اس نے لکھتے لکھتے بایاں ہاتھ اوپر کھڑا کر دیا اور کہا۔ میرے پاس مدد ہے۔ عملے کے انچارج نے پوچھا کس کی مدد ہے تو اس نے جواب دیا اللہ کی مدد ہے پھر نگران انچارج نے کہا کہ یہ جب تک لکھ رہا ہے اسے لکھنے دیا جائے۔ ہماری کینٹین میں بھی بعض اوقات کوئی نہیں ہوتا لوگ خود ہی چیز لے جاتے ہیں اور پیسے دے جاتے ہیں۔

فوج میں ہر PMA کورس میں ہمارے اوسطاً دو امیدوار جا رہے ہیں اور کیپٹن تک پہنچ چکے ہیں لاہور میں ہمارا گرلز کالج BSc تک ہے اور ایک سکول بھی ہے ہمارا منصوبہ ہے کہ ہر صوبائی سطح تک ڈگری کالج ہو اور ڈویژن سطح پر انٹرمیڈیٹ کالج اور ہر ضلع میں ہائی سکول ہو۔ ہماری خواہش ہے کہ اللہ کرے کوئی ایسی حکومت آئے جو ہمارا تعلیمی نظام اپنائے، اکیڈمی کا پچھلے سال میٹرک کا رزلٹ 90% رہا اور بچوں کے تفریحی پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں۔ میں والدین سے کہتا ہوں کہ پاکستان میں اور کہیں بھی بچوں کا ایسا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہاسٹل میں۔ 60% بچے ایسے بھی ہیں جن کے والدین Education میں ہیں لیکن وہ اپنے بچوں کو ہمارے پاس بھیجتے ہیں یا وہ لوگ جن کے والدین باہر ہیں ہمارے پاس آتے ہیں کیونکہ ان کے والدین ان پر صحیح توجہ نہیں دے پا رہے ہوتے۔

ہمارے پاس اس وقت ہاسٹل میں 160 طلبہ کی گنجائش موجود ہے اور 154 طالب علم ہیں آٹھویں جماعت میں داخلے ہوتے ہیں۔ دو سال پہلے تو ہمارے پاس امریکہ کینیڈا اور سعودی عرب کے بچے بھی تھے۔ اس وقت ہمارے پاس پورے پاکستان سے طالب علم موجود ہیں ہمارا ایک Additional کورس تزکیہ نفس کا ہے جس کا بورڈ کا امتحان نہیں ہوتا لیکن ہم خود امتحان لیتے ہیں اور اسی طرح عربی کا بھی۔

صبح کو ہم بچوں کو جگاتے ہیں اور فجر کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کو ناظرہ قرآن پڑھواتے ہیں۔ جس نے ناظرہ پڑھا ہوا سکو تیسواں پارہ حفظ کرواتے ہیں۔ اس کے بعد سورۃ یاسین' مزمل اور سورۃ رحمان حفظ کرواتے ہیں اور آخری Stage پر پہلے پارہ سے قرآن مجید کا ترجمہ کرواتے ہیں اور ترجمہ ایسے کرواتے ہیں کہ عربی گرائمر بھی ساتھ ہی سمجھا دیتے ہیں مثلاً الحمد کیا ہے اور الحمد سے احمد کیسے بنا یہ پیریڈ تیس منٹ کا ہوتا ہے اس کے بعد بچوں کو PT کروائی جاتی ہے PT کروانے کے بعد بچے نہا کر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور اسمبلی ہوتی ہے ایک لڑکا تلاوت کرتا ہے اور ترجمہ۔ اسکے بعد ایک لڑکا سارے دن کی اہم خبریں سناتا ہے جو کہ زیادہ تر سٹوڈنٹس کی دلچسپی کی ہوتی ہیں ایک اردو میں تقریر کرتا ہے اور دوسرا انگریزی میں تقریر کرتا ہے اور روزانہ بچے بدلتے رہتے ہیں اس طرح سب کو بولنے کا موقع ملتا ہے۔

اس کے بعد ایک Short Break ہوتی ہے اور بچے چائے وغیرہ پیتے ہیں پھر ایک پیریڈ ہوتا ہے اور نماز ظہر کے بعد لنچ ہوتا ہے اور پھر دو گھنٹے ریسٹ ہوتا ہے جس میں سونا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد دو گھنٹے مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ عصر کے بعد Play ground۔ ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لے۔ ہماری پہلی ترجیح مارشل آرٹ ہوتا ہے اور مارشل آرٹ میں

Yellow Belt لیناcompulsory ہے اس کے علاوہ باسکٹ بال وغیرہ کرکٹ کو ہم To be very frank ڈسکرج Discourage کرتے ہیں اس کی جگہ Base Ball ہے چونکہ Base Ball میں بھی تقریباً وہی کچھ ہے لیکن یہ سب ایک گھنٹے میں ختم ہو جاتا ہے اور کرکٹ میں وقت زیادہ ضائع ہوتا ہے اس کے بعد مغرب کی نماز ہوتی ہے اور پھر ذکر کی محفل ہوتی ہے اور تعلیم السلام کے نام سے ذکر ہوتا ہے جس میں دعائیں وغیرہ سکھاتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ کالج کو FSc تک لے جائیں تاکہ فوج میں کمیشن بھی Apply کر سکیں۔

نئے عہد کی خوشبو

صفارہ نظام تعلیم کے متعلق لکھا ہوا یہ روزنامہ احساس میں گلزار آفاقی کا کالم نئے عہد کی خوشبو کے نام سے ' نئے عہد کی بشارت کی گواہی ہے !!

"وہ نیم شب کی ساعتیں تھیں جب وہ میری بیمار پرسی کے بعد اپنی اگلی منزل کی طرف رواں ہوئے۔ رب کی دھرتی پر پھیلے ہوئے یہ کون لوگ ہیں۔ جو نفسا نفسی کے اس عالم میں بھی اور صبح دم سے شام تک محیط کشاکش زندگی کے باوصف' مجھ جیسے بے مایہ و پرکاہ کے لئے دعائے نیم شبی اور سامان مسیحائی لئے پھرتے ہیں۔ ٹوٹتے ہوئے ارادوں کو جوڑتے اور ریزہ ریزہ امیدوں کی شیرازہ بندی کرتے ہیں دکھ سمیٹتے اور سکھ بانٹتے ہیں جن کی حیاتی کا ایک ایک سانس رب کے ذکر اور اس ذکر کی خوشبو کو عمل کے قالب میں ڈھالنے اور رب کی مخلوق کی خدمت میں گزرتا ہے۔ ان لوگوں کی تگ و تاز کا ایک ہی مقصد رب کی دھرتی رب کا نظام کا نفاذ اور اس سلسلے میں سب لوگ محنت و ریاضت کے دھنی واقع ہوئے ہیں۔ ہر دستیاب وسیلے سے علم و ہنر اور مہارت تک رسائی ان کے ذوق و شوق کا حصہ ہے۔ مطالعے مشاہدے اور تجربے سے مالا مال یہ بندگان خدا باہمی مکالمے' رابطے اور -Interac

tion کے ذریعے خوب سے خوب تر کی تلاش میں محو رہتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ اور ذکر و فکر کے ذریعے ذہنوں کی پاکیزگی و طہارت ان کا خاص شغف ہے۔ ان کے ہاں قلب کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے کہ ذکر الٰہی قلب میں ایسی تبدیلی کا باعث بنتا ہے جسے حقیقی معنوں میں اسلامی انقلاب کی پیشگی ضرورت کہا جا سکتا ہے۔

محترم کرنل (ر) چوہدری بشیر احمد اور جناب بریگیڈیئر (ر) امتیاز احمد اپنے ناموں کے پیچ ریٹائرمنٹ کی پیرانہ سالی رکھنے کے باوجود' جوانوں سے زیادہ باہمت غازی ہیں۔ عرصہ دراز تک عساکر پاکستان میں خدمات انجام دینے کے بعد اب تنظیم الاخوان پاکستان کے سپاہی ہیں۔ اور حضرت جی امیر محمد اکرم اعوان صاحب کے معتمدین میں شمار ہوتے ہیں۔ کرنل بشیر صاحب تنظیم کے نائب صدر بھی ہیں۔ ان کے نزدیک سپاہیانہ معلومات رکھنے والے لوگ اپنے نظم و ضبط' مجاہدانہ ریاضت اور مقصد کے ساتھ اٹوٹ وابستگی اور کومٹ منٹ کے باعث آدھے سے زیادہ صوفی ہوتے ہیں اور اپنے ہدف کے حصول کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینے کی آرزو ان کے اس لہو میں رچ بس چکی ہوتی ہے۔ ذکر اور اسکی اہمیت فضیلت کی بات چلی تو یہ بھید کھلا کہ یہ عمل قلب کی پاکیزگی و طہارت کیساتھ قرب الٰہی کا بھی موجب بنتا ہے اور قرب الٰہی اپنے آخری تجزیئے میں بندے کو اس فیصلہ کن معرکے کے لئے تیار کرتا ہے جس میں رب کی دھرتی پر رب کا نظام خوشبو بن کر بکھر جاتا ہے۔

"یہ خوشبو کب ہمارا مقصد بنے گی ہم کہ جو ایک بدبودار نظام کے ستائے ہوئے ہیں"

بہت ساری باتوں کو خلاصے کی شکل میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ مولا کریم کی صفت یہ ہے کہ مظاہر فطرت کو تو ایک طے شدہ پروگرامنگ دے دی گئی ہے۔ البتہ انسانوں کی بستی میں رب کی دھرتی پر رب کا نظام انسانوں کے ذریعے

نافذ ہوتا ہے۔ اس نظام کا سارا خاکہ اللہ کی آخری کتاب اسوۂ نبویؐ میں محفوظ ہے۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ کیجئے کتاب آپ سے ہم کلام ہوگی' آپ پر معانی و مفاہیم کے جہاں در جہاں کھلتے چلے جائیں گے۔ بس ضرورت یہ ہے کہ ایک مربوط اور موثر اجتماعی کوشش کے ساتھ ان معانی و مفاہیم کو معاشرے پر سائبان کی طرح تان دیجئے پھر دیکھیئے رب کی دھرتی کیا کیا گل بوٹے کھلاتی ہے' کیسے کیسے ثمر اچھالتی ہے اور کیسی کیسی فیوض و برکات لوگوں کی دہلیز پر پہنچتی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے تربیت یافتہ انسانوں کی وہ جماعت کہاں سے آئے گی جو انسانوں کی بستی میں اور رب کی دھرتی پر رب کا نظام نافذ کردے۔

باہمی مکالمے سے یہ منظر کھلا کہ تنظیم الاخوان کی سطح پر ایسے انسانوں کی شخصیت سازی کا ہمہ جہتی سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے اسلامی انقلاب کی کامیابی اور دوام میں وابستگان انقلاب کی شخصیت سازی اور ماہیئت قلب کا عمل ہر سطح اور درجے پر جاری ہے اور اس وقت عالم یہ ہے کہ چند برسوں کی کاوش کے نتیجے میں سوا لاکھ کے قریب افراد اسلامی انقلاب کے مشن کے سلسلے میں موت کی بیعت یا ایثار عظیم کی کومٹ منٹ کے پختہ رشتے سے منسلک ہو چکے ہیں۔

مگر میرے لئے شخصیت سازی کے سلسلے میں تنظیم الاخوان کے شروع کردہ صقارہ علمی پروجیکٹ میں دلچسپی کا غیر معمولی سامان موجود تھا۔ یہ بات نہایت اطمینان بخش ہے کہ اس وقت جبکہ ہمارے ملک میں تعلیمی سسٹم نصابی اور عملی سطحوں پر تقسیم در تقسیم کا شکار ہے اور بے رحم کمرشل ازم کے باعث ہمارا تعلیمی شعبہ تجارتی منڈی کی پستی تک پہنچ چکا ہے' حضرت مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کی براہ راست سرپرستی میں صقارہ سکول سسٹم کے حقیقی معنوں میں ایک مربوط اور ہمہ جہتی اوصاف کے حامل نصابی پروگرام کے ذریعے ایسی نسل تیار کی جارہی ہے جو

اول و آخر پاکستانی اسلامی انقلاب کے رنگ میں رنگی ہوگی۔ اس سلسلے کے سکولوں میں رائج نصاب اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے جس میں جدید عہد کی سائنسی ضروریات' صناعی و تخلیقی اوصاف اور اسلامی طرز حیات کے تمام تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ صقارہ کے معنی شاہین کے ہیں۔ چنانچہ صقارہ میں تعلیم کا مقصد محض کاغذی ڈگریوں یا نوکریاں کا حصول نہیں بلکہ ایک ایسے مفید اور قابل فخر انسان کی تشکیل ہے جو اپنے وطن' اپنے دین اور اپنے عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو۔ اس وقت صقارہ سسٹم کے تحت منارہ چکوال اور لاہور میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے متعدد سکول اور کالج سرگرم عمل ہیں جہاں ہائی سکول اور ڈگری کے درجے تک تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے منارہ چکوال میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کی تعداد ساڑھے چھ سو ہے۔ جبکہ لاہور ساڑھے پانچ سو بچے بچیاں مختلف درجوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ منارہ میں قابل لحاظ تعداد غیر ممالک سے آئے ہوئے اقامتی طلباء کی ہے یہ بچے علی الصبح بیدار ہوتے ہیں' نماز فجر کے ساتھ ذکر کی محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ پھر ٹریک سوٹوں میں جنگل بیلوں اور ٹیلوں میں جاگنگ کی جاتی ہے' ناشتے کے بعد تعلیمی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو دوپہر کے کھانے نمازوں اور سہ پہر کی گیمز کے ساتھ رات تک جاری رہتا ہے بچوں میں صحت مند تفریحی و تخلیقی سرگرمیوں' صناعی اوصاف اور سائنسی و تکنیکی مہارتوں کو اجاگر کرنے کا خصوصی اہتمام بھی صقارہ علمی منصوبے کا خاصہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پنڈی بورڈ کے امتحانات میں متعدد بار صقارہ کے طلباء و طالبات نے نمایاں پوزیشنیں حاصل کی ہیں۔ اے گریڈ کا حصول تو صقارہ کے ہر طالب علم کا خصوصی امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ کرنل بشیر صاحب بڑے فخر سے بتا رہے تھے کہ صقارہ کے فارغ التحصیل طلباء و طالبات آج زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اور میں پاکستان کے منظر نامے پر ایسی ہمہ گیر سماجی تبدیلیوں کے نقوش ابھرتے دیکھ رہا ہوں جہاں جہاندیدہ اور تربیت یافتہ نئی نسل ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک نئے عہد نامے 'ایک جدید سوشل کنٹریکٹ کی بنیاد رکھ رہی ہے' جہاں رب کی دھرتی پر رب کے نظام کی جگمگاہٹ میں ظلم و ناانصافی اور بھوک و بیماری کے سارے اندھیرے دم توڑ رہے ہیں اور جہاں جسم و جان کی سلامتی کا ایک نیا عہد جنم لے رہا ہے۔"

شعبہ نشر واشاعت!!

سلسلہ عالیہ کا ایک اہم شعبہ نشر واشاعت کا ہے۔ جس کا کام حضرت جی کی تمام تصانیف کو شائع کرنا ہے اور سلسلہ عالیہ کی دوسری تعلیمات کی اشاعت ہے۔ ایک شعبہ آڈیو وڈیو کا بھی ہے، جس میں حضرت جی کے خطابات اہم پروگرامز اور مشن سے متعلق مصروفیات کو محفوظ کرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہ شعبہ بھی نشر واشاعت کا ایک حصہ ہے۔

شعبہ نشر واشاعت میں :۔

۱۔ کتابیں سلسلہ عالیہ سے متعلق اور حضرت جی کی مختلف تصانیف

۲۔ المرشد

۳۔ الاخوان ٹائم

المرشد میں حضرت جی کی تقاریر شائع ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ روحانی دینی علمی اور فقہی مسائل پر تحریریں المرشد کی خصوصیت ہیں۔ اچھی شاعری بھی المرشد کا حصہ ہے۔ المرشد کا اجرا 78ء میں ہوا تھا۔ 80ء میں اس کا باقاعدہ ڈیکلریشن ہو گیا تھا۔ اسکی سرکولیشن 3300 ہے۔ المرشد ملک کے طول و عرض میں رہنے والوں

تک ہر ماہ باقاعدگی سے پہنچتا ہے۔ خصوصاً سلسلہ عالیہ سے وابستہ لوگوں میں یہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ آج کل اس میں ایک نیا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ جس میں آنحضرت کے صحابہؓ کے حالات زندگی کے بارے میں ''من الظلمات علی النور'' کے عنوان سے مختلف شخصیات کے بارے میں بتایا جائے گا۔ سلسلے کی ایک لائبریری لاہور میں ہے جہاں دوسری کتابوں کے علاوہ سلسلے کے شعبہ نشر و اشاعت کے تحت چھپنے والی تمام کتب بآسانی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی لائبریری دار العرفان منارہ میں ہے۔ جس میں نادر علمی، فقہی، ادبی، سیاسی، دینی، روحانی اور دیگر تمام موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں نادر علمی نسخے بھی شامل ہیں۔ جو عربی اور فارسی زبانوں میں تحریر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک شعبہ ویڈیو، آڈیو کا ہے، وہ بھی سلسلہ عالیہ کے شعبہ نشر و اشاعت کے تحت چلتا ہے۔ مشن، حضرت جی کے خطابات اور دوسری اہم مصروفیات کو محفوظ رکھنے کا کام اسی شعبہ کے ذمہ ہے۔

گزشتہ برس سے آڈیو/ویڈیو سسٹم باقاعدہ منظم کر کے شعبہ نشر و اشاعت کے زیر اہتمام کر دیا گیا ہے۔ جس میں اب تک حضرت جیؒ کی دو درجن آڈیو کیسٹس کے علاوہ موجودہ شیخ کی پانچ سو ویڈیو اور تقریباً پچیس سو آڈیو کیسٹس موجود ہیں۔ جو ترویج دین میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

بحوالہ دستور العمل سلسلہ عالیہ شق (ط) صفحہ 5۔ جس کا متن درج ذیل ہے:۔

''ا۔ سلسلہ کی نشر و اشاعت کا شعبہ روحانی تربیت کا حصہ ہے۔ اس پہلو کے

نشوونما اور تحفظ وبقا کے لئے ادارہ نقشبندیہ اویسیہ کے تابع ماہانہ المرشد اور جملہ تصانیف کی طباعت اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے۔اس شعبے کو دارالعرفان کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ میں اپنی تمام تصانیف اور ان کے حقوق اور المرشد کو ادارے کی ملکیت میں دیتا ہوں۔ میرے کسی وارث کو حق وراثت نہ ہوگا۔

۲۔ میری زندگی میں میرے شاگرد اولین حافظ عبدالرزاق (چکوال) نے اس ادارے کی نشرواشاعت اور استحکام کے لئے زندگی کا قیمتی حصہ وقف کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ میں حافظ عبدالرزاق صاحب کو ادارہ نقشبندیہ اویسیہ کا ناظم نشرو اشاعت مقرر کرتا ہوں جو تابع مجلس منتظمہ کام کریں گے اور حافظ صاحب کے بعد مجلس موزوں آدمی کا انتخاب کرے گی۔

۳۔ نشرواشاعت کے کام کے لئے حافظ عبدالرزاق صاحب کی معاونت کے لئے ان کی زیرنگرانی اور حسب ہدایات کمیٹی نشرواشاعت بنائی جاتی ہے۔ یہ کمیٹی مجلس منتظمہ کے تابع ہوگی"

اب جبکہ حافظ عبدالرزاق صاحب ضعیف العمری کی وجہ سے یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتے اور گزشتہ کمیٹی تشکیل نو کے باوجود کوئی فعال کردار ادا نہیں کر سکی لہذا اس اہم شعبے کو فعال بنانے کے لئے دستور العمل کی روشنی میں درج ذیل ہدایات جاری کی جاتی ہیں :۔

(۱) ناظم نشرواشاعت ۔ کرنل سرور (ریٹائرڈ)

(۲) کمیٹی نشرواشاعت (۱) محمد اجمل صاحب۔صدر

(۲) عرفان الٰہی لیکچرار صقارہ کالج

(۳) ماسٹر محمد اسلم عادل (۴) اللہ دتہ.............

ذمہ داریاں

(۱) سلسلہ عالیہ کی جملہ کتب کی طباعت۔ تقسیم اور اکاؤنٹنگ۔

(۲) اویسیہ کتب خانہ لاہور اور مرکزی سیل پوائنٹ دارالعرفان کی دیکھ بھال اور سالانہ سٹاک ٹیکنگ۔ اول الذکر کی سٹاک ٹیکنگ۔ ہر سال جون کے آخری ہفتے اور مرکزی سیل پوائنٹ کی ہر سال سالانہ اجتماع کے دوران ہو گی۔

(۳) بیرون ممالک کے حلقوں پر کتب کی تقسیم اور اکاؤنٹنگ۔

(۴) ہر کتاب کے دوبارہ طبع ہونے پر مصنف سے نظر ثانی۔ حضرتؒ کی کتب کی نظر ثانی کا کام ناظم کے ذمہ ہو گا۔

(۵) طابع پریسوں کے ساتھ رابطہ اور کتب کے Set-up کو بہتر سے بہتر بنانے کی پیہم کوشش۔

(۶) جملہ حسابات بنک اکاؤنٹ اور سالانہ آڈٹ

(۷) مارکیٹنگ کی ہر ممکن کوشش۔

(۸) المرشد کی طباعت اور اشاعت کی نگرانی۔

(۹) کتب کی نشر و اشاعت سے متعلق ہر وہ کام جو اوپر درج نہ ہوا ہو۔

مندرجہ بالا Set-up اپنا کام جلد از جلد شروع کر دے گا اور 96-7-15 تک کام کا چارج سنبھال لے گا۔ اور اپنی کارگزاری کی سہ ماہی رپورٹ ناظم اعلیٰ کے ذریعہ شیخ سلسلہ عالیہ کو باقاعدگی سے پیش کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔